زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہارسو

راولپنڈی

زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہارسو

راولپنڈی

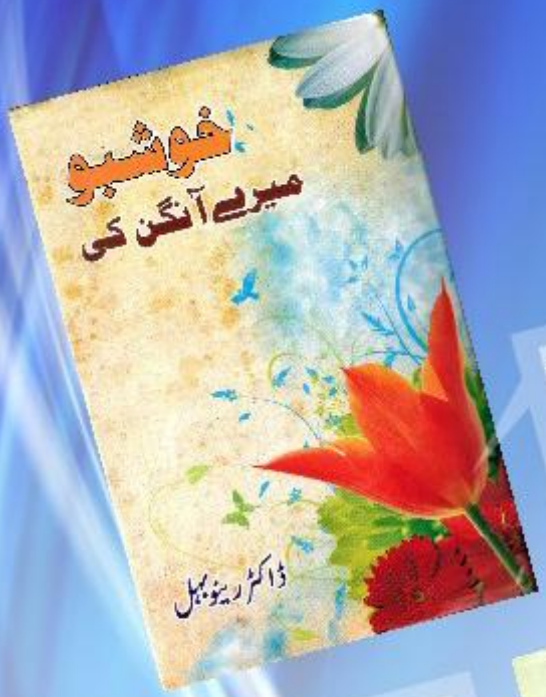

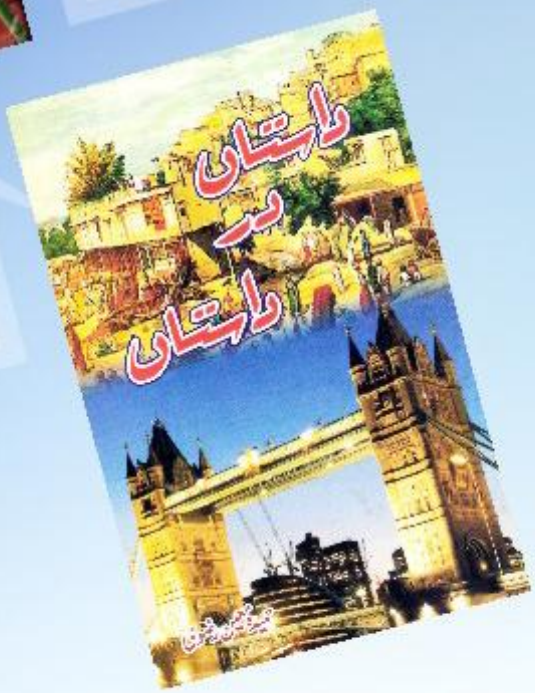

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا اعزاز

نئی دہلی (معین شاداب/ ایس این بی) اردو کے ممتاز نقاد اور دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ کو آج 'گل مہر' کانفرنس ہال انڈیا ہبی ٹیٹ سینٹر میں منعقد ایک پروقار تقریب کے دوران ساہتیہ اکادمی کے اعلیٰ ترین اعزاز ''فیلوشپ'' سے سرفراز کیا گیا۔ اس پروقار تقریب کی صدارت ساہتیہ اکادمی کے صدر سنیل گنگوپادھیائے نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ساہتیہ اکادمی کے سیکریٹری اگر ہار کرشنا مورتی نے کی۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس اعزاز کے لیے ساہتیہ اکادمی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ اعزاز ان کے لیے بہت خاص ہے۔ انہوں نے کہا کہ تنقید ویسے ہی حاشیائی سمجھی جاتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تنقید و تحقیق کے بغیر نہ تو تاریخ ادب کا تصور ممکن ہے اور نہ شعریات و درسیات کا۔ پروفیسر نارنگ نے کہا کہ سنسکرت والوں کا قول ہے کہ شاعری کا حسن نثر ہی کھولتی ہے۔ ایسا ہی فارسی میں بھی کہا گیا ہے کہ شعر گوئی گرچہ موتی پرونے کا عمل ہے لیکن شعر فہمی موتی پرونے سے بھی بہتر ہے۔ انہوں نے کہا کہ ادب کی کوئی تصویر سخن فہمی یا تحسین شناسی کے بغیر مکمل نہیں۔ خود میرا ذہنی سفر اردو ادب کی حسن کاری اور اس کے جمالیاتی و تہذیبی ابعاد کے رازوں کو جاننے کی حقیری سی کوشش ہے۔ انہوں نے کہا کہ غالب نے کہا تھا ''ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے''۔ مرزا کا شکوہ اپنی رفتار سے تھا لیکن یہاں پیدل چل پانا بھی مشکل ہے۔ پروفیسر نارنگ نے اس عزت افزائی کے لیے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ خدا کرے کہ میں آپ کی توقعات پر پورا اتر سکوں۔ ساہتیہ اکادمی کے صدر سنیل گنگوپادھیائے نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کو ''فیلوشپ'' پیش کرتے ہوئے کہا کہ ساہتیہ اکادمی آج ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت کو اپنے اعلیٰ ترین اعزاز فیلوشپ سے نواز رہی ہے جس پر جتنا بھی ناز کیا جائے کم ہے۔ انہوں نے کہا کہ پروفیسر نارنگ نے اردو اور ہندی ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی تمام زبانوں کو فروغ دینے کے لیے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور ہندوستانی ادب کو ایک وقار بخشا ہے۔ ساہتیہ اکادمی کے سیکریٹری اگر ہار کرشنا مورتی نے خیر مقدمی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ ساہتیہ اکادمی فیلوشپ اکادمی کا سب سے بڑا اعزاز ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ یہ اعزاز پروفیسر نارنگ کو پیش کیا گیا ہے۔ انہوں نے نارنگ صاحب کی جملہ خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے ایک جامع سپاس نامہ پیش کیا۔ دوسرا اجلاس ''سمواد'' (اظہار رائے) پر تھا جس کی صدارت ساہتیہ اکادمی کے نائب صدر پروفیسر ستندر سنگھ نور نے کی۔ انہوں نے کہا کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے نائب صدر اور صدر کی حیثیت سے ساہتیہ اکادمی کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ انہوں نے ساہتیہ اکادمی کے وقار اور معیار کو ایک نئی بلندی عطا کی اور یہ باعث افتخار بات ہے کہ اکادمی انہیں آج ''فیلوشپ'' سے نواز رہی ہے۔

پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ مشترک تہذیب و ثقافت کے امین اور سیکولرزم کے علمبردار ہیں۔ انہوں نے اردو کی 400 سو سالہ فکری اور تہذیبی تاریخ کو اپنی تحقیق و تنقید کا موضوع بنا کر جس طرح اسے وسعت بخشی وہ کہیں اور دکھائی نہیں دیتی۔ شمین کاف نظام نے کہا کہ عہد حاضر میں پروفیسر نارنگ کی واحد شخصیت ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کسی بھی زبان کے بڑے ادیب سے کیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر ہریش نارنگ نے کہا کہ ساہتیہ اکادمی نے ان کو فیلوشپ دے کر اس اعزاز کا وقار بحال رکھا ہے۔ آخر میں کنوینر اردو مشاورتی بورڈ عنبر بہرائچی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

اس موقع پر موجود اہم شخصیات میں سید شاہد مہدی، پروفیسر مشیر الحسن، ابوالکلام قاسمی، پروفیسر شہریار، پروفیسر محمد نعمان، مخمور سعیدی، پروفیسر اختر الواسع، نند کشور وکرم، پروفیسر صغریٰ مہدی، کے ایس راؤ، چندر بھان خیال، مولا بخش، حمید اللہ بھٹ، بلراج کومل اور وسیم راشد کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر نارنگ سے قبل ساہتیہ اکادمی کا یہ اعلیٰ اعزاز ''فیلوشپ'' اردو میں فراق گورکھپوری، قرۃ العین حیدر اور کیفی اعظمی کو پیش کیا گیا تھا۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۱۹، شمارہ: مارچ، اپریل ۲۰۱۰ء

مجلسِ مشاورت
قارئین چہارسُو

زرِ سالانہ
دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

اکثر سننے میں آیا ہے کہ اچھا ادب اپنے زمانے کے ساتھ آنے والے وقتوں کا امین بھی ہوا کرتا ہے جس کے زیرِ اثر ملک اور قومیں تعمیر کا سفر خوش اسلوبی سے طے کیا کرتی ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ سب خیالی اور افسانوی باتیں ہیں۔ آج کا معاشرہ تمام انسانی اور اخلاقی قدروں سے قطعی بے بہرہ ہو چکا ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ ان باتوں میں ذرہ بھر سچائی باقی ہے تو زیرِ نظر شمارہ دس ماہ کے اُس نونہال سے منسوب کیا جاتا ہے جو ۱۲ مارچ ۲۰۱۰ء کو لاہور کے آر۔اے بازار میں شقی القلب دہشت گردوں کے ہاتھوں یتیم، مسکین اور معذور کر دیا گیا ہے!!!

انا للہ وانا الیہ راجعون

بانی مدیرِ اعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیرِ مسؤل

گلزار جاوید

مدیرِ معاونین

عطیہ سکندر علی

افتخار جاوید

محمد انعام الحق

رابطہ: 537، ویسٹریج-III، راولپنڈی۔ فون: 5462495-51-92 فیکس: 5490181 ای۔میل: chaharsu@gmail.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاع چھار سو

سرِورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی

تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید

کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تنویر الحق

قرطاسِ اعزاز

شمع راہ وفا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ساحر شیوی ۳

جاں کنی کا درد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تنویر غلام ۴

بلبلِ بے بال و پر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔خلیل طوق آر ۵

براہِ راست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۸

حاجی بیرام ولی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔خلیل طوق آر ۱۷

خلیل طوق آر کا فن۔۔۔۔۔۔۔۔ستیہ پال آنند ۱۹

چلے چلو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اے بی اشرف ۲۸

درخشاں ستارہ۔۔۔۔۔۔۔۔رئیس الدین رئیس ۳۲

طوفاں سے آشنا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔معراج جامی ۳۴

باغبانِ اردو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر ضیاء الحسن ۳۵

پیارا ملک ہے پاکستان۔۔۔۔۔۔۔۔۔خالد سہیل ۳۷

جواں سال بزرگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یوسف خشک ۳۹

آتشِ سوزانِ غم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ذکیہ گردش ۴۰

ترکی میں اقبال شناسی۔۔۔۔۔۔۔خلیل طوق آر ۴۶

ترکی میں اردو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔خلیل طوق آر ۴۹

صبح نو کے اجالے

جمیل یوسف، امین راحت چغتائی، شبنم شکیل، ماموں ایمن، غلام مرتضیٰ راہی، آصف ثاقب، جین جوہر، غالب عرفان، انوار فیروز، پروین کمار اشک۔ ۵۲

افسانے

چھت سے گرنے والی۔۔۔۔۔۔۔عبداللہ جاوید ۵۷

افسانہ ۲۰۰۹ء۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پروین عاطف ۶۱

بے منزل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سعید شیخ ۶۵

پانچ بجکر بیالیس منٹ۔۔۔۔۔۔۔۔فیروز عالم ۷۱

بخشش۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔احسان احمد شیخ ۷۴

خواھشوں کا انبار

زہیر کنجاہی، جواز جعفری، رؤف خیر، صدیق شاہد، سہیل اختر، شگفتہ نازلی، سہیل غازی پوری، انیس الرحمٰن، عرش صہبائی، حفیظ انجم، نوید سروش، سمیع نوید۔ ۷۸

ناولٹ

قلم باقی ہے ابھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۸۲

رپور تاژ

نگینِ گم گشتہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔طاہرہ اقبال ۹۷

ماتمِ صد آرزو

سرور انبالوی، گلزار، نقشبند قمر بھوپالی، یوگیندر بہل تشنہ، مہندر پرتاپ چاند، ارشاد عرشی، حامد لطیف، گل بخشالوی۔ ۱۰۰

ورثہ

کلاسک اور کلاسکیت۔۔۔۔۔۔۔۔ضیاء محی الدین ۱۰۶

نشانِ راہ

قیصر تمکین کی داستان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سلطانہ مہر ۱۰۹

آئینہ فن

دشتِ ہجر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مراق مرزا ۱۱۴

کلامِ آفاق

صفا و مروہ کی جستجو۔۔۔۔۔۔۔۔۔صفوت علی صفوت ۱۱۷

رس رابطے

جستجو ترتیب تدوین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فاری شا ۱۱۸

☆

پاک ترک دوستی زندہ باد پاک ترک دوستی زندہ باد پاک ترک دوستی زندہ باد پاک ترک دوستی زندہ باد پاک ترک دوستی زندہ باد پاک ترک دوستی زندہ باد

''شمع راہِ وفا''

راہِ صدق و صفا خلیل طوق اُر
اک ادب کی صدا خلیل طوق اُر
ظلمتوں میں دِیا خلیل طوق اُر
ہے عطائے خدا خلیل طوق اُر
شاعرِ خوش نوا خلیل طوق اُر
اردو کی ہے ضیا خلیل طوق اُر
شاعری ہو یا نثر صاف اُس کی
جیسے ہو آئینہ خلیل طوق اُر
اُس کی تحریر میں نزاکت ہے
فن میں بھی خوش نما خلیل طوق اُر
ترکی میں روشنی ہے اردو کی
صاف دل رہنما خلیل طوق اُر
راہِ انسانیت پہ چلتا ہے
آدمی ہے بھلا خلیل طوق اُر
حالِ غم میں بھی چلائے جو کشتی
ایسا ہے ناخدا خلیل طوق اُر
ہے منوّر وہ چاند تاروں سا
شمعِ راہِ وفا خلیل طوق اُر
کیوں نہ عزت ہو اُس کی دنیا میں
صاحبِ خوش ادا خلیل طوق اُر
کرکے اردو زبان کی خدمت
بن گیا دل ربا خلیل طوق اُر
جہاں جاتا ہے کاروانِ ادب
رہبرِ قافلہ خلیل طوق اُر
اُس نے روشن کئے چراغِ ادب
اردو کا آسرا خلیل طوق اُر
دل میں ساحر کے یہ تمنا ہے
خوش رہے تُو سدا خلیل طوق اُر

ساحرشیوی (لیوٹن۔برطانیہ)

استنبول یونیورسٹی، ترکی شعبہ اردو کے طلباء اور اساتذہ سے اظہار یکجہتی کے ساتھ

قرطاسِ اعزاز
ڈاکٹر خلیل طوق آر
کے نام

استنبول یونیورسٹی، ترکی شعبہ اردو کے طلباء اور اساتذہ سے اظہار یکجہتی کے ساتھ

پاک ترک دوستی زندہ باد پاک ترک دوستی زندہ باد پاک ترک دوستی زندہ باد پاک ترک دوستی زندہ باد پاک ترک دوستی زندہ باد پاک ترک دوستی زندہ باد

''جاں کنی کا درد''

تنویر غلام
(لاہور)

والد کا نام: صلاح الدین طوق اَر
والدہ کا نام: گلمسر طوق اَر
تاریخ پیدائش: ۱۳ اپریل ۱۹۶۷ء
جائے پیدائش: باقرکوئے/استنبول
بی اے: استنبول یونیورسٹی، ادبیات فیکلٹی، شعبۂ فارسی، سال: ۱۹۸۵۔۱۹۸۹ء
ایم اے: استنبول یونیورسٹی، انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنس، شعبۂ اردو۔ فارسی، سال: ۱۹۸۹ء۔۱۹۹۲ء
مقالے کا موضوع: مرزا اسداللہ خاں غالب: زندگی اور آثار
پی ایچ ڈی: استنبول یونیورسٹی، انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنس، شعبۂ اردو۔ فارسی، سال: ۱۹۹۲ء۔۱۹۹۵ء
مقالے کا موضوع: بہادر شاہ ثانی کے عہد کی فارسی اور اردو شاعری اور اُس عہد کے شعراء (ایک مطالعہ)

کام

اسسٹنٹ شعبۂ فارسی ۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۹ء
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو ۱۹۹۹ء تا ۲۰۰۱ء
ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو ۲۰۰۱ء تا ۲۰۰۶ء
پروفیسر شعبۂ اردو ۲۰۰۶ء تا حال
صدرِ شعبۂ اردو ۱۹۹۹ء تا حال

ایڈیٹر

:ارتباط۔ استنبول سہ ماہی ادبی اور علمی مجلّہ
رکنیت: ترکی اور پاکستان کے تقریباً ۱۵ علمی اور ادبی رسالوں کے مجلس مشاورت کی رکنیت

تصانیف

۱) اردو گرائمر کی ابتدائی کتاب (حصہ اول)، استنبول ۱۹۹۵ء
۲) شوماسماوی گوک یوزونو کیندی یوردوم سانمشتیم بین (علامہ محمد اقبال کی شاعری سے انتخابات)، استنبول ۱۹۹۹ء
۳) ضیاء الدین نخشبی اور سلک السلوک، استنبول ۱۹۹۹ء
۴) پاکستان و ہندستان حکایلری (پاکستان اور ہندوستان کے افسانوں سے انتخابات کا ترجمہ)، استنبول ۲۰۰۰ء
۵) درویش عثمان اور گلشن عباد، استنبول ۲۰۰۰ء
۶) محمد اقبال، Stray Replections، (ترکی ترجمہ)، استنبول ۲۰۰۱ء
۷) محمد اقبال، جاوید نامہ (منظوم ترکی ترجمہ)، استنبول ۲۰۰۲ء
۸) مکاتبِ اقبال (ترکی ترجمہ)، استنبول ۲۰۰۲ء
۹) روحنامہ (ترکستان کے صدر سپر مراد ترکمن باشی کی تصنیف کا اردو ترجمہ۔ مختلف مترجموں کی ہمراہی میں) عشق آباد۔ ترکمانستان ۲۰۰۳ء
۱۰) کشمیر فائل (مسئلۂ کشمیر پر ایک کتاب)، استنبول ۲۰۰۳ء
۱۱) ایک قطرہ آنسو (شاعری)، کراچی ۲۰۰۳ء
۱۲) پیارا ملک ہے پاکستان (سفرنامۂ پاکستان)، کراچی ۲۰۰۵ء
۱۳) اقبال اور ترک (ایک تحقیقی جائزہ)، لاہور ۲۰۰۵ء
۱۴) استنبول میں شائع ہونے والا اردو اخبار ''جہان اسلام''، پشاور ۲۰۰۷ء
۱۵) آخری فریاد (شاعری)، لاہور ۲۰۰۷ء
۱۶) گونولدین دیلے (انتخابات) استنبول ۲۰۰۷ء
۱۷) جدید ترکی شاعری، لاہور ۲۰۰۹ء
۱۸) ترکی بچوں کی کہانیوں اور افسانے کی سات کتابوں کے اردو تراجم، لاہور ۲۰۰۸ء

اِن کتابوں کے علاوہ ترکی، پاکستان، ہندوستان، انگلینڈ اور دیگر بعض ملکوں کے مختلف جریدوں میں شائع شدہ ترکی۔ اردو اور انگریزی زبانوں میں ایک سو سے زائد مضامین۔

ایوارڈز

۱) علامہ اقبال ایوارڈ۔ یورپین اردو رائٹرز سوسائٹی کی جانب سے، لندن ۲۰۰۰ء
۲) فخرِ اردو ایوارڈ، اردو مرکز انٹرنیشنل، لاس اینجلس ۲۰۰۹ء
۳) اِن کے علاوہ مختلف موقعوں پر موصول شدہ ۸ سے زائد شیلڈز

Address:
Prof. Dr. Halil Toker
Head of Urdu Department
Istanbul University, Faculty of Letters
Beyazit-Istanbul/TURKEY
e-mail: khtoker@gmail.com

بلبلِ بے بال و پر

ڈاکٹر خلیل طوق اَر

۲۰ جنوری ۱۸۵۸ء کو بوقت صبح دیوان خاص قلعۂ دہلی۔ یہ ہندوستان کی تاریخ کے لیے ایک اہم موڑ ہے۔ ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کے لیے ایک آخری چال چلی جارہی ہے۔ آج ہندوستان کی آزادی کی آخری کرن تاریکی کے ہاتھوں مٹائی جارہی ہے اور ہندوستان غلامی کے ایک طویل دَور میں قدم رکھتا ہے۔

اس دن قلعۂ دہلی کے دیوان خاص میں دہلی کے آخری تاجدار اور مغل (بابری) خاندان کے آخری چراغ بہادر شاہ ظفر کے مقدمے کا پہلا اجلاس شروع ہوتا ہے۔ پریسیڈنٹ، ممبران، وکیل سرکار موجود ہیں۔

ملزم محمد بہادر شاہ سابق شاہ دہلی کو لایا جاتا ہے۔

اجلاس کے مجتمع کرنے اور لفٹننٹ کرنل ڈاس کو پریسیڈنٹ بنانے کے احکام پیش ہوتے اور پڑھے جاتے ہیں۔ افسران متعینہ کے نام ملزم کی موجودگی میں پڑھے جاتے ہیں۔

ملزم سے عدالت کا سوال: آپ کو موجودہ ممبران جیوری و پریسیڈنٹ کے مقدمہ کی سماعت کرنے میں کوئی اعتراض ہے؟

جواب: مجھے کچھ اعتراض نہیں ہے!(۱)

دنیا کی زندگی کتنی فریب دہ، کتنی جھوٹی ہے کہ دیکھئے بابری خاندان کے آخری چشم و چراغ، دلی کے آخری تاجدار اور ملکِ سخن کے شہسوار بہادر شاہ ظفر، آج ۲۰ جنوری ۱۸۵۸ء کو اپنے محل کے دیوان خاص میں ایک سماعت میں ایک معمولی ملزم کی حیثیت سے لائے جاتے ہیں اور ان سے سوال کیا جارہا تھا کہ ''موجودہ ممبران جیوری اور پریسیڈنٹ کے مقدمہ کی سماعت کرنے میں کوئی اعتراض ہے؟''

وہ کیسے اعتراض کرتے؟ ان سے ان کا ملک، ان کا شہر، ان کی رعیت، ان کا محل، ان کی اولاد، ان کے دوست یار مختصر ان کا سب کچھ زبردستی چھین لیا گیا تھا اور پوچھا تک نہیں گیا تھا کہ آپ کو کوئی اعتراض ہے یا نہیں؟

ہندستان کس طرح غلامی کی زنجیروں میں گرفتار ہوا اور ایک بادشاہ معمولی ملزم کی حیثیت سے اجنبیوں کی عدالت میں لایا گیا یہ بات کسی سے مخفی نہیں ہے لیکن آیئے اب ذرا ایک زوال پذیر سلطنت کے آخری تخت نشین ہونے کی وجہ سے بعضوں کی نگاہ میں پیدائشی مجرم ان شاعر بادشاہ کی زندگی کے اوراق ان کی شاعری سے بھی مدد لیتے ہوئے پلٹنے لگیں اور دیکھیں کہ قضائے الٰہی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچاتی ہے:

بہادر شاہ ظفر کا پورا نام ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ تھا۔ ان کی ولادت ۲۸ شعبان ۱۱۸۹ھ مطابق ۱۴ اکتوبر ۱۷۷۵ء کو ان کے والد اکبر شاہ ثانی کی ولی عہدی کے زمانے میں اکبر شاہ کی ہندو بیوی لال بائی کے بطن سے ہوئی تھی۔ ظفر کی پرورش ان کے دادا شاہ عالم ثانی کے زیر سایہ ہوئی تھی جو کہ بدنصیبی میں اپنے پوتے سے کچھ کم نہیں تھے۔ ۲۲ اکتوبر ۱۷۶۴ء کو بکسر کے مقام پر انگریزوں کے سامنے شکست کھانے کے بعد ۱۷۸۸ء میں غلام قادر نامی ایک ظالم کے حکم سے شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکال دی گئیں پھر مرہٹوں کے ہاتھوں وہ سالہا سال گرفتار رہے تاوقتیکہ لارڈ لیک کی فوجوں نے جمنا پار کر کے دہلی پر قبضہ کیا اور ان کو پھر اپنی برائے نام بادشاہت ملی۔ یہ بادشاہت ۱۸۰۷ء میں بہادر شاہ کے والد اکبر شاہ ثانی کو منتقل ہوگئی۔(۲) اکبر شاہ ثانی کا زمانہ کچھ آرام و سکون کا زمانہ تھا لیکن دہلی کے لال قلعہ پر مشتمل اس بادشاہت کے لیے بھی سازشیں اور چپقلشیں تھیں اور ظفر اور ان کے بھائی مرزا جہان گیر کے درمیان ولی عہدی کے لیے کچھ عرصہ مقابلہ جاری رہا۔ اس مقابلے میں ان کے والد اکبر شاہ، مرزا جہان گیر کی طرف داری کررہے تھے۔ ظفر اپنی زندگی کے اس بڑے امتحان میں یک وتنہا تھے اور آس پاس میں موجود لوگ مخلص نہیں تھے۔ جیسا کہ ایک شعر میں وہ رقمطراز ہیں(۳):

اہلِ دنیا تو نہیں کچھ مروت رکھتے
منہ پہ ہیں ملتے یہ ہیں دل میں عداوت رکھتے

لیکن چونکہ انگریز اپنے دستور کے مطابق ولی عہدی بادشاہ کے بڑے بیٹے کا حق سمجھتے تھے اور بہادر شاہ ظفر کی ولی عہدی مصلحتاً اور بالخصوص خود انگریزوں کے مفادات کے لیے زیادہ مناسب تھی لہٰذا انھوں نے ولی عہدی کے معاملے میں ظفر کا ساتھ دیا اور آس پاس میں کوئی مروت والے شخص کے نہ ملنے کے باوجود ظفر انگریزوں کے ذریعے اپنے مقابلے میں کامیاب رہے۔ ۱۲۵۳ء بمطابق ۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ ثانی کے انتقال پر ۲۵ اکتوبر ۱۸۳۷ء کو بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے۔(۴)

وہ تخت نشین ہونے کو تو ہوئے تھے لیکن اُن کی بادشاہت بس لال قلعہ کی دیواروں کے اندر تھی۔ ایک طرف سر پر انگریزوں کی تلوار اور دوسری طرف خزانہ شاہی کے خالی ہونے کی وجہ سے قلعہ کے باہر ساہوکاروں کا گھیرا اور وہ اس نقلی سونے کے قفس کے اندر ایک بال و پر ٹوٹے ہوئے بلبل کی صورت اپنی زندگی بسر کرنے لگے۔ ظفر کو ان کے اپنے ملک میں، ان کے اپنے شہر میں اور حتیٰ کہ ان کے اپنے قلعہ تک کے اندر سارے کام انگریزوں کے زیر اثر انجام دینے پڑتے تھے اور دہلی شہر میں یا محل میں جو کچھ بھی ہوا انگریزوں کے دستبرد سے چھٹکارا حاصل نہیں کرپاتا تھا۔ اس صورتحال کو ظفر یوں بیان کرتے ہیں(۵):

تسمہ تسمہ کردیا بس کاٹ کر عاشق کی کھال

وہ فرنگی زادِ کلکتہ جو سیکھا ناپنا

جیسا کہ اوپر بتایا گیا ظفر کو ملک و دولت اور بادشاہی بس نام کو ہی ملی تھی اور وہ اس صورتحال سے بخوبی واقف تھے لیکن ان کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ کیونکہ اُس عہد میں زمانہ نے خاص طور پر ہندوستان کے لیے اور عام طور پر عالم مشرق کے لیے کچھ ایسی کروٹ پلٹی تھی، جیسا کہ آج کل موجودہ دَور میں پھر پلٹنے لگا ہے، اس کو سنبھالنا بالخصوص ان بلبل بے بال و پر کے لیے ناممکن تھا کیونکہ وہ ایک ایسی حالت میں تھے کہ وہ دست دعا بھی دراز کریں قضائے الٰہی کو نہیں بدل سکتے تھے۔ وہ کہتے ہیں (۶):

دکھاتی ہے جو شمشیرِ قضا اپنی زبردستی
نہیں دست دعا کی کام آتی سپر دستی

ظفر کی الٹی قسمت اتنی بگڑی ہوئی تھی کہ قضائے الٰہی کے سامنے ان کی دعائیں کچھ کام نہ آنے کے ساتھ ساتھ جن سے ان کی امیدیں وابستہ تھیں وہ ان سے کہہ رہے تھے: ''پہلے تم مرتو لو پھر تمہاری امیدیں پوری ہو جائیں گی!'' (۷):

میں نے کہا کہو تو مسیحا تمھیں کہوں
کہنے لگے کہ کہنا ابھی پہلے مر تو لو

دراصل وہ اپنی اس حالت پر سراپا احتجاج ہیں اور کبھی کبھار ان کا یہ اندرونی احتجاج یوں ظاہر ہوتا ہے اور وہ اپنے سونے کے پنجرے کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں (۸):

قفس کے ٹکڑے اُڑا دوں پھڑک پھڑک کر آج
ارادہ میرا اسیرانِ ہم نفس یوں ہے

لیکن ان کے پاس لب بستہ احتجاج کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور وہ بس احتجاج مخفی کر پاتے ہیں۔ کیونکہ وہ کسی اور کے یعنی انگریزوں کے بس میں ہیں اور ان کے پنشن خوار ہیں جس کی یاد دہانی انگریز ہر موقع پر کرایا کرتے ہیں۔ ظفر خون کے آنسو بہاتے ہوئے کہتے ہیں (۹):

جو اس کی جان پہ گزرے ہے وہ ہی جانے
خدا کسی کو جہاں میں کسی کے بس نہ کرے

وہ کسی کے بس ہونے کو نہ چاہنے کے باوجود ان کو اپنی بے چارگی کا سخت احساس ہے۔ ویسے بھی یہ بے بال و پر بلبل اپنے پنجرے سے نکلے گا تو کیا کرے گا؟ اس میں اُڑنے تک کی ہمت و صلاحیت باقی نہیں ہے (۱۰):

اے اسیر واب نہ پر میں طاقتِ پرواز ہے
کیا کروگے تم نکل کر دام سے، بیٹھے رہو

پھر اسی معنے میں وہ کہتے ہیں (۱۱):

کھول دے صیاد تُو کھڑکی قفس کی شوق سے
بلبلِ بے بال و پر ظالم کدھر اُڑ جائے گی

بالکل اسی طرح ظفر کی مندرجہ ذیل خوبصورت غزل میں اس بلبلِ بے بال و پر کی اداسی، بے چارگی اور حالتِ پُر ملال کی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے۔ وہ یوں فرماتے ہیں (۱۲):

صوفیوں میں ہوں نہ رندوں میں نہ میخواروں میں ہوں
اے بتو بندہ خدا کا ہوں، گنہ گاروں میں ہوں
میری ملّت ہے محبت میرا مذہب عشق ہے
خواہ ہوں میں کافروں میں خواہ دینداروں میں ہوں
صفحۂ عالم پہ مانندِ نگیں مثل قلم!!!
یا سیہ رویوں میں ہوں یا سیہ کاروں میں ہوں
نے چڑھوں سر پر کسی کے اور نہ میں پاؤں پڑوں
اس چمن کے نے گلوں میں ہوں نہ میں خاروں میں ہوں
صورتِ تصویر مے کدہ میں دہر کے
کچھ نہ مدہوشوں میں ہوں میں اور نہ ہشیاروں میں ہوں
نے مرا مونس ہے کوئی اور نہ کوئی غمگسار
غم مرا غمخوار ہے میں غم کے غم خواروں میں ہوں
جو مجھے لیتا ہے پھر وہ پھیر دیتا ہے مجھے
میں عجب اک جنسِ ناکارہ خریداروں میں ہوں
خانۂ صیاد میں ہوں طائر دار!
پر نہ آزادوں میں ہوں نے اور گرفتاروں میں ہوں
اے ظفر میں کیا بتاؤں تجھ سے جو کچھ ہوں سو ہوں
لیکن اپنے فخرِ دین کے کفش برداروں میں ہوں

ظفر احتجاج اور تقدیرِ الٰہی پر رضا کے عالم میں پیچ و تاب کھاتے تھے کہ ۱۸۵۷ء میں اچانک ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف ایک طوفان برپا ہوا۔ میرٹھ سے بغاوت کر کے اپنے انگریز افسروں کو قتل کرنے والے سپاہی دہلی چلے آئے اور دہلی پر قابض ہونے کے بعد انھوں نے بہادر شاہ ظفر کو اپنی تحریک کا معنوی لیڈر مقرر کیا۔ ظفر سن رسیدہ تھے اور بعد میں اُڑانے والی افواہوں کے مطابق عقلی لحاظ سے کچھ معذور بھی تھے لیکن اس کے باوجود وہ اس تحریک کے انجام کا اندازہ بخوبی کر رہے تھے کیونکہ انھیں انگریزوں کی طاقت اور اپنے آس پاس میں موجود الٰہی بخش جیسے لوگوں کے قابل یقین نہ ہونے کا علم تھا اس لئے انھوں نے شروع میں بغاوت کرنے والوں کو روکنے کی کوشش کی۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ اس سیلاب کو روکنا ناممکن ہے تو وہ بھی اس میں بے اختیار بہنے لگے۔ پھر بے شمار لڑائیاں ہوئیں، بہت سارے معصوموں کا خون بہایا گیا۔ انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا اور مغل (بابری) خاندان کو نیست و نابود کر کے ہندوستان پر براہ راست حکمرانی کرنے لگے اور بہادر شاہ کی اولاد کو قتل کر کے شہر دلی کو برباد کر دیا۔

پھر سراج الدین بہادر شاہ ظفر کو ایک معمولی ملزم کی حیثیت سے جلاوطن کر دیا گیا اور وہ ۱۸۶۲ء میں اپنے وطن سے دور اس عالم فانی کو ترک کر گئے۔

سچ تو یہ کہ دلی کے آخری تاجدار ظفر بے چارے، بے کس، بے دوست و یار اور واقعی بے پر و بال تھے لیکن وہ اپنی تمام بے چارگیوں اور کمزوریوں کے باوجود ہندوستان میں ہندو مسلم اتفاق اور آزادی کی علامت رہے تھے۔ اس راز سے انگریز سرکار بھی بخوبی واقف تھی کہ ظفر کا کوئی اثر باقی نہ چھوڑنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی تھی۔ خود با اعتبار مسلمانوں سے ان کے خلاف منفی پروپیگنڈا کروایا۔ بعض اصحاب جانتے بوجھتے اپنے مفادات کی خاطر اور بعض لوگ بادل نخواستہ بس اپنی قوم کو تلوار کے منہ سے بچانے کی خاطر اس پروپیگنڈے میں شامل ہو گئے۔ جیسا کہ سرسید شامل ہوئے تھے اور اپنی معروف تصنیف اسباب بغاوت ہند میں قلمبند فرمایا تھا:

''دلی کے معزول بادشاہ کا یہ حال تھا کہ اگر اس سے کہا جاتا کہ پرستان میں جنوں کا بادشاہ آپ کا تابعدار ہے تو وہ اس کو سچ سمجھتا اور ایک چھوڑ دس فرمان لکھ دیتا۔ دلی کا معزول بادشاہ ہمیشہ خیال کرتا تھا کہ میں مکھی اور مچھر بن کر اُڑ جاتا ہوں اور لوگوں کی اور ملکوں کی خبر لے آتا ہوں اور اس بات کو وہ اپنے خیال میں سچ سمجھتا اور درباریوں سے تصدیق چاہتا تھا۔'' (۱۳)

دراصل یہ ایک ایسا بااثر حربہ تھا جسے اہل مغرب صدیوں سے بڑی خوبی سے استعمال کرتے آئے ہیں اور اہل برطانیہ بھی اس کام میں ماہر تھے۔ لیکن صرف یہ منفی پروپیگنڈا کافی نہیں تھا۔ ان کی وفات کے بعد بھی ہندوستان کی یکجہتی اور اتفاق کی مٹتی علامت کا کوئی نشان باقی نہیں رہنا تھا۔ ذرا رنگون میں قیدیوں کی نگرانی کرنے والے انگریز افسر نیلسن ڈیویس کے روزنامچے میں ظفر کی تجہیز و تکفین کے حالات مطالعہ کیجئے اور اس علامت یکجہتی کا انہدام کس طرح روئے عمل آیا وہ دیکھئے اور سبق حاصل کیجئے۔ اس سلسلے میں نیلسن ڈیوس نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے:

''رنگون جمعرات ۷ نومبر ۱۸۶۲ء

ابوظفر محمد بہادر شاہ آج صبح پانچ بجے انتقال کر گئے۔ چونکہ تمام تیاریاں مکمل تھیں اس لئے آج ہی شام چار بجے میں گارڈ کے عقب میں اینٹوں کی قبر میں ان کی تدفین کر دی گئی اور قبر کی اوپری سطح مٹی ڈال کر سطح زمین کے ساتھ ہموار کر دی گئی ہے۔ تھوڑے فاصلے پر بانسوں کا احاطہ کھینچ دیا گیا ہے تا کہ جب تک بانس گل سڑ کر گریں زمین پر گھاس اُگ چکی ہو اور کوئی علامت ایسی باقی نہ رہے جس سے آخری مغل شہنشاہ کی قبر کی نشان دہی کی جا سکے۔

مرحوم کی تجہیز و تکفین کے لیے ایک ملاّ کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ جنازے کو ایک صندوق میں رکھ کر اوپر سے سرخ رنگ کی ایک سوتی چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کا ایک ہجوم بازار سے آ کر احاطے کے قریب جمع ہو گیا تھا لیکن اس ہجوم کو ایک خاص فاصلے پر رکھا گیا اس طرح کہ ان میں سے کوئی بھی میّت کو نہ چھو سکے۔ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا۔۔۔ بادشاہ کے دونوں بیٹے جواں بخت اور شاہ عباس اور بادشاہ کا خادم احمد بیگ جنازے کے ساتھ تھے۔ شاہی خاندان کے دیگر افراد (بچوں اور عورتوں) کو جنازے میں شرکت کی اجازت نہیں تھی۔'' (۱۴)

چنانچہ ہندوستان کی یکجہتی اور اتفاق کی اس علامت کو مٹا دینے اور ہندوستان پر پوری طرح قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے ''بانٹو اور حکم کرو'' کی حکمت عملی پر شعوری طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفاق ڈالا اور ان دو بڑی قوموں کو ایک دوسرے سے نفرت کرا کر ان کو ایک دوسرے سے لڑا کر خود ہندوستان پر اپنا حکم چلایا۔ وہ اس حکمت عملی میں اتنا کامیاب رہے کہ آج تک ان کی حکمت عملی کے اثرات گاہے بہ گاہے محسوس کئے جا رہے ہیں۔ اب یہ خبر سننے میں آئی ہے کہ ظفر کی میت رنگون سے دلّی لانے کی تحریک چلی ہے۔ یہ بڑی اچھی خوشخبری ہے کیونکہ ظفر کی میت کو ہندوستان واپس منتقل کرنے سے تو شاید میت کو کچھ نہیں ملے گا لیکن یہ ہندوستان میں ایک نئے دَور کی طرف ایک قدم ہوگا جس میں پرانی نفرتوں کو بھلا کر اتحاد و اتفاق کی یادیں زندہ کی جائیں گی اور بہادر شاہ ظفر پھر ایک ایسے دَور کے روئے عمل آنے کی علامت ہوں گے۔

حوالہ جات:

۱) خواجہ حسن نظامی، مقدمہ بہادر شاہ ظفر، لاہور ۱۹۹۰ء، ص ۲۔
۲) اسلم پرویز، بہادر شاہ ظفر، کراچی ۱۹۸۹ء، ص ۳۸۔۴۰۔
۳) ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ ظفر، کلیات ظفر، لاہور ۱۹۹۴ء، جلد چہارم، ص ۴۶۵۔
۴) اسلم پرویز، ایضاً، ص ۴۴۔۴۷۔
۵) ایضاً، ص ۳۵۳۔
۶) کلیات ظفر، جلد چہارم، ص ۵۷۲۔
۷) اسلم پرویز، ایضاً، ص ۳۵۴۔
۸) ایضاً، ص ۳۵۲۔
۹) ایضاً، ص ۳۵۳۔
۱۰) ایضاً، ص ۳۵۳۔
۱۱) ایضاً، ص ۳۵۶۔
۱۲) کلیات ظفر، جلد اوّل ص ۱۹۳۔
۱۳) سرسید احمد خان، اسباب بغاوت ہند، (تالیف و تدوین سلیم الدین قریشی)، لاہور ۱۹۹۷ء، ص ۲۷۔
۱۴) اسلم پرویز، ایضاً، ص ۱۴۸۔۱۵۰۔

☆

براہِ راست

چہارسُو کا زیرِنظر شمارہ اس بار اپنے نام کی مناسبت سے ایک نئی اور خوشنما سمت کی نمائندگی کا آئینہ دار ہے! تاریخ' تہذیب' تمدن' دوستی' بھائی چارے اور جدوجہد کی طویل داستان اس اہم اشاعت کو خاص طرح کا تقدس اور وقار عطا کر رہے ہیں!! ہمیشہ کی مانند اس بار بھی آپ کی توقعات اور اعتماد کو ملحوظ رکھتے ہوئے آج کی بزمِ پُروقار میں برادر ملک ترکی کے نہایت ہونہار' الوالعزم اور ہردلعزیز ادیب' شاعر' نقاد' مدیر اور ماہرِتعلیم **ڈاکٹر خلیل طوق آر** کے شخصی وفنی کمالات سے کلی تعارف اور تعلق آپ کے لیے یقیناً باعث افتخار ہوگا!!!

گلزار جاوید

☆ ڈاکٹر صاحب! آپ کی شخصیت کی نسبت چار محبتوں ترکی، اردو، پاکستان اور ماہم نور کا جابجا ذکر ملتا ہے۔ تازہ صورت حال کی نسبت تفصیل سے بتلایئے؟

☆☆ میری محبتیں تو چار پانچ سے بہت زیادہ ہیں اور ان کی تعداد دن بہ دن بڑھتی چلی جارہی ہے۔ اب تو میرے بیٹے محمد طغرل کی محبت کا بھی اُن محبتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ اصل میں میرے دل میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی وسعت بخشی ہے جس میں بہ یک دم بہت سی محبتیں اکٹھی موجود ہوسکتی ہیں۔ پہلے سوال میں اس طرح اپنے دل کی وسعت کی بات کرنا تو کچھ خود پسندی کی صف میں شمار کیا جاسکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے کچھ اس انداز میں پیدا کیا ہے جس کا علاج نہیں۔ مجھے اپنی اس عادت سے کبھی کبھار شکایت بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس وجہ سے مَیں کسی سے ناراض نہیں ہو پاتا ہوں اور نہ ہی کسی پر غصہ اُتار پاتا ہوں اور اکثر اوقات یہ میرے سامنے مسئلہ بھی کھڑا کر دیتی ہے۔ میرے طالبعلموں سمیت مجھے جاننے والے لوگ اکثر مجھ سے یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ مجھے کبھی غصہ بھی آتا ہے یا نہیں؟ مختصراً بات یہ ہے کہ جب دل میں وسعت ہوتی ہے تو اس میں بہت سی محبتوں کے لیے گنجائش ہوتی ہے اور ان محبتوں میں ان چار (اب محمد طغرل کی محبت کے ساتھ پانچ) محبتوں کا درجہ دوسروں کی نسبت کافی اعلیٰ ہے۔ میرے خیال میں میری اپنی بیوی اور بچوں سے اور میرے اپنے وطن سے محبت کے بارے میں تو کچھ تفصیلی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ محبتیں کم وبیش تمام نوع انسان کے دلوں میں ہوتی ہیں۔ اردو اور پاکستان سے محبت کی کہانی تو بالکل الگ ہے۔ پاکستان سے اپنی محبت کی بات تو کسی حد تک قابل فہم ہے۔ کیونکہ ترکوں کے دل میں پاکستان کی محبت ہمارے بچپن سے ہمارے دل میں جگہ بنانے لگتی ہے۔ کبھی تحریک خلافت کی کہانیاں اور کبھی اس سلسلے میں اس خطے کے لوگوں کی دی گئی قربانیوں کے داستانیں جو کسی نہ کسی طرح سے سننے میں آتی ہیں ان سب کی وجہ سے ہمارے دل میں پاکستان اور اہل پاکستان کی جانب دلی وابستگی جنم لیتی ہے۔ یہ دلی وابستگی میرے دل میں کچھ آگے بڑھ کر محبت میں تبدیل ہوگئی اور پاکستان کی محبت سے اردو کی محبت نے جنم لیا اور اردو زبان کی خوبصورتی اور کشش نے مجھے اپنا مرغوب بنالیا۔ اور مجھے اپنی محبتوں کا اظہار کرنے میں کبھی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ ہاں مجھے یہاں یہ عرض کرنا ہوگا کہ مجھے ہندوستان کی تہذیب وثقافت سے محبت ہے لیکن اس کے اظہار کا موقع آج تک مجھے نہیں ملا۔

☆ لسانیات اور ادبیات کی جانب بچپن سے رجحان کے اسباب، اشتیاق کی کہانی اور اُن کا پس منظر بتلایئے؟

☆☆ اس رجحان کے اسباب مجھے بھی ٹھیک طرح سے معلوم نہیں۔ لیکن بچپن ہی سے مجھے بہت خواہش تھی کہ مختلف ملکوں اور زبانوں کے بارے میں معلومات حاصل کرلوں۔ اس لیے شروع شروع میں جب مجھے پڑھنا لکھنا آ گیا تو جہاں کہیں مجھے مختلف ملکوں، تہذیبوں اور زبانوں کے متعلق معلومات ملتی تھیں مَیں اُسے فوراً پڑھنا شروع کرتا تھا۔ اسی طرح بچپن ہی میں مَیں نے مختلف زبانوں کے الف بے سیکھے اور جب مَیں مڈل اسکول میں جارہا تھا تو ایک چھوٹی سی کتاب کی مدد سے مَیں نے خود بخود پرانی ترکی یعنی عثمانی زبان (عربی حروف میں لکھی جانے والی ترکی زبان) کے حروف تہجی کو سیکھ لیا تھا اور ترکی زبان کی پرانی کتابیں پڑھنے لگا تھا۔ اور جب جب میری عمر بڑھتی گئی تب تب میرا لسانیات اور ادب کا شوق بھی بڑھتا گیا۔ میرے دوست کہتے ہیں کہ خلیل کی زبان سیکھنے کی خواہش دیوانگی کی حد سے بھی آگے بڑھی ہے بلکہ اسے madness کہیں تو بجا ہے۔

☆ مصوری اور شاعری کے اشغال کب اور کیونکر اپنائے۔ اُن کے ابتدائی مدارج کے سر ہونے کی روداد اور آج کل آپ کی زندگی میں اُن کا رول کیا ہے؟

☆☆ مصوری کے شغل کی بات تو نجانے کہاں سے نکلی؟ مجھے تو تصویر کشی کا شوق تھا اور ہے بھی لیکن یہ کبھی باقاعدہ شغل کی حیثیت اختیار نہیں کرسکی۔ مصوری کے لیے خاص وقت درکار ہوتا ہے اور میرے پاس وقت کی کمی ہے۔ مجھے اکثر بہت سارے کام اکھٹے انجام دینے ہوتے ہیں اور مجھے جو تھوڑی بہت فرصت ملتی ہے تو اس میں اکثر اپنی طبعیت کی ناسازی کی وجہ سے بستر علالت میں

دراز ہونا پڑتا ہے۔اسی سبب تصویر کشی کا جو شوق ہے اسے اپنی خواہش کے مطابق وقت نہیں دے سکا اور اس کو خاص شغل کے طور پر قائم نہیں رکھ سکا۔مَیں اپنے شاعری کے شوق کے سلسلے میں زیادہ خوش قسمت ہوں کہ اس کے لیے مَیں وقت نکال پاتا تھا۔دراصل شاعری میں بات یہ ہے کہ جب دل میں آمد ہوتی ہے تو انسان اس کو قلمبند بھی کر پاتا ہے اور مصوری کی طرح فارغ وقت کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی۔میری شاعری کے ابتدائی مراحل پوچھیں گے تو مَیں یہ کہوں گا کہ اس کی ابتدا یونیورسٹی کے سالوں میں فارسی شاعری کے زیر اثر پہلے فارسی میں ہوئی اور اردو سیکھنے بعد اردو میں جاری رہی۔دراصل میری شاعری کچھ میرے مزاج سے تعلق رکھتی ہے۔مَیں مزاجاً کچھ شرمیلی طبعیت کا مالک ہوں۔خیر ابھی تو عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ شرمیلا پن کم ہونے لگا ہے لیکن جوانی میں زیادہ تھا، اس شرمیلے پن کی وجہ سے مَیں ایک ایسی زبان میں شاعری کرنے لگتا کہ میرے دل کی باتیں کسی کی سمجھ میں نہ آئیں اور مَیں ایک طرح سے اپنے شوق کو پورا بھی کرلوں۔ پہلے تو جو نظمیں لکھ رہا تھا انھیں اِدھر اُدھر رکھ کر گم ہی کر دیتا تھا۔لیکن جب میری شادی ہوئی تو میری اہلیہ میری شاعری کے نمونے اکٹھے کرنے لگی اور اکٹھے کرتے کرتے ایک مجموعہ جمع ہوا۔پھر کچھ اپنی اہلیہ کے اصرار سے کچھ میرے محسن سید معراج جامی کی دل دہی سے مَیں نے اپنے پہلے مجموعۂ کلام ''ایک قطرہ آنسو'' کو تیار کر کے کراچی سے شائع کرایا۔اس طرح سے میری باقاعدہ شاعری کا آغاز ہوا اور آج بھی جاری ہے۔خیر باقاعدہ شاعری کہتے ہوئے میرا کبھی یہ مطلب نہیں کہ مَیں ہر لحاظ سے اردو شاعری کے لوازمات پر پورا اُترتے ہوئے نظمیں لکھتا ہوں اور مَیں پکا پکا شاعر ہوں بالخصوص غزل کی صنف میں جو میرے کچھ نئے تجربات ہیں وہ اردو کے بعض معزز شعرا اور ناقدین کے لیے قابل قبول نہیں۔اسی وجہ سے مَیں اپنے شاعر ہونے پر اصرار نہیں کرتا ہوں اور یہ کبھی نہیں کہتا ہوں کہ مَیں بہت ہی اعلیٰ معیار کی شاعری کرتا ہوں۔

☆ ترکی جیسے روشن خیال سیکولر معاشرے میں روحانیت کی جانب میلان بجائے خود حیرت کی بات ہے۔آپ ہمیں تصوّف کی بابت اپنے رجحان اور مستقبل میں مسٹر طوق اُر کے اندر سے ملاّ کی برآمدگی کے امکانات یا خدشات کی بابت کچھ بتلایئے؟

☆☆ آپ کا یہ سوال پڑھ کر مجھے بے حد حیرت ہوئی۔معلوم نہیں آپ اس نتیجے پر کس طرح پہنچ گئے ہیں کہ میرے اندر سے کوئی ملاّ نکلنے کا خدشہ ہے۔ کیونکہ اگر آپ یہ سوچتے ہیں کہ اسلام پر ایمان رکھنا ملاّئیت ہے تو دنیا میں کوئی بھی باایمان مسلمان باقی نہیں بچے گا جو ملاّ نہیں کہلاتا ہو۔ اور مجھے پتا نہیں یہ خیال کیسے ظہور پذیر ہوا کہ سیکولرزم کا مطلب لادینیت ہے اور پھر لادینیت کا مطلب روشن خیالی ہے۔ آپ یورپ میں دیکھیے، سیکولرزم کا گہوارہ فرانس اور دیگر یوروپین ممالک دیکھیے اُن کے لیڈر تک اپنی ذاتی زندگی میں عیسائیت پر یقین رکھتے ہیں اور گرجا گھر جانے میں شرم محسوس نہیں کرتے اور وہاں کوئی بھی اُن پر قدامت پرستی کا لیبل نہیں لگاتا ہے اور ہم مسلمانوں کا کمال ہے کہ اپنے لیڈر کی روشن خیالی کا تعلق اُس کی لادینیت سے قائم کرتے ہیں (یہاں لادینیت سے مراد سیکولرزم نہیں ہے)۔یہ بہت طول و دراز مباحثہ ہے جس پر گھنٹوں تک بات کی جاسکتی ہے۔ مَیں ہمیشہ یہ کہتا ہوں کہ میرا ملک سیکولر ہے اور اُس پر مجھے فخر ہے اور مَیں صحیح معنوں میں سیکولر ہوں اور اِس پر بھی مجھے فخر ہے اور مجھے سب سے بڑھ کر فخر اِس بات پر ہے کہ مَیں مسلمان ہوں اور اللہ اور اُس کے رسول پر کامل یقین رکھتا ہوں۔اگر ملاّ سے آپ کی مراد مسجد میں نماز پڑھانے والا اور تعلیمِ قرآن دینے والا مولوی ہے تو مَیں وہ بن ہی نہیں سکتا ہوں کیونکہ اُس کے لئے ہمارے ملک میں باقاعدہ تعلیم حاصل کر کے متعلقہ اسکولوں سے فارغ التحصیل ہونے کی ضرورت ہے۔ ہاں اگر ملاّ سے آپ کی مراد وہ جاہل و ناداں لوگ ہیں جو اسلام سے کوسوں دُور اپنی جاہلیت اور عادات و رسومات کو اسلام سمجھتے ہیں تو مَیں اِس کو توہین سمجھ کر رد کرتا ہوں کہ یہ سرے سے ایک غلط فہمی ہی ہے۔

☆ آپ کی ترکی، اردو، فارسی، انگریزی کا جواز تو ملتا ہے مگر ہندی اور پنجابی سے آپ کے تعلق اور دلچسپی کی کہانی کیا ہے؟

☆☆ ہندی سیکھنے کا تو جواز میرے پاس پہلے سے تیار ہے۔ہندی تو اردو کی بہن ہے۔جب ایک بہن سے محبت ہوئی تو دوسری بہن سے بھی قریبی رشتہ قائم ہوا اور مَیں نے سوچا کہ بہن کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔سو ہندی بھی سیکھنے لگا۔ہاں پنجابی کے لیے جواز کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ پنجابی میری سسرالی زبان ہے اور سسرالی زبان نہ سیکھنا تو کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہوتی۔آپ سوچئے آپ گھر میں بیٹھے ہوں اور آس پاس میں لوگ بیٹھے کسی اور زبان میں آپ کے بارے میں بات کرتے ہوں اور آپ کو سمجھ ہی نہیں آتا ہو کہ وہ آپ کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ اور تجسس، تجسس، تجسس اور آخر کار مَیں نے پنجابی کی شد بد بھی حاصل کر لی۔

☆ ایک روح ایک وقت میں کتنی زبانوں اور تہذیب کے درمیان سفر کر سکتی ہے۔خصوصیت کے ساتھ آپ اپنی کیفیت بیان فرمایئے؟

☆☆ اس کا بہترین جواب تو برصغیر کے لوگوں کے پاس موجود ہے کیونکہ وہ صدیوں سے اس تجربے سے گزر رہے ہیں اور اکثر ایک ہی خاندان کے اندر بہ یک وقت دو تین الگ الگ زبانیں بولتے ہیں اور مختلف تہذیبوں کا سنگم بنتے ہیں۔میرا تجربہ بھی کچھ اس طرح کا ہے۔زبانیں اور تہذیبیں جن سے مجھے تعلق ہے ایک سنگم بنی ہوئی ہیں میرے اندر اور مجھے ان کے درمیان سفر کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی ہے۔

☆ اچھی تنخواہ اور آرام کی سرکاری نوکری کے بجائے یونیورسٹی کی ملازمت کو ترجیح دینے کی وجوہات کیا تھیں؟

☆☆ میرے اندازہ کے مطابق یہ بھی میری دیوانگی سے تعلق رکھتا ہے اور

کبھی کبھار میں ذرا تنگ آتا ہوں تو یہ سوچنے لگتا ہوں کہ کیا مَیں نے اچھا کیا کہ نہیں؟ لیکن عام طور پر یہ سوچتا ہوں کہ مَیں نے بہت اچھا کیا ہے۔ کیونکہ مجھے زبانیں سیکھنا، تحقیق کرنا اور اپنی حاصل کردہ معلومات کو دوسروں میں بانٹنا بہت ہی اچھا لگتا ہے اسی طرح سے میری زندگی کوئی بامعنیٰ بہ الفاظ دیگر بامطلب بن جاتی ہے۔

☆ اس وقت ہمارے ذہن میں ''ارتباط'' کا اجراء ادارت، اشاعت کی بابت تفصیل جاننے کا اشتیاق سر ابھار رہا ہے؟

☆☆ اس کے جواب کے لیے تو آپ کو ارتباط کے پہلے شمارے کے لیے مَیں نے جو اداریہ لکھا تھا اس میں کافی معلومات ملیں گی۔ میرے خیال میں اس اداریہ کو یہاں نقل کرنا شاید مناسب ہوگا۔ وہ اداریہ کچھ یوں ہے:

> ''یہ ارتباط کا پہلا شمارہ ہے۔ اردو میں ایک ادبی اور تحقیقی مجلّہ! برصغیر پاک و ہند سے لے کر اردو دنیا کے گوشہ گوشہ میں اردو میں بے شمار ادبی، علمی اور تحقیقی مجلّوں کی اشاعت ہوتے ہوئے ایک اجنبی ترک کو ایک اجنبی زبان میں ایک ادبی مجلّہ نکالنے کی کہاں سے سوجھی؟ اور اِس نے ایک ایسا کام، جس کا وہ اہل بھی نہیں ہے، کی ہمت کیونکر کی؟ یہ ایسے سوالات ہیں جنھیں آج تک، حتیٰ کہ اِس لمحے تک جبکہ ''سہ ماہی ارتباط'' کی تیاریاں مکمل ہو کر اشاعت کے مرحلے پر پہنچی ہیں، میں اپنے آپ سے بھی پوچھتا آیا ہوں اور پوچھ رہا ہوں۔ لیکن اِس کے باوجود میں نے یہ اقدام کیا ہے اور ''سہ ماہی ارتباط'' قارئینِ کرام کے سامنے ہے۔''

دراصل ارتباط کی اشاعت میں محرک میری تین محبتیں ہیں۔ وہ تین محبتیں: اہلِ برصغیر پاک و ہند سے محبت، اردو زبان سے محبت اور اپنی تاریخ سے محبت ہیں۔ اہلِ پاک و ہند سے میری محبت کی کہانی میرے بچپن سے شروع ہوتی ہے جب میں اپنے خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ ہفتے میں ایک دن ہندی فلم دیکھنے کے لیے سینما جایا کرتا تھا۔ اُن دنوں یعنی آج سے تقریباً تیس پینتیس سال قبل کی ہندستانی فلموں میں پیار تھا، دکھ درد تھا، ہنسی مذاق تھا مختصر اُن میں زندگی کے ہر پہلو موجود تھے لیکن ہندی کی خوشبو کے ساتھ۔ وہ فلمیں ترکی ڈبنگ کی ہوئی ہوتی تھیں اور صرف اُن کے گانے اردو، ہندی میں ہوتے تھے اور ہم سب بچّے اُن گانوں کو غلط سلط یاد کر کے گانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ کبھی راج کپور کی ''آوارہ'' فلم کا گانا ''آوارہ ہوں'' کو اپنے انداز میں ''آوارے مو، آوارے مو'' بنا کر گاتے اور کبھی ''جو وعدہ کیا وہ نبھانا پڑے گا'' کے بول کو ''جو وادے کی یا وونبانے پرے گا'' میں تبدیل کر کے گاتے۔ مختصر یہ کہ بچپنے میں ہندی فلموں کے اثرات ہم پر اِس طرح سے مرتب ہوئے کہ کچھ عرصے بعد ہند سے جو بھی آتا وہ ہمارے لیے عزیز ٹھہرنے لگا کیونکہ اُس زمانے کی ہندوستانی فلمیں آجکل کی مانند خون خرابے والی نہیں تھیں اور ہندوستان کے محبت بھرے پہلو کو ہمیں دکھاتی تھیں۔ بعد میں جب ہم بڑے ہونے لگے اور مجھے تاریخ سے دلچسپی پیدا ہونے لگی تو کچھ کچھ یہ علم ہونے لگا کہ ہمارے مشکل دِنوں میں مسلمانانِ ہندو پاکستان نے ہماری امداد کے لیے کیا کیا مصیبتیں برداشت کی ہیں اور ہماری جنگوں میں ہمارا سہارا بننے کی خاطر اپنے گھر بار چھوڑ کر بھاگے بھاگے یہاں چلے آئے ہیں۔ پھر ضیاء الحق مرحوم کے زمانے میں پاکستان اور ترکی کے تعلقات اِس طرح محکم ہونے لگے تھے کہ ترکی میں ہر فرد کی زبان پہ ''جیوے جیوے پاکستان'' کے بول گونجنے لگے تھے اور ترکی میں جب کسی پاکستانی کو دیکھتے تو اُسے روک کر لوگ اِسی گیت کو گاتے۔ اِسی طرح میرے دل میں برصغیر پاک و ہند سے اور اہل پاکستان و ہند سے ایک عجیب قسم کا پیار پیدا ہوا۔ اِسی پیار کی بناء پر جب میں نے استنبول یونیورسٹی، شعبۂ السنۂ مشرقیہ میں فارسی کی تعلیم کے لیے داخلہ لیا اور اُنھیں دِنوں میں شعبۂ اردو کے قیام کے لیے پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار مرحوم پاکستان سے تشریف لائے تو میں بھی اُن کی کلاسوں میں جانے لگا اور اُن سے اردو سیکھنے لگا۔ یہ زبان جو میری زبان کے ایک لفظ ''اردو'' سے پکاری جاتی تھی مجھے بہت ہی پیاری لگی۔ اِس کی مٹھاس، سحر آفرینی اور وسعتِ بیاں جو ہے وہ مجھ پر جادو کی طرح طاری ہوگئی اور اردو سے بھی پیار ہونے لگا۔ اِسی طرح اردو سیکھ کر برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کے دروازے جو میرے سامنے وا ہوئے تو میں نے دیکھا کہ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ ہم ترکوں کی بھی تاریخ ہے اور اِس تاریخ کے ہر ورق سے میری اپنی تاریخ کی خوشبو آتی ہے۔ میرے دل میں ان تین محبتوں کی بیداری کے بعد جب میں اہل پاکستان اور ہندوستان سے زیادہ ملنے لگا ہوں تو مجھے یہ دیکھ کر بہت افسوس بلکہ شدید صدمہ ہوا کہ بالخصوص نئی نسلوں میں ترکی سے واقفیت اور محبت کم ہوتی جا رہی ہے اور ایک عجیب قسم کی لاتعلقی نہ صرف پاکستان اور ہندوستان میں ترکی کے لیے بلکہ ترکی میں پاکستان اور ہندوستان کے لیے واقع ہونے لگی ہے۔ ترکی میں تو میں اور ہمارے دیگر ہم کار پاک و ہند کی نئے سرے سے پہچان کرانے کی خاطر اپنی سی کوششیں کرتے ہیں اور مجھے خوشی کے ساتھ علم ہے کہ برصغیر میں بھی کچھ اصحاب ایسے ہیں کہ موجود دوستی و محبت کے دوام کی خاطر تگ و دو کرتے ہیں۔ بہ ایں سبب میں کافی عرصے سے سوچ رہا تھا کہ میں بھی اپنی سی ایک کوشش کرلوں۔ ترکی اور برصغیر پاک و ہند کی صدیوں پر محیط دوستی اور محبت کے قائم رہنے میں مددگار بننے کی غرض سے ایک ایسا مجلّہ جاری کروں جس میں اِس قدیم دوستی اور محبت کی جھلکیاں نمودار ہوں اور بالخصوص نئی نسلوں کو اِس کی یاددہانی کرائی جائے۔''

☆ کچھ روشنی پروفیسر غلام حسین ذوالفقار کی شخصیت' ملاقات اور اثرات پر ڈالیے اور اس تعلق کے رشتہ داری میں تبدیل ہونے کے اسباب بھی بتلایئے؟

☆☆ مَیں نے کہیں ان کے بارے میں یوں لکھا تھا:

''سر پر سیاہ قرہ قلی ٹوپی، شلوار قمیص اور موسم کے مطابق واسکٹ زیب تن کئے ہوئے ایک پاکستانی استاد ہوگزرے ہیں استنبول سے جو اپنے طور طریقہ، اپنی عادات واطوار اور پوشاک، رکھ رکھاؤ، اور لازوال علمی ورثہ سے آج تک استنبول یونیورسٹی کے اس وقت کے طلبہ اور اساتذہ کی طرف سے خیر ودعا کے ساتھ یاد کئے جاتے ہیں۔ وہ پاکستانی استاد تھے پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اور وہ تھے میرے استاد، میرے کرم فرما، کانِ علم و فیض، میرے خسر اور میرے والدِ محترم۔'' واقعتاً وہ ہمارے سامنے پاکستان کی قومی شناخت کے ایک ممتاز نمائندے کی حیثیت سے اُبھر کر آئے تھے اور وہ ایک ایسے عظیم عالم وفاضل تھے کہ ترکی میں جو ان سے ملتا تھا وہ ان کا گرویدہ بن جاتا تھا۔ انھیں پاکستان، اردو اور ترکی سے عشق تھا جس کے اثرات ان کے میرے خسر بننے سے قبل بھی بعد بھی مجھ پر مرتب ہوئے۔''

☆ نسلی اشتراک کے علاوہ غالب سے آپ کی محبت اور لگاؤ کے اسباب نیز ترکی میں غالب کے مقام، مستقبل کی بابت آپ کی رائے کیا ہے؟

☆☆ مرزا اسد اللہ خاں غالب سے میری دلچسپی ان سے نسلی اشتراک سے زیادہ ان کی شعری عظمت اور اعلیٰ مرتبے سے تعلق رکھتی ہے۔ اور مَیں اُنھیں اردو کے حافظ شیرازی مانتا ہوں اور یہ یقین رکھتا ہوں کہ عالمی ادب میں غالب اُس مقام کے حقدار ہیں جو حافظ شیرازی کو ملا ہے۔ ترکی میں بھی اگر ان کے تعارف کے سلسلے میں زیادہ کام کیا جائے تو یقیناً ان کی شہرت بڑھ جائے گی اور اس سلسلے میں اکا دکا کام بھی ہونے لگا ہے۔ میری خواہش یہ ہے کہ آئندہ چل کر شعر وشاعری سے دلچسپی رکھنے والا کوئی طالبعلم آئے تو اسے اس سلسلے میں کام کرنے کی ترغیب دی جائے۔

☆ برصغیر کے فارسی شعراء بالخصوص آخری تاجدار ہند بہادر شاہ ظفر سے آپ کی دلچسپی کا جواز جاننا بھی ضروری ہے؟

☆☆ فارسی ایک خاص قسم کی خوبصورت اور پُر ترنم زبان ہے اور اس کی شاعری بھی مجھے بہت پسند ہے اور چونکہ مجھے سبکِ ہندی سے کافی دلچسپی تھی لہٰذا فارسی شاعری کے ہندی اسلوب کا مرکز ہندوستان کی فارسی شاعری اور شعراء پر بھی میری دلچسپی مرکوز رہی اور بہادر شاہ ظفر کا زمانہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا بھی آخری درخشاں دَور تھا۔ شوق سے مَیں نے اس موضوع پر کام کیا۔

☆ ایک ترک النسل اہل قلم کو مغلوں کی زبان وادب، تہذیب، ثقافت اور اندازِ حکمرانی میں اس قدر دلچسپی کی وجوہات کیا ہیں؟

☆☆ بابر ترک نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی تعلق کی وجہ سے ترک اہل قلم کو ان کی زبان وادب، تہذیب وغیرہ سے دلچسپی زیادہ ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ آپ کو علم ہوگا یا نہیں آخری بابری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے زمانے تک بھی محل میں ترکی زبان زندہ تھی اور ترکستان سے ہندوستان کوچ کر کے آنے والے لوگ خود ترکی زبان کے سوا کوئی اور زبان نہ جاننے کے باوجود اعلیٰ منصب حاصل کر لیتے تھے کیونکہ بابری محل میں نظام حکومت سنبھالنے والے امرا اور فوج کے سرداروں کو ترکی زبان آتی تھی۔ اس کی سب سے اچھی مثال مرزا اسد اللہ خاں غالب کے دادا قوقان بیگ کی ہے۔ جس طرح کہ ہم سب کو معلوم ہے وہ اپنے کچھ فوجی سپاہیوں کے ساتھ ہندوستان کوچ کر کے آئے اور انھیں ترکی کے علاوہ کوئی اور زبان نہ آنے کے باوجود بلا توقف اچھا عہدہ ملا۔ میرا مطلب، ان کی زبان ہماری زبان تھی، ادب، تہذیب وثقافت ہماری تہذیب کا حصہ تھا اور نظام حکومت ہمارا تھا۔ پھر کیوں ہمارے اہل قلم کو ان سے دلچسپی نہ ہو؟

☆ آپ کے علمی، ادبی سفر میں اقبال کی حیثیت ہر اعتبار سے حاوی نظر آتی ہے۔ اس تعلق کو آپ کیا عنوان دیتے ہیں اور ترکی میں اقبال کا مستقبل آپ کے خیال میں کیا ہے؟

☆☆ جی ہاں، جس طرح آپ نے فرمایا ہے بالکل اسی طرح میرے علمی اور ادبی سفر پر اقبال حاوی ہے۔ ایک لحاظ سے وہ عالم اسلام میں اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے علمبردار تھے۔ بالخصوص ان کی نظریۂ خودی جو ہے وہ مسلمانوں کی نئی شناخت کی پیغام بر ہے۔ اس لحاظ سے وہ ترکی میں بہت معروف ہیں اور ان کے قارئین کا حلقہ خاصا وسیع ہے اور اقبال کی شہرت ترکی میں دن بہ دن پھیل رہی ہے۔ اب ترکی میں ان کے نام سے ویب سائٹز ہیں اور نیٹ پہ ان کے فانز کلپ بھی موجود ہیں۔

☆ آپ کے ایک فیصلے کی بابت ہم اوپر کی سطور میں گفتگو کر چکے ہیں۔ سوال یہاں یہ نمایاں ہوتا ہے کہ تدریس کے ساتھ تخلیق کی جانب آپ کا رجحان کب اور کیونکر ہوا اور آپ نے اب تک کس قدر ملکی وغیر ملکی اہلِ قلم کو پڑھا اور کس کے اثرات آپ کے ہاں زیادہ گھر کر گئے؟

☆☆ جس طرح مَیں نے ذکر کیا تھا مجھے ادب اور لسانیات سے تعلق بچپن ہی سے تھا اور مَیں بچپن اور جوانی میں آج کی نسبت کافی زیادہ کتاب پڑھ رہا تھا۔ خیر وہ وقت تو فارغ بالی کا زمانہ تھا اور آج کی نسبت ہمارے پاس وقت بھی ہوتا تھا۔ ہمارے گھر میں اپنے خیالات اور سیاسی رجحانات کے لحاظ سے بالکل آزادی تھی۔ میری سب سے بڑی بہن رومانوی قسم کی لڑکی تھی اور مسلسل عشقیہ ناول اور افسانہ وغیرہ پڑھ رہی تھیں۔ میری منجھلی بہن سوشلسٹ اور کمیونسٹ خیالات کی مالک تھی اور اسی قسم کی کتابیں پڑھ رہی تھیں اور مَیں تھا مذہبی خیالات کا مالک۔ اس لیے ہمارے گھر میں ہر قسم کی کتابیں موجود ہوتی تھیں۔ لیکن میری بات یہ تھی کہ مَیں ہر قسم کی کتابیں پڑھ رہا تھا۔ ایک طرح سے تلخیص صحیح بخاری، سیرتِ نبی اور مذہبی کہانیوں کا مطالعہ کر رہا تھا اور دوسری طرف سے Tolstoy,

Maxim Gorkyاور Jack London کی کتابیں اور ترکی کے رومانوی مصنفوں کی کتابیں پڑھ رہا تھا۔ اس سبب مجھے معلوم نہیں کہ مجھ پر کس کا اثر کس انداز میں ہوا ہے۔ ہاں جب یونیورسٹی گیا تو میری توجہ مشرقی مصنفوں پر مبذول ہوئی اور ساتھ ساتھ میری تخلیقی زندگی کی بھی شروعات ہوئی۔ مَیں عام طور پر فارسی میں سعدی شیرازی، عطار، مولانا جلال الدین رومی اور حافظ کو پسند کرتا ہوں۔ اردو میں سب سے پہلے علامہ محمد اقبال، غالب اور میر تقی میر، فیض احمد فیض کو ترجیح دیتا ہوں۔ ترکی شعرا میں ناظم حکمت اور نجیب فاضل سے دلچسپی لے رہا ہوں۔

☆ ''پاک و ہند کی کہانیاں'' ترکی زبان میں منتقل کرنے کا خیال کیونکر آیا۔ دورانِ ترجمہ کس افسانہ نگار سے آپ نے زیادہ قربت محسوس کی اور یہ کہ کبھی آپ کو کہانی لکھنے کا خیال کیوں نہیں آیا؟

☆☆ یہ کتاب بھی میری ترکی میں اردو کے تعارف کرانے کی خواہش سے تعلق رکھتی ہے۔ مَیں نے چاہا کہ اس صنف ادب میں بھی ترکی میں اردو کا تعارف کرایا جائے اور تقابلی مطالعہ کی زمین ہموار کرنے میں یہ مددگار ثابت ہو جائے۔ دورانِ ترجمہ تو سب سے زیادہ کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو کو اپنے قریب پایا اور پھر منشایاد صاحب کی کہانیاں بھی مجھے پسند ہیں۔ کہانی نہ لکھنے کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں، جب آمد نہ ہو تو خلیل کیا کرے؟ میں افسانہ پڑھتا ہوں لیکن کبھی میرے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ مَیں بھی ایک افسانہ قلمبند کروں۔ افسانہ ایک الگ صنف ادب ہے اور میرے خیال میں اگر مَیں کبھی افسانہ لکھوں تو اس صنف کے تیکنیکی لوازمات کو پورا نہیں کر سکوں گا۔

☆ آپ نے اپنے سفرنامے ''پیارا ملک ہے پاکستان'' میں بہت سے محبِّ وطن پاکستانیوں سے بڑھ کر پاکستان کا دفاع کیا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس ضمن میں آپ مبالغے کی حدود سے بھی تجاوز کرتے نظر آتے ہیں؟

☆☆ آپ کی یہ بات سن کر تو واقعتاً مجھے خوشی بھی ہوئی ہے اور بہت تعجب بھی ہوا ہے۔ خوشی اِس بات پر ہوئی ہے کہ آپ جیسے ایک معتبر پاکستانی یہ بتاتے ہیں کہ مَیں نے محبِّ وطن پاکستانیوں سے بڑھ کر پاکستان کا دفاع کیا ہے۔ یہ میرے لیے فخر کی بات ہے کیونکہ ہم پاکستانیوں کو اپنے سگے بھائیوں کی طرح مانتے ہیں اور اپنے بھائی کا دفاع اپنا ہی دفاع ہے میرے نزدیک۔ ہاں تعجب اِس بات پر ہوا ہے کہ مَیں اس ضمن میں مبالغے کی حدود سے بھی تجاوز کر گیا ہوں۔ دراصل یہ اس طرح کہنے والوں کی غلط فہمی ہے۔ مَیں نے اپنی تصانیف میں مبالغہ سے کبھی کام نہیں لیا۔ مبالغہ سے کام اُس وقت لیا جاتا ہے جب کسی کو کسی سے مفاد کی توقع ہوتی ہے۔ ارے جناب، جب کوئی بندہ کچھ لکھ لکھ کر میری طرح خطرہ مول لے وہ بندہ کبھی مبالغہ آمیز بات کر سکتا ہے؟ مَیں یہ سوچتا ہوں کہ آپ دنیا کو جس طرح سے دیکھنا چاہیں گے وہ آپ کو اسی طرح دکھائی دے گی۔ اگر آپ قنوطی نظر سے دیکھیں گے تو آپ کو اُس کی برائیاں ہی برائیاں نظر آئیں گی اور اگر معروضی نظر سے دیکھیں گے تو اُس کی اچھائیاں دکھائی دیں گی۔ مَیں جب پاکستان کو دیکھتا ہوں تو صرف اُس کی اچھائیاں مجھے نظر آتی ہیں اور برائیوں کو پس پشت ڈال دیتا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے اطراف کو جس عینک سے بھی دیکھیں گے وہ آپ کو اسی طرح نظر آنے لگیں گے اور بلکہ آپ انھیں جس طرح سے دیکھنا چاہتے ہیں وہ اُسی حالت میں منتقل ہوں گے۔ اگر مَیں ہندوستان جا سکتا تو وہاں بھی مجھے اِدھر اُدھر کی گندگی یا سڑکوں پر غریب لوگ نہیں تاج محل، قطب مینار اور لال قلعہ نظر آئے گا۔

☆ کشمیر کے حساس موضوع نے آپ کو اپنی جانب کب اور کیونکر متوجہ کیا نیز یہ کہ آپ اس حساس موضوع کو کس زاویے سے دیکھتے اور کس نتیجے پر پہنچتے ہیں؟

☆☆ دنیا میں جہاں کسی بے چارے کا حق زبردستی اس کے ہاتھ سے چھین لیا جائے، جہاں کسی بے گناہ کو قتل کیا جائے اور جہاں کہیں ظلم و تشدد کا علم گڑھا جاتا ہے میرا دل اُنہیں بے چاروں کے ساتھ دھڑکنے لگتا ہے اور مجھے حد سے زیادہ افسوس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں سوچتے سوچتے اکثر اوقات بیمار پڑ جاتا ہوں۔ کشمیر بھی ایک ایسا خطہ زمین ہے جہاں صدیوں سے ظلم و تشدد اور خون ریزی کا دور دورا ہے۔ مَیں اس مسئلے میں دونوں طرفوں کی مطمحِ نظر بخوبی سمجھتا ہوں اور مجھے اس مسئلے کا سلجھنا آئندہ نزدیک میں ممکن نظر نہیں آتا کیونکہ یہ مسئلہ محض سیاسی اور دفاعی مسئلہ ہونے سے ہٹ کر دونوں ملکوں کے لوگوں کے لیے احساساتی اور قومی مسئلے کے دائرے میں آ گیا ہے اور مسائل جب اسی سطح تک پہنچتے ہیں تو اُنھیں سلجھانا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ لیکن اِس کے باوجود وہاں اپنی زندگی بسر کرنے والے بے چارے اور بے گناہ لوگوں کو دوزخ کی زندگی بسر کروانے کا حق کسی کو نہیں پہنچتا ہے۔ اِس لیے مَیں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مَیں اِس مسئلے کو محض انسانی حقوق کے زاویے سے دیکھتا ہوں اور جس طرح سے بھی ہو اس مسئلے کے خاتمہ کا خواہش مند ہوں۔

☆ گزشتہ دنوں آپ ترکی کے جدید شعراء کے کلام کا ترجمہ کرنے میں مصروف تھے۔ ہمارے قارئین کو اس جانب توجہ کے اسباب اور کیے گئے تراجم کی تفصیل اور احباب کی رائے سے آگاہ فرمایئے؟

☆☆ جی ہاں، یہ میرا ایک پرانا خواب تھا جس کو مکمل کرنے کی فرصت مجھے ملی ہے اور اسے محترم ستیہ پال آنند صاحب اور ضیاء الحسن صاحب کے دیباچوں کے ساتھ لاہور کے ایک ادارہ سانجھ پبلی کیشنز کی وساطت سے شائع کرانا نصیب ہوا۔ اِس میں بھی میرا مقصد ترکی اور اردو زبانوں کے درمیان ایک نیا پُل قائم کرنا تھا جس کے ذریعے دِلوں کے ساتھ ساتھ خیالات اور تصورات کو بھی ایک دوسرے سے زیادہ قریب لانا تھا۔ اِس کتاب میں بیس پچیس کے قریب ترک شعراء کے حالات زندگی اور خیالات کے علاوہ اُن کے شاعری کے نمونوں کا

اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔

☆ اس تاثر میں کہاں تک حقیقت ہے کہ آپ نظم کو مادری زبان میں سوچتے، ترتیب دیتے اور اردو میں منتقل کر دیتے ہیں؟

☆☆ میری شاعری پڑھنے والے اکثر یہ سوچتے ہیں کہ مَیں اپنی زبان مادری زبان میں سوچتا اور ترتیب دیتا ہوں اور پھر اُنہیں اردو میں منتقل کرتا ہوں لیکن میرے خیال میں یہ رائے بہت حد تک صحیح نہیں۔ یہ تو صحیح ہے کہ میری شاعری پر بھی نثر پر بھی اپنی مادری زبان کا اثر بے شک مرتب ہوتا ہوگا لیکن میری شاعری پڑھنے والے اکثر اصحاب میری زبان کی خصوصیات اور اندازِ فکر و بیان نہیں جانتے ہیں۔ اس لیے جو اُن کو میری شاعری میں اجنبی لگتا ہے اُسے میرے ترک ہونے پر حمل کرتے ہیں اگر قارئین اردو ادب کے ساتھ ساتھ ترکی زبان و ادب سے بھی واقف ہوں تو وہ ایسا بالکل نہیں کہیں گے۔ دراصل یہ میری زبان کے اثر سے زیادہ میری اپنے مزاج اور خیالات سے متعلق ہے۔ مَیں دوسروں کے رائج کردہ قواعد پر مستقل عمل کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ اگر بہتے پانی کے سامنے بند بنا کر اسے روکیں گے تو ٹھہراؤ کی وجہ سے اسے کیا ہوگا یہ سب کو معلوم ہے۔ اسی طرح اگر شاعری کو بھی قواعد کی زنجیروں سے باندھیں گے تو اس کی آگے کی طرف پیش قدمی اس زنجیر کی لمبائی تک ہی ہوگی۔ میرے خیال میں پرانے قواعد سے فائدہ حاصل کرتے ہوئے نئے نئے تجربات کرنا شعر و ادب کو نئی وسعتیں دے گا۔ ہاں میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ مَیں اردو ادب کو نئی وسعتیں عطا کرنا چاہتا ہوں۔ اور مجھے علم ہے کہ مَیں اس کے قابل بھی نہیں ہوں لیکن پھر بھی اپنی سی کوشش ہے۔ لہٰذا مَیں اردو میں کچھ لکھتے ہوئے بھی اور اپنی زبان ترکی میں کچھ لکھتے ہوئے بھی ہمیشہ اپنی خواہش کے مطابق لفظوں اور فقروں کے ساتھ کھیلتا ہوں اور لفظوں کو نئے نئے مطالب بھر کر لکھتا ہوں جو عام طور پر مستعمل نہیں ہوتے کیونکہ وہ لفظ یا فقرہ میرے ذہن میں ایک اور طرح کے مطلب کے ساتھ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مَیں جب پانی کی بوند کو دیکھتا ہوں تو مجھے نوعِ انسانی کی تاریخ، انسان کے ازل و ابد یا نوعِ انسان کی پیدائش دکھائی دیتی ہے۔ اور میں اکثر پانی کی بوند کی جگہ ''قطرۂ'' یا ''قطرۂ آب'' کا لفظ استعمال کرتا ہوں۔ یہ اس لیے کرتا ہوں کہ جب میں ''قطرۂ آب'' لکھتا ہوں تو اس ترکیب میں تاریخی پس منظر زیادہ قوی دکھائی دیتا ہے مجھے۔ میرا مطلب، مَیں، اپنے الفاظوں اور تراکیب کے اپنے دل میں پیدا کردہ احساسات کے مطابق لکھتا ہوں، اُن کے اپنی زبان کے مطالب کے مطابق نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ نظم لکھتے وقت عام طور پر یہ کوشش نہیں کرتا ہوں کہ اپنی نظم ضرور شاعری کے عام قواعد و ظوابط کے مطابق ہو۔ کبھی کبھار مَیں بغیر قافیہ کے ردیف والی غزلیں لکھتا ہوں۔ مجھے یہ معلوم ہے بالخصوص کلاسیکل شاعری میں غزل بغیر قافیہ کے نہیں ہوتی لیکن مَیں اپنے احساسات کی آوارہ گردی کو روک نہیں پاتا ہوں شاید روکنا بھی نہیں چاہتا ہوں۔

☆ ناظم حکمت سے نظریاتی اختلاف کے باوجود آپ کے ہاں اُن کے اثرات واضح طور پر نمایاں کیوں دکھائی دیتے ہیں؟

☆☆ ناظم حکمت کے افکار و خیالات جو بھی ہوں اُن کا شمار ترکی زبان کے بہترین شاعروں میں ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہئے کیونکہ اُن کی بلینک ورس میں قلمبند کی ہوئی ایسی عمدہ اور پُر اثر نظمیں ہیں جنھیں میں بہت ساری غزلوں یا یوں کہہ لیجئے پابند شاعری کے نمونوں پر ترجیح دیتا ہوں کیونکہ اُن میں بے شمار میرے ہم خیال شاعروں سے کہیں زیادہ حق گوئی، بے باکی اور سچائی پائی جاتی ہے۔ میری ایک خصوصیت یہ ہے کہ مَیں روزمرہ کی زندگی کے تعلقات سے لے کر ادب کی ہر صنف ادب تک میں مذہب، فکری یا نظریاتی اختلافات کو نظر انداز کر کے صرف اور صرف ادب پارہ کی عمدگی اور خوبصورتی کو دیکھتا ہوں اور ایسے ادب پاروں سے بلا جھجک اثر بھی قبول کر لیتا ہوں۔ اور اِس کو معیوب بھی نہیں سمجھتا ہوں۔ ناظم حکمت میرے ٹاپ شاعروں میں ہیں۔ کاش مَیں بھی اُن کی طرح بلند پایہ اور خوبصورت نظمیں، بلینک ورس ہی میں سہی، لکھ سکتا۔

☆ اردو شاعری کی جان ابتداء سے غزل میں اٹکی ہوئی ہے مگر آپ اس کے اسیر دکھلائی نہیں دیتے؟

☆☆ مَیں اِس سلسلے میں کچھ زیادہ بات نہیں کرتا ہوں کیونکہ اکثر لوگ مجھ سے ناراض ہو جاتے ہیں کہ مَیں غزل کے خلاف انگلی اُٹھاتا ہوں لیکن بات بالکل اس کے برعکس ہے۔ درحقیقت مَیں غزل کے خلاف نہیں ہوں۔ کلاسیکل ترکی ادب کے فضولی، نفعی، ندیم اور شیخ الاسلام یحیٰ جیسے شعرا کی اور اردو ادب میں میر تقی میر، غالب، مومن اور ذوق کی غزلیں مجھے بہت پسند ہیں اور مَیں انھیں بار بار اور لطف اندوز ہو کر پڑھتا ہوں اور سنتا ہوں لیکن اگر کوئی میری مانند دماغ کا مالک ہو جسے اپنی پڑھی ہوئی چیزیں یاد رہتی ہوں اور جب اردو غزل پڑھتے ہوئے مسلسل صدیوں سے مستعمل الفاظ اور تراکیب انھیں اُسی رنگ ڈھنگ میں حال میں بھی نظر آئیں تو اُس اجنبی کے ذہن میں کس طرح کے خیالات جنم لیں گے وہ آپ ہی سوچ لیجئے۔ مَیں یہ مانتا ہوں کہ غزل بہت ہی خوبصورت اور عمدہ صنفِ سخن ہے اور اِس صنف میں آج کے زمانے میں بھی اچھے اچھے شاعر ہیں لیکن جس طرح اردو ادب میں غزل گوئی کی طرح رغبت ہے اُسی طرح آزاد نظم اور بلینک ورس کی طرف رغبت ہو تو اردو شاعری کی عالمی شہرت دوبالا ہوگی۔ اردو غزل پڑھتے ہوئے کبھی کبھار ایسے عمدہ خیالات دکھائی دیتے ہیں جنھیں غزل کی جکڑ بندیوں کے نذر کیا گیا ہوتا ہے۔

☆ اردو ادب کی کونسی صنف آپ کے خیال میں زیادہ طاقتور اور توانا ہے اور اُس کے پنپنے کے مزید امکانات کس قدر ہیں اور کیا عالمی ادب تک بھی اس کی دستک سنائی دے سکتی ہے؟

☆☆ میرے خیال میں یہ صنف ادب افسانہ نگاری ہے۔ کیونکہ اس صنف

ادب کے پس منظر میں صدیوں پر مشتمل قصہ گوئی کا رواج بھی ہے اور اِس پر جدید مغربی افسانہ کے گہرے اثرات بھی مرتب ہوئے ہیں اس لیے اردو افسانہ بہتے ہوئے دریا کی طرح نظر آتا ہے روکا ہوا پانی نہیں۔ یہ اردو افسانہ کے لیے خوش قسمتی کی بات ہے اور اردو افسانہ نگار اگر بحثِ ان دونوں سرچشموں سے فیض یاب ہو کر آگے چلیں گے تو عالمی ادب میں اُن کی آواز کی گونج زیادہ سنائی دے گی۔

☆ بہت سے احباب آپ کو ناقدین کی صف میں بھی شمار کیا کرتے ہیں۔ آج کی نشست میں آپ ہمیں اپنے تنقیدی نظریے اور خدمات کی بابت بھی آگاہ کیجیے؟

☆☆ اس سلسلے میں مَیں یہ کہہ سکتا ہوں کہ تنقید دو قسم کی ہوتی ہے: اوّل تعمیری تنقید اور دوّم مسماری تنقید اور مَیں تعمیری تنقید یعنی مثبت تنقید کا قائل ہوں۔ مَیں سوچتا ہوں کسی کو بھی ہمت نہیں ہارانا چاہئے خواہ اس کی تخلیقات اور خیالات ہمارے معیار پر پورے کیوں نہ اترتے ہوں۔ مَیں سوچتا ہوں کہ مثبت اور تعمیری تنقید کے ذریعے شاعری اور ادب کو ترقی دی جاسکتی ہے منفی اور نفرت پیدا کرنے والی تنقید کے ذریعے نہیں۔

☆ ترکی میں اردو کی ترقی اور ترویج کی رفتار کیا ہے اور مستقبل میں ہم اس سے کس طرح کی اُمید باندھ سکتے ہیں نیز یہ کہ اردو کے علاوہ ترک نوجوانوں میں کس زبان کو سیکھنے کا اشتیاق زیادہ پایا جاتا ہے؟

☆☆ مجموعی طور پر اگر ان پر بحث کریں تو یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ترکی میں اردو سیکھنے کی ایک اہم وجہ برصغیر کے لوگوں کے ساتھ ترکوں کے دلی روابط ہیں۔ صدیوں سے برقرار دوستی اور برادری کے احساسات دن بہ دن کم ہونے کے باوجود اب تک ہمارے دلوں میں بسے ہوئے ہیں اور بعض طالبعلم بس اسی بناء پر ہی اردو سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری وجہ ترکی میں یونیورسٹی میں داخلے کے امتحانات کا نظام ہے۔ اس نظام کے مطابق طالبعلم ہائی اسکول کے جس شعبے سے فارغ التحصیل ہوں اسی شعبے کے مطابق ان کو یونیورسٹی میں داخلہ ملتا ہے۔ اور امتحانوں سے اخذ کیے گئے نمبروں کے مطابق وہ مختلف شعبوں میں جاتے ہیں اور یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ اردو میں داخلے کے لیے ضروری نمبروں کی نسبت دوسری زبانوں سے کم ہے۔ دراصل یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ داخلے کے امتحان میں اردو کے لیے ضروری نمبر کم ہیں ورنہ ہمارے طالبعلموں کی تعداد آج سے بھی بہت کم ہوتی۔ یہ دو مثبت پہلو ہیں جو ترکی میں اردو کی تعلیم میں محرک ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے منفی پہلو بھی ہیں جو ترکی میں اردو تعلیم کے سامنے رکاوٹ پیدا کردیتے ہیں۔ طالبعلم اپنے مستقبل کے لیے یونیورسٹیوں میں آتے ہیں۔ اور اردو زبان سیکھ کر ان کا جو مستقبل بننا ہے وہ ذرا مشکوک ہے۔ کیونکہ برصغیر کے انگریزی کے دل دادہ لوگ انگریزی دانی میں اتنے مست ہوگئے ہیں کہ ان کو آگے پیچھے کا کچھ خیال ہی نہیں رہا ہے۔ اگر کسی زبان کے بولنے والے اپنے ملک میں اپنی قومی زبان کو چھوڑ کر تجارت سے لے کر سیاست تک اپنے تمام کام کسی غیر زبان میں کرنے لگیں گے تو دوسروں کے ہاں ان کی زبان کے احترام کی گنجائش رہتی ہے کہ نہیں؟ اور ایک ایسی زبان کو اجنبی سیکھنا چاہیں گے کہ نہیں؟ پھر بھی اس کے باوجود کچھ طالبعلم اپنا شوق لے کر آتے ہیں اور اردو سیکھنے لگتے ہیں تو ان کے سامنے اردو دانوں کی سخت مخالفت کھڑی ہوجاتی ہے۔ یقین کیجئے میرے طالبعلموں کے ساتھ یہ واقعہ بھی ہوا ہے کہ وہ کسی سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے پاکستان کے معتبر ادارے کے افسر کے پاس گئے تو ان سے یہ کہا گیا ''آپ لوگوں کے پاس عقل کی کمی ہے کہ اردو سیکھتے ہیں اردو سیکھ کر کیا کریں گے، انگریزی سیکھیں کسی اور زبان کی ضرورت نہیں!'' یہ کہنے والے صاحب کو یہاں تک کا پتہ نہیں کہ اردو سیکھنے کے لیے جو طالبعلم ہمارے پاس آتے ہیں وہ داخلے کے امتحان میں انگریزی، جرمن یا فرانسیسی زبانوں میں سے کسی ایک زبان کے سوالات حل کر کے ہمارے شعبوں میں آتے ہیں۔ یعنی ان کو کسی یورپین زبان کی اچھی خاصی دسترس ہوتی ہے۔ یہ ایک منفی پہلو ہے۔ دوسرا منفی پہلو یہ ہے کہ دوستی اور قلبی ارتباط کے باوجود ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ اردو ترکی کا لفظ ہونے کے باوجود کسی مشخص ملک سے عنوانی تعلق قائم نہ رکھنے کی وجہ سے ذہنوں میں کوئی پہلو اجاگر نہیں کرتی ہے۔ سو ترکوں کے ذہن میں بھی پہلی دفعہ سننے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اردو کونسے ملک کی زبان ہے؟ پھر جس زبان سے لوگ ناشناس ہیں اسی زبان کو سیکھنے کی طرف کم رغبت ہوتی ہے۔ اور ترکی میں اردو زبان وادب سے تعارف نہ کروائے جانے کی وجہ سے بھی اردو سے دلچسپی لینے والوں کی تعداد گھٹی ہے۔

☆ ڈاکٹر صاحب! اردو زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترکی کے علوم وفنون سے موازنہ کیا جائے تو کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں؟

☆☆ دراصل دو زبانوں، ادبوں اور تہذیبوں کے درمیان موازنہ کرنا مجھے مناسب نہیں لگتا۔ میرے خیال میں ہر زبان کی اپنی خاص خوبصورتی، ہر ادب کی اپنی عمدگی اور ہر تہذیب کی اپنی برتری ہوتی ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ان خوبصورتیوں، عمدگیوں اور برتریوں کو دیکھ کر ان کی قدردانی کریں۔

☆ پارسو رسم الخط کی جگہ رومن رسم الخط اختیار کرنے سے ترک قوم کی تہذیب وثقافت پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

☆☆ دراصل اگر معروضی انداز میں اِس تبدیلی کو دیکھا جائے تو اِس کے دو مختلف پہلو نظر آئیں گے۔ ایک مثبت اور دوسرا منفی۔ مثبت پہلو یہ ہے کہ اس لکھائی کے ذریعے خواندگی کی شرح کافی بڑھ گئی ہے کیونکہ ہمارا رسم الخط صوتی بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے اور اس کی وجہ سے تعلیم اطفال میں بہت ساری سہولتیں فراہم ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں دو ڈھائی ماہ میں بچے لکھنا پڑھنا سیکھ لیتے ہیں اور اس طرح سے دوسرے موضوعات کے لیے زیادہ وقت فراہم ہوتا ہے۔ یہ ترقی

کی راہ میں ایک اہم سہولت ہے۔ رسم الخط کی اچانک تبدیلی کا منفی اثر یہ ہوا کہ ہماری پرانی تہذیب اور نئی جنم لینے والی تہذیب کے درمیان کافی فاصلہ بڑھا ہے اور ہماری پہلے والی نسلوں کو ایک طرح کے کلچرل شاک کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ قدیم تہذیب وثقافت اور زبان وادب سے ان کا تعلق ایک حد تک ٹوٹ گیا اور نئی تہذیب کی تشکیل میں مغربی اثرات زیادہ ہونے لگے۔ درحقیقت مصطفیٰ کمال اتاترک کی خواہش یہ تھی کہ تمام پرانی کتابوں کو بہ زودی نئے رسم الخط میں ڈھال دیا جائے اور اس سلسلے میں کوششیں بھی ہوئیں لیکن ان کے انتقال کے بعد یہ کام رک گیا۔ ہاں آخری دس پندرہ سالوں سے یہ رجحان پھر سے شروع ہوا اور اب تیزی سے پرانی کتابوں پر کام ہو رہا ہے اور ٹوٹے ہوئے تعلق کا نئے سرے سے رابطہ قائم کیا جا رہا ہے۔

☆ کمال اتاترک کے نظریات اور اصلاحات سے ترک قوم نے کیا کھویا اور کیا پایا اور مستقبل میں مورخ اُن کے لیے کس طرح کے مقام کا تعین کر سکے گا؟

☆☆ ترکی میں مصطفیٰ کمال اتاترک کو عام طور پر ترکوں کے باپ کہتے ہیں ویسے بھی اتاترک کے معنیٰ بھی ''ترکوں کے جداعلیٰ'' کے ہیں۔ ترکی میں بھی لوگ اُن کے حق میں اور اُن کے خلاف اپنے خیالات پیش کرتے رہتے ہیں لیکن مجھے یہ دیکھ کر بہت زیادہ حیرت بھی ہوتی ہے پریشانی بھی کہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمان بھائیوں میں اُن کے خلاف اِس قدر منفی اور دشمنی کے خیالات کیوں ہیں، یہ مجھے معلوم نہیں۔ میرے نام لکھے گئے کچھ خطوط میں اور مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے کچھ لوگ اِس طرح آگے بڑھتے ہیں کہ اُن کو سمجھنا میرے لیے بالکل ناممکن ہو جاتا ہے۔ ''خبیث کافر''، ''لادین منافق'' اور ''اسلام دشمن'' جیسے نازیب الفاظ جو اُن کے بارے میں بولتے ہیں اور جب میں اِنہیں سنتا ہوں تو میرا توازن اُلٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔ میں اُن کا ذاتی وکیل نہیں ہوں لیکن آخر وہ تو ہمارے لیڈر تھے اور بزرگ تھے اور اُنھوں نے جو بھی کیا ہمارے ساتھ کیا، آپ لوگوں کا تو کچھ بگاڑا نہیں۔ ایک خلافت کی منسوخی کی بات ہے جو ہمارا مشترکہ مسئلہ تھا اور وہ اِس سے ناراض ہونے کا قدرتی حق بھی رکھتے ہیں۔ کیونکہ تحریکِ خلافت کے سلسلے میں پاک و ہند میں جو قربانیاں دی گئی تھیں اُس کے بعد خلافت کی منسوخی اِس خطے کے مسلمانوں کے لیے ناقابل قبول تھی، لیکن پھر بھی یہ ناراضگی اُنھیں یہ حق نہیں دیتی ہے کہ وہ ایسے الفاظ استعمال کریں۔ اور خلافت سے متعلق بات کرتے ہوئے اُس دَور میں خلافت کا مقام اور اُس کی اہمیت کو ذرا زیرِ مطالعہ رکھنا چاہیے۔ آپ سوچیے کہ ایک مقام جس کی اہمیت صرف ترک اور پاک و ہند کی نظر میں باقی تھی اور باقی مسلمانانِ جس کو کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے اور اِس مقام کے خلاف عیسائی طاقتوں سے ملکر بغاوت کر رہے تھے اس مقام کو برقرار رکھنے میں کیا حکمت عملی یا جواز قائم کیا جا سکتا ہے وہ سوالیہ نشان کی طرح ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ مزید برآں ہمیں بچپن سے یہ سکھایا گیا ہے کہ جبکہ کوئی شخص کھلے عام اپنے کفر کا اعلان نہ کرے جس کا برتاؤ جو بھی ہو وہ مسلمان ہے اور اُس کو کافر کہنے سے گریز کرنا چاہیئے کیونکہ آخری سانس میں کون مومن اور کون کافر بن کر جائے گا اُس کا کسی کو علم نہیں۔ خیر آپ نے کیا سوال کیا تھا اور مَیں کیا باتیں کرنے لگا ہوں۔ لیکن آپ کے سوال نے میرے دل میں جو خلش تھی اُسے ظاہر کر دیا۔ کمال اتاترک اپنے زمانے کے اہم ترین قائدوں میں سے تھے۔ اُنھوں نے اپنی بکھری ہوئی، شکست کھائی اور تھکی ہاری قوم کو پھر سے منظم کر کے دنیا کی سب سے بڑی طاقتوں جن میں اُس وقت کے سوپر پاور برطانیہ، فرانس، اٹلی بھی شامل تھے، کے سامنے کھڑا کر دیا اور اُنھیں ہرا کر اپنے ملک اور اپنی قوم کو پھر آزاد کرا دیا۔ اس کے علاوہ اُن کی خواہش یہ تھی کہ اپنے نظریات و اصلاحات کے ساتھ اپنی قوم کو مغرب کی ترقی یافتہ دنیا کے ہم پلہ کریں۔ اُن کی یہ خواہش کس قدر کامیاب رہی اُس کو آج کے ترکی کو مدنظر رکھ کر بتایا جا سکتا ہے۔ اگر آج کا ترکی کامیاب ہے تو اِس کامیابی کی بنیاد میں اُن کے نظریات اور اصلاحات ہیں اور اگر ترکی ناکام ہے تو اِس کی بنیاد میں اُنہی کے نظریات اور اصلاحات موجود ہیں۔ اِس کا فیصلہ آپ ہی لوگوں کو ترکی کو دیکھ کر کرنا ہوگا۔ میں ترک ہوں اور اپنے قائد، ملک اور قوم کے بارے میں جو بھی کہوں اُس میں کچھ نہ کچھ طرفداری کی مہک موجود ہوگی۔ بات ذرا لمبی ہو جائے گی لیکن علامہ سید سلیمان ندوی کی ایک تحریر جسے اُنھوں نے اتاترک کی وفات پر قلمبند کیا تھا اُس کو یہاں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ تحریر کچھ یوں ہے:

> ''آخر اُس عیسیٰ نفس کو بھی موت آ گئی جس نے بیمار ترکی کو شفا اور اُس کو موت کے پنجہ سے چھڑا کر زندگی بخشی تھی۔ دنیا نے اُس کا ماتم کیا اور عجیب تر یہ ہے کہ اُنھوں نے بھی اس کا ماتم کیا جنھوں نے اس کو تختۂ دار پر چڑھانے میں کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھی تھی، لیکن اس کی تلوار نے ہر بیڑی کو کاٹا اور ہر زنجیر کو ٹکڑے کئے اور پرانی ترکی کو جلا کر اس کی راکھ سے ایک نئی ترکی کی بنا کھڑی کی، ۱۹۲۰ء میں کون خیال کر سکتا تھا کہ اتحادیوں کے پنجۂ ستم سے بچ کر یہ شکار صحیح وسلامت نکل آئے گا۔ مگر اس کی تدبیروں نے آخر ہر تدبیر کو شکست دی، ڈاکٹر اقبال نے سچ کہا:
>
> قاہری با دلیری پیغمبری ست
>
> ایسا سیاسی پیغمبر اگر کوئی ہوا ہے تو مصطفیٰ کمال اتاترک تھا، جو تاج وتخت، خدم وحشم، باڈی گارڈ اور محافظوں کے دستہ کے بغیر ملک پر حکمرانی کرتا تھا، اس نے اسلام کے اس سیاسی رنگ کا دھندلا سا منظر پیش کیا تھا جس کے دیکھنے کو خلافتِ راشدہ کے بعد سے مسلمانوں کی آنکھیں بے تاب تھیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ

مرحوم کو اپنی مغفرت و رحمت کے فتوحات سے سرفراز فرمائے اور ان کی اجتہادی غلطیوں سے درگزر کرے۔''

دیکھئے سید سلیمان ندوی جیسے ایک بلند پایہ عالم نے اپنے اختلافی پہلو کو بھی پیش کرنے کے باوجود اُن کے بارے میں کتنی عمدہ باتیں لکھی ہیں۔ دیکھئے اُن کے اور آج کل کے پاک و ہند کے کچھ خاص لوگوں کے برتاؤ کا فرق!

☆ خلافت تحریک کی بابت ترک قوم کا نظریہ اور سوچ آج کس رُخ کی نشاندہی کر رہا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ آپ اپنے احساسات بھی بیان فرمایئے؟

☆☆ اس تحریک اور اس تحریک کے دوران برصغیر پاک و ہند کے لوگوں کی قربانیوں کو ترکی میں بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور خیر سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور جس طرح مَیں نے پہلے بھی بتایا تھا اس تحریک کی یادیں ہمارے بچپن ہی سے ہمیں ذہن نشین کروائی جاتی ہیں۔ اس کے ردعمل کی ایک چھوٹی سی مثال یہاں پیش کرنا چاہوں گا جسے پاکستان کے سفیر صاحب نے ایک اجلاس کے دوران پُرنم آنکھوں کے ساتھ بیان کیا تھا۔ وہ یہ کہ جب پاکستان میں زلزلہ ہوا تو ترکی میں اسکول کے معصوم بچوں سمیت لوگ اُن کو بے تحاشا مدد بھیجنے لگے اور بچے اپنے جیب خرچ جمع کر کے ان کو بھیج رہے تھے۔ ایک چھوٹی سی بچی جن سے سفیر صاحب کی ملاقات بھی ہوئی تھی، اپنے چھوٹے موٹے زیورات لے کر آئی اور اُس نے ان سے کہا کہ ہماری قوم کے مشکل اوقات میں آپ لوگوں نے ہماری مدد کی تھی اور اب ترک بھائیوں کی باری آئی ہے کہ اپنے پاکستانی بھائیوں کی مدد کریں۔

☆ طوق اُر صاحب! برصغیر میں یہ تاثر عام ہے کہ ترک قوم یہاں کے مسلمانوں کو خلافت تحریک کا ساتھ دینے کے باعث زیادہ محبت کا حقدار ٹھہراتی ہے مگر ہندوستان کے مسلمان اس بات کے شاکی ہیں کہ ترکوں کی محبت پاکستان کی سرحد ختم ہونے کے ساتھ ہی کم ہونے لگتی ہے؟

☆☆ جی ہاں، اس سلسلے میں ہمارے ہندوستانی بھائی بالکل حق بجانب ہیں۔ در اصل یہ ہمارے لوگوں کی لاعلمی کی وجہ سے ہے اور ساتھ ساتھ ترک، ہندوستانی تعلقات کا اس قدر گہرا نہ ہونے کی وجہ سے ہے جتنا کہ ہونے چاہئیں۔ ہمارے ہاں اکثر لوگ یہ سوچتے ہیں کہ بٹوارے کے بعد تمام مسلمان پاکستان میں کوچ کر کے آئے جو مشکل میں ہماری مدد کر رہے تھے۔ اس لیے محبت کا جائزہ پاکستانی بھائی لے گئے ہیں اور ہندوستانی بھائیوں کو ان کا حق نہیں ملا۔

☆ عربی اور عربوں سے ترک قوم کے فاصلے پہلے کی نسبت کسی قدر کم ہو سکے ہیں کہ نہیں نیز مستقبل میں کس طرح کے رجحانات کا امکان ہے؟

☆☆ آج کل تو ترکی اور عرب ممالک کے ساتھ ہمارے تعلقات میں بہار کا موسم آ گیا ہے۔ بالخصوص ہمارے وزیر اعظم رجب طیب اردوغان کی فلسطین کے حق میں جو کوششیں ہو رہی ہیں ان کے عربوں پر بہت مثبت اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ اب دمشق۔ ترکی اور اردن۔ ترکی کے درمیان ویزا اُٹھایا گیا ہے اور عرب ملکوں میں انگریزی پروپیگنڈے کے زیر اثر ترکوں اور عثمانیوں کے خلاف کتابوں میں جو منفی باتیں تھیں ان باتوں کو کتابوں سے حذف کیا جا رہا ہے۔ اور ترکی میں عربی کے خلاف تو اب کوئی منفی رویہ نہیں ہے۔ تقریباً ترکی کے تمام ادبیات اور الاہیات فیکلٹیوں میں عربی کے شعبہ جات موجود ہیں اور ان کے علاوہ مذہبی تعلیم دینے والے ہائی اسکولوں اور مساجد کی درسگاہوں میں عربی پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ترکی میں قرآن مجید کے لاتعداد نفیس نسخے شائع کئے جاتے ہیں اور عربی زبان میں اسلامیات سے متعلق بے شمار کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں۔

☆ ایک زمانے میں ترک قوم مغرب کا حصہ بننے کے لیے بڑی بے چین و بے قرار تھی۔ آج کی صورت حال کیا ہے اور آپ کے خیال میں اس تصور کا حقیقی پس منظر کیا تھا یا کیا ہونا چاہیے؟

☆☆ آج بھی ترک قوم مغرب کا حصہ بننا چاہتی ہے لیکن اب اس رجحان میں پہلے جیسی بے قراری نہیں ہے اور اب ترکی کی خواہش یہ ہے کہ ہر کام میں برابری اور توازن قائم رہے۔ کیونکہ اب ترکی اور یورپ کے تعلقات لین دین کی سطح پر آ گئے ہیں جو پہلے بس امدادی کارروائیوں پر مبنی تھے۔ ہم مغرب کی نکتہ چینی کر بھی لیں لیکن ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا چاہئے کہ وہ لوگ کم از کم اپنے لوگوں کے لیے بہتر سے بہتر کا حصول کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور انسانی حقوق کی برتری کو اپنے ملکوں کی حد تک سہی قائم رکھتے ہیں۔ اور یہ تو فطری بات ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم اپنی بہتری کی خواہاں ہے۔ اور ہم سب کو یہ ماننا پڑے گا کہ اپنی سرحد کے اندر ہی سہی اکثر ترقیاتی خوبیوں کا مرکز مغرب ہے۔ اس لیے ترکی اپنے اقدار پر قائم رہ کر ان ترقیات سے اپنا حق حاصل کرنا چاہتا ہے۔

☆ برادرِ محترم طوق اُر صاحب! گلوبلائزیشن کے ہنگام میں مشرقی اقوام، اُن کے علوم و فنون بلخصوص پاکستان اور اردو زبان و ادب کے لیے کیا خطرات پنہاں ہیں اور اُن سے بچاؤ کی آپ کے ذہن میں کیا تدابیر ہیں؟

☆☆ یہ موضوع میرے دل میں خلش کی صورت اختیار کر گیا ہے کہ گلوبلائزیشن کے تحت دنیا کی مغربی قوموں کے سوا تمام عالم کی قوموں سے یہ انتظار کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی زبان و قومی شناخت ترک کر دیں اور اس گلوبلائزڈ ویلیج کے سیکنڈ کلاس کا حصہ بنیں۔ باوقار قومیں اپنی زبانوں اور اپنی تہذیبوں کے ساتھ قائم ہیں وگرنہ تو ان کا خدا حافظ۔ پاکستان اور اردو کے لیے صرف یہ کہنا چاہوں گا کہ پاکستانیوں سے اردو بولنے والوں کو چاہئے کہ اپنے ملک سے اپنی زبان سے اور اپنی تہذیب و ثقافت سے محبت کریں اور ان پر یقین رکھیں۔ کیونکہ محبت اور مکمل یقین کے ساتھ تمام مسائل کا حل ہو جاتا ہے۔

''حاجی بیرام ولی''

(ایک ترک صوفی بزرگ)

ڈاکٹر خلیل طوق اَر

حاجی بیرام ولی، ترکی کے وہ معروف ولی اللہ اور شاعر ہیں جنہوں نے استنبول کے سلطان محمد فاتح کے ہاتھوں فتح ہونے کی خوشخبری ان کے والد سلطان مراد ثانی کو سنائی اور ایک تصوفی سلسلہ ''بیرامیہ'' کو قائم کیا۔ دیگر خصوصیاتِ محسنہ کے علاوہ ان کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ وہ اناطولیہ میں پیدا ہوکر ایک طریقت قائم کرنے والے پہلے ترک بزرگ تھے جن سے قبل اناطولیہ میں کسی بھی ترک بزرگ نے کوئی طریقت قائم نہیں کی تھی۔

ان کے سلسلۂ نسب اور زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات دریافت کئے گئے ہیں یہاں تک کہ ان کا اصلی نام کیا تھا وہ بھی قطعی طور پر معلوم نہیں کیا جاسکا ہے۔اس سلسلے میں مشہور محقق محمد طاہر بورسوی رقمطراز ہیں کہ عبدالقادر بن یوسف الاصفہانی کے وقف کے دستاوزات (۸۳۲ھ بمطابق ۲۹۔۱۴۲۹ء) پر مرقوم حاجی بیرام کا نام ہے ''قطب الاولیاء الشیخ الحاج بیرام بن احمد بن محمود الانقروی''۔ مستزاد برآں احمد چلپی، ابن محمد چلپی، مجدالدین عبدالحق بن احمد اور قاضی جلال الدین نامی اشخاص کے قائم کردہ وقف کے دستاوزات پر بھی گواہ کی حیثیت سے ان کا نام اور کنیت مندرج ہے جو کہ ''قدوت السالکین قطب الاولیاء والعارفین الحادی الی طریق الحق والیقین واقف الاسرار الواصلین حاجی بیرام بن احمد بن محمود...'' ہے۔ان دونوں مآخذ سے یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ ان کے والد کا نام ''احمد'' اور دادا کا نام ''محمود'' ہے۔اسماعیل حقی برسوی کی تالیف ''سلسلۂ جلوتیہ'' میں حاجی بیرام کے والد کا نام ''قویونلوجہ احمد'' لکھا گیا ہے اور اس تصنیف میں ان کے دو بھائی صفی الدین اور ابدل مراد کے نام بھی مذکور ہیں۔

ان کی تاریخ پیدائش سے متعلق مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔محمد علی عینی اپنی تصنیف ''حاجی بیرام ولی'' میں محمد طاہر بورسوی اور مجدی نامی محققوں کی کتابوں کے حوالے دے کر ان کی تاریخ پیدائش ۷۵۳ھ بمطابق ۱۳۵۲ء بتاتے ہیں لیکن نہاد عظمت کا کہنا ہے کہ دونوں محققوں کی تصانیف میں ایسی کوئی معلومات واقع نہیں۔اس لئے اس تاریخ کو شبہ کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے۔وہ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ فواد بیرام اوغلو جو کہ ان کی نسب سے ہیں، کا کہنا ہے کہ حاجی بیرام کی نسب سے آنے والوں میں یہ روایت عام ہے کہ وہ نوے (۹۰) سال سے زائد عمر پاکر انتقال کرگئے ہیں۔عبداللہ العسکری کی تصنیف ''مرآت العشق'' (سن تصنیف ۹۵۷ھ بمطابق ۱۵۵۰ء) میں بھی ان کے نوے سے زائد عمر پاکر وفات پانے کا ذکر آیا ہے جس سے فواد بیرام اوغلو کی رائے کی تائید ہوتی ہے جس کے مطابق حاجی بیرام ولی کی تاریخ پیدائش تقریباً ۷۰۴ھ بمطابق ۴۰۔۱۳۳۹ء بتائی جاسکتی ہے۔

''اگر آپ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ نوع بشر کے فتنوں سے بچے رہیں تو دکانوں اور بازاروں میں آنا جانا کم کریں!''

''اللہ تعالیٰ کی راہ سے روگردانی کرکے باغی بننے والا جو بھی ہو کسی طرح سے بھی اس کی مدد نہ کریں!''

''بچوں سے پیار کریں اور ان کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیریں۔ان کو خوش رکھیں تاکہ نبی پاک ﷺ کے حکم کی تعمیل ہوجائے!''

''بہت زیادہ نہ ہنسیں تاکہ آپ کا دل کالا نہ ہوجائے۔سکون اور سنجیدگی سے جئیں تاکہ آپ کا وقار قائم رہے!''

''کسی بھی گناہ کو چھوٹا نہ سمجھیں۔بہت محنت کریں کیونکہ جو شخص کام و محنت سے دور رہتا ہے، شیطان ضرور اس شخص کا دوست بنتا ہے اور اس کا دل شیطان کا گھر بن جاتا ہے۔چاہے وہ شخص امیر ہو!''

''موت کو ہمیشہ یاد کیا کریں اور موت کے آنے سے قبل اپنا حساب کتاب خود کریں۔توبہ کیا کریں تاکہ آپ کی معافی ہوجائے!''

''اپنے نفسِ امارہ پر سخت قابو رکھیں۔اس کو ایک پل بھی خالی نہ گزارنے دیں تاکہ آپ کو دوزخ کی آگ میں گھسیٹ کر نہ لے جائے!''

''اگر دنیا کے غم اور نفس امارہ کے تنگ کرنے سے نجات حاصل کرنا مطلوب ہو تو بار بار قبروں کی زیارت کریں!''

''علماء اور اولیاء اللہ کی قبروں کی زیارت کیا کریں کیونکہ وہ اپنی قبروں کی زیارت کرنے والوں کے لیے شفاعت کی دعا کیا کرتے ہیں!''

''جب کسی دوست یا ہمسایے کی کوئی بری حرکت یا قصور دیکھیں تو اس کا ذکر کسی اور سے نہ کریں۔کیونکہ آپ کے دیکھے ہوئے بھید آپ کے پاس امانت ہیں۔اور امانت کے ساتھ خیانت کرنا ہرگز اچھی بات نہیں!''

کیا ہوا یہ دل، کیا ہوا یہ دل؟
درد وغم سے بھر گیا یہ دل
جل گیا یہ دل، جل گیا یہ دل
جلنے سے شفاء پا گیا یہ دل

☆☆☆

جل اے دل میرے، جل اے دل میرے!
مل گیا درمان جلنے سے تیرے
پروانہ جیسے، پروانہ جیسے
آتشِ عشق سے جل گیا یہ دل

قولِ فخرالعالمین ہے یہ فرمانِ نبی:
''الفقرُ فخری، الفقرُ فخری''
نازِ فقر اور فخرِ غریبی
محو و فناء میں پا گیا یہ دل

☆☆☆

سوادِ اعظم، سوادِ اعظم
شاید ملے مجھے عرشِ معظّم
مطلبِ جاناں، مطلبِ جاناں
کیا بن بھی جائے یہ میرا دل؟

☆☆☆

عید ہے فی الحال، عید ہے فی الحال
کیونکہ عید ہے یار کے ساتھ فی الحال
حمد و ثناء ہو ہزار بار فی الحال
یارِ حقیقی سے مل گیا یہ دل!

حوالہ جات:

1- Abdulkadir Karahan, Fuzulî-Muhiti, Hayati ve Sahsiyeti, Ankara 1989. p. 69.
2- Ibid, pp. 71-72.
3- Abdukadir Karahan, "Fuzulî", Türkiye Diyanet Vakfi Islâm Ansiklopedisi, volume XIII, p.241.
4- Ibid.
5- Fuzulî-Muhiti, Hayati ve Sahsiyeti, p. 76.
6- Ibid, p. 74.
7- Fuzulî-Muhiti, Hayati ve Sahsiyeti, p. 79-108.
8- Ibid, p. 91.
9- Fuzulî-Muhiti, Hayati ve Sahsiyeti, p. 87.

☆

○

مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ پاکستان کا مؤقر ادبی جریدہ ''چہارسُو'' ہمارے ہر دلعزیز دوست، ادیب، شاعر، ماہر تعلیم **پروفیسر خلیل طوق آر** کی شخصیت و فن کی نسبت خصوصی اشاعت منظرِ عام پر لا رہا ہے۔ ڈاکٹر خلیل طوق آر کی اردو زبان کے لیے خدمات برادر ملک پاکستان اور ترکی کے مابین پُل کا کام دے رہی ہے۔ ایک ایسا پُل جو محبت اور رواداری کی بنیادوں پر استوار ہے۔ ''چہارسُو'' کی یہ کاوش دونوں برادر ممالک کے درمیان اخوت اور بھائی چارے کو فروغ دے گی۔

پروفیسر ڈاکٹر اے یاسر کوکیک
صدر شعبہ اورٹل ریسرچ سینٹر
استنبول یونیورسٹی
ترکی

○

اہل ترک بالخصوص استنبول یونیورسٹی کے طلباء اور اساتذہ کے لیے یہ امر باعث صد مسرت ہے کہ ہمارے ادارے کے نہایت ہونہار اور جفاکش ماہر تعلیم، صاحبِ ذوق اور صاحبِ قلم **ڈاکٹر خلیل طوق آر** کی شخصیت و فن کو برادر ملک پاکستان کا نامور ادبی جریدہ ''چہارسُو'' صوری و معنوی طور پر مربوط انداز میں پیش کر رہا ہے۔ ''چہارسُو'' کی یہ کاوش نہ صرف ادبی حلقوں بلکہ دونوں ممالک کے درمیان پہلے سے موجود محبت و اپنائیت کے رشتے کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں اہم کردار ادا کرے گی۔

پروفیسر ڈاکٹر کورکت ٹونا
ڈین آف فیکلٹی آف لیٹرز
استنبول یونیورسٹی
ترکی

خلیل طوق اَرکافن

ڈاکٹر ستیہ پال آنند
(یو۔ایس۔اے)

آج اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں شاید یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ فی زمانہ ساری دنیا کے لوگوں کا لسانی تشخص کسی ایک زبان پر قائم نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر شخص کی مادری زبان وہی ہے جس کو وہ شیر مادر کی شیرینی کے امتزاج سے اپنے پہلے تو تلے الفاظ میں ادا کرتا ہے۔ لیکن ہر بچہ بڑا ہوتا ہے اور اس گلوبل ولیج میں ہر بچے کو بڑا ہونے کے بعد ان دیگر 'بڑے بچوں' سے سابقہ پڑتا ہے جو اس کی طرح ہی اپنی مادری زبان میں تتلانا سیکھے تھے۔ اس لیے لگ بھگ ہر ترقی یافتہ یا ترقی پذیر ملک میں کوئی ایک صدی پہلے سے ہی ذولسانی سسٹم رائج ہے جس میں ابتدائی تعلیم کے مادری زبان میں پورا کر چکنے کے بعد بچے کو دوسری زبان سیکھنی پڑتی ہے۔ نئی صدی کے طلوع ہونے کے بعد اور اقتصادی، معاشرتی اور تہذیبی سطحوں پر کرہِ ارض کے سکڑنے کے بعد اب یہ بات باور کر لینے میں کوئی ہرج نہیں کہ ذولسانی سسٹم کی خود مکتفیت ناقابلِ اعتبار ہے اور اب ایک تیسری زبان کی بھی ضرورت ہے جو باہر کے ملکوں کے ساتھ تعلقات کا راستہ ہموار کرے۔ برصغیر میں اس کا علاج آسان تھا۔ کیونکہ دونوں ملکوں کے مختلف حصوں میں مادری زبانیں اور رابطے کی زبان ایک نہیں تھیں۔ اس لیے انگریزی کو ان کے ساتھ ملا کر سہ لسانی فارمولے کی تشکیل کی گئی۔ حسن اتفاق سے یورپ کی دیگر زبانوں کے برعکس، بین الاقوامی زبان کا رتبہ حاصل کرنے میں انگریزی زیادہ خود کفیل تھی۔ اسی لیے برصغیر کے سہ لسانی تعلیمی سسٹم کے گریجویٹ یورپ یا امریکا میں زیادہ کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ ترکی ایشیا اور یورپ کے دوراہے پر کھڑا ہے۔ اس زمینی اور جغرافیائی خصوصیت کے علاوہ زمانی اور تاریخی سطحوں پر بھی وہ اس اہمیت کا حامل ہے، جس کا موازنہ کسی اور مشرقی ملک سے نہیں کیا جا سکتا۔ ترکی کے رہنماؤں کو اپنے ملک کی تاریخی اور جغرافیائی حوالوں سے اہمیت کا احساس اور اس احساس سے پیدا شدہ لسانی تحصیل اور اتلاف دونوں سے پیدا شدہ صورتحال کی دورنگی، پہلی جنگ عظیم کے بعد شدت سے اس وقت محسوس ہوئی جب یورپ کی اقوام نے ترکی کو اس کے ماضی سے لاتعلق کرنے کی کوشش کی۔ عثمانی شہنشایت کو 1919ء میں ختم کر دیا گیا اور ترکی کا جمہوری نظام جو معرض وجود میں آیا، اسے کامیاب کرنے اور یورپ کی قدم زن ترقی کے ساتھ برابری کے رتبے پر انسلاک کرنے کے لیے کمال اتاترک نے یہ ضروری محسوس کیا کہ *Osmanlica* or *Osmanli Turkcesi* ''لسان عثمانی'' جو اس وقت تک انتظامیہ اور عدلیہ کی زبان تھی، اور ترکی کے زیر سایہ سبھی مسلم ملکوں کی ادبی، ثقافتی اور باہم رابطے کی زبان بھی بن چکی تھی، کو Parso-Arabic script کی جگہ، ضروری تبدیلیوں کے ساتھ رومن رسم الخط میں لکھا جائے۔ مصطفے کمال اتاترک کی کوشش بارآور ثابت ہوئی اور 1928ء میں جب عربی اور فارسی کے بھاری بھرکم الفاظ کو (جنہیں ناخواندہ اور نیم خواندہ ترکی عوام سمجھ بھی نہیں پاتے تھے) عام بول چال کی ترکی زبان سے بدل دیا گیا تو اسے ایک لسانی انقلاب کا نام دیا گیا۔ جہاں جہاں رومن رسم الخط میں کچھ ردوبدل کی ضرورت پیش آئی وہاں اسے بدل دیا گیا اور اس طرح جو ترمیم شدہ زبان معرض وجود میں آئی، ایک تو وہ ترکی زبان کے روزمرہ سے قریب تھی اور دوسرے رومن رسم الخط سے واقفیت ترکی عوام کے لیے یورپ کے سب ابواب کھول سکتی تھی۔

سہ لسانی سسٹم کی یورپ کے مختلف ملکوں میں ترویج اور اس حوالے سے ترکی کی جامعات میں یورپی زبانوں، خصوصی طور پر انگریزی اور فرانسیسی، اور ایشیائی زبانوں، خصوصی طور پر اردو کی تدریس گذشتہ تین یا چار دہائیوں سے شروع ہوئی اور بہت جلد ہی اس نے کچھ جامعات کی فیکلٹی آف لینگویجز میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا۔ استنبول یونیورسٹی اسی زمرے میں آتی ہے کوئی بیس برس پہلے، سعودی عرب میں اپنے تدریسی فرائض کی انجام دہی کے دوران، اپنی چھٹیاں گذارنے کے لیے میں نے ترکی کا دورہ کیا تھا۔ تب کہیں کہیں، اکا دکا پاکستانی دکھائی پڑتے تھے جن کے ساتھ اردو میں سلام کلام ہو پاتا تھا لیکن اس برس اپریل میں جب میں ایک سیمینار میں شرکت کے لیے استنبول پہنچا تو مطلع زیادہ نکھرا ہوا پایا۔ نہ صرف یہ کہ سہ لسانی سسٹم کے تحت وہاں کی یونیورسٹیاں یورپ اور ایشیا کے درمیان پُل کا کام کرنے کے لیے نوجوان ترکیوں کے تین یا اس بھی زیادہ زبانیں بولنے والے گروہ در گروہ تیار کر رہی ہیں، بلکہ اس کارِ خیر میں اردو کا پلڑہ بھاری ہے۔ اس کی وجہ کچھ تو صدر ضیا الحق کے زمانے میں حکومت پاکستان کی طرف سے دوطرفہ سیاسی، معاشرتی اور تجارتی تعلقات کی پیش رفت ہے (جس کے تحت اردو کے معروف استاد ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار پنجاب یونیوسٹی لاہور سے جامعہ استنبول میں درس وتدریس کے لیے گئے) اور کچھ ترکی نئی نسل کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا ناسٹلجیا ہے، جو Parso-Arabic رسم الخط کو (مذہب کے حوالے سے کم اور مشرقی تہذیب کے حوالے سے زیادہ) اپنانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ ثبوت کے طور پر استنبول یونیورسٹی کا شعبہء اردو ہی دیکھا جا سکتا ہے، جس میں یہ نوجوان (انڈر گریجویٹ سطح پر) اپنے credits کا شمار یہ بڑھانے کے لیے جوق در جوق شامل ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیل طوق آر اسی شعبے کے صدر ہیں۔ نہ صرف یہ کہ اردو خلیل صاحب کی مادری زبان نہیں تھی بلکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کے لڑکپن میں ان کے آس پاس بھی اردو بولنے والا کوئی نہیں تھا۔ خوتغولداق بحر اسود کے کنارے پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس میں وہ پانچ برس کی عمر کے بعد اپنے کنبے کے ساتھ مقیم رہے۔ انہوں نے اسی قصبے کے عام ورنیکولر اسکول سے پرائمری اور مڈل کے امتحانات پاس کیے۔ پھر ہائی اسکول کے لیے ان کے والد نے ٹیکنیکل پڑھائی کو ترجیح دی اور وہ خوتغولداق انجینئرنگ اسکول میں داخل ہوئے۔ چہ آنکہ وہ ہر ایک سیمسٹر میں امتیاز سے کامیاب ہوتے رہے، ان کی خواہش تھی کہ وہ مختلف زبانوں پر اور ادبِ عالیہ پر عبور حاصل کریں اور والدین کی مرضی کے خلاف انہوں نے ہائی اسکول کے بعد یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں داخلہ لیا۔ اس طرح ان کا مدتِ مدید کا یہ خواب پورا ہوا کہ وہ قدیم اور جدید فارسی ادب کا مطالعہ کر سکیں۔ اس دوران میں ایک اور خوشگوار واقعہ پیش آیا جس نے ان کی زندگی اور طبعی افتاد کو جلا بخشی۔ یہ لاہور سے پروفیسر غلام حسین ذوالفقار صاحب کی استنبول یونیورسٹی میں آمد تھی۔ وہ کلچرل ایکسچینج پروگرام کے سلسلے میں پاکستان سے تشریف لائے تھے اور اپنے سہل اور سادہ مزاج، اپنی علمیت اور اپنے رہن سہن سے اپنے وطن عزیز کی نمائندگی میں اور اپنے میزبانوں کا دل جیتنے میں لاثانی تھے۔ ان کی آمد کے بعد یونیورسٹی میں اردو کی آپشنل کلاسز شروع ہوئیں اور کچھ پروفیسر صاحب کی شفقت اور کچھ اپنے ذوق وشوق کی وجہ سے خلیل اردو کی طرف کھنچے چلے آئے۔ چار برسوں میں امتیازی نمبروں سے بی اے کی ڈگری لینے کے بعد ان کے سامنے اپنے کیریر کے دو مواقع موجود تھے۔ وہ وزارتِ خارجہ میں فارسی ترجمان کے طور پر بھی ایک اچھا عہدہ حاصل کر سکتے تھے اور دوسری طرف یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں اردو کے لیے اسسٹنٹ کی جگہ بھی خالی تھی۔ اچھی تنخواہ اور آرام کی سرکاری نوکری کی جگہ انہوں نے یونیورسٹی کی کم تنخواہ والی ملازمت کو ترجیح دی اور اس طرح فارسی سے اردو کی طرف آ کر وہ شعبۂ اردو میں شامل ہوئے۔ 92-1989ء میں انہوں نے باقاعدگی سے اردو میں ایم۔اے کیا۔ ماسٹرز ڈگری کے لیے ان کے تھیسس کا موضوع مرزا غالب کی زندگی اور فن سے متعلق تھا۔ تین برسوں میں انہوں نے اپنی ڈاکٹریٹ مکمل کر لی۔ اس بار ان کے تھیسس کا موضوع واقعی، بنیادی طور پر ہی Research۔ Oriented تھا۔

''ہندوستان میں فارسی اور اردو شاعری اور بہادر شاہ ظفر کے عہد کے شعراء''۔ یہ کام، گنجلک اور لاینحل نہ ہونے کے باوجود، تحقیق اور محققانہ تشریح و توضیح کا تھا، اور خلیل صاحب نے اپنے مقالے میں اس فرض کو بخوبی نبھایا۔ اس وقت وہ اپنے شعبے کے ایسوسی ایٹ پروفیسر اور صدر ہیں۔

خلیل طوق اَر صاحب کی اردو ادب میں دلچسپی، اور اس دلچسپی کے تحت معرض وجود میں آنے والی، تحقیق اور درس وتدریس شاید ادھوری رہ جاتی اگر وہ اپنی تخلیقی قوت کو، جو ایک چنگاری کی طرح ان کے ذہنِ نیم بیدار میں سلگ رہی تھی، ہوا نہ دیتے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں ترک ہوں۔ اردو میری مادری زبان نہیں۔ نہ ہی میں ایک ایسے ماحول میں پیدا ہو کر پروان چڑھا جہاں اردو بولی جاتی ہو۔ میں نے بی۔اے کی تعلیم کے دوران اردو سیکھنی شروع کی.....اس طرح سے میرے دل میں اردو سے محبت سی بیدار ہونے لگی اور یہ محبت زمانے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی۔ مجھے شعر وشاعری کا شوق تھا۔ کچھ عرصہ بعد اردو سے محبت اور شعر وشاعری کے شوق کی آمیزش ہوئی اور غیر اختیاری طور پر میرے احساسات اردو کے روپ میں میرے قلم سے نکلنے لگے۔'' (''عرض حال''، دیباچہ ''ایک قطرہ آنسو'' صفحہ 17) خلیل اپنی اردو شاعری کی شروعات کے افسانے کو محبت کے استعارے سے شروع کرتے ہیں۔ کیا اس روداد میں عشق کے استعارے کی وساطت سے ان کے تحت الشعور میں خوابیدہ اردو کے تئیں اسی قماش کے عشق کا اظہار نہیں ہے جو ایک عاشق کو اپنے محبوب کے ساتھ ہوتا ہے، یہ دیکھنا قاری کا کام ہے۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں۔

''ممکن ہے بعضوں کے لیے اس مجموعہ میں موجود نظموں کو نظم کی صنف میں شمار کرنا مشکل ہو۔ شاید میرا شمار بھی شاعروں کی صف میں نہیں کیا جا سکتا۔ اور ویسے بھی اس سلسلے میں نہ میرا مدعا ہے، نہ میری ضد۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ نظمیں بعض اہل ہنر کے اعلیٰ معیار پر پوری نہ اترتی ہوں۔ اس لیے قارئین کرام سے میری گذارش ہے کہ اس مجموعہ کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ مدنظر رکھیں کہ اس میں موجود نظموں کو کسی غیر زبان اجنبی نے قلمبند کیا ہے۔ لیکن جو بھی ہو، جیسے بھی ہو، یہ نظمیں ان لمحوں کی یادیں ہیں جنہیں میں بھولنا نہیں چاہتا۔'' (''عرض حال''، پیش لفظ۔ ''ایک قطرہ آنسو''۔ ص۔18-17) ان الفاظ میں شاعر کو اس بات کا احساس ہے کہ اس بات کے باوجود کہ یہ نظمیں ان کے دل سے نکلی ہیں، ''ان لمحوں کی یادیں ہیں، جنہیں میں بھولنا نہیں چاہتا''، لیکن شاید اردو کے ''اہل ہنر'' انہیں نظم کی صنف میں شمار نہ کریں۔ واللہ کیا انکسار ہے اور کیا حقیقت افروز بیان ہے! یہ اصطلاح ''اہل ہنر'' کچھ توجہ چاہتی ہے۔ اہل ہنر کون ہوتے ہیں اور ''ہنر'' کے لغوی معانی کیا ہیں؟ خلیل صاحب نے جو بات معصومیت سے لکھ دی، اس میں ایک راز پنہاں ہے۔

دیگر امور کے علاوہ اردو شاعری فارسی کی مرہونِ منت اس لیے بھی ہے کہ ہندوی چھندوں (بشمولیت پنجابی پنگل) سے ناطہ توڑ کر اس نے فارسی عروض کی پابندی لازمی تسلیم کی ہے۔ اس طرح شاعری کی گرائمر یعنی Prosody اور اس کے ذیل میں اوزان کے ہنر کا سیکھنا بالکل ایسے ہی ایک لازمی pre-requisite مانا گیا ہے جیسے کاروباری منیم یا منشی اکاؤنٹینسی سیکھتے

ہیں یا سنار، بڑھئی، مکینک اپنا پیشہ یعنی زرگری، چوب کاری یا مشینری کا کام۔ گویا شاعری کے ''اوزاروں'' یعنی عروض کا علم جب تک نہ سیکھا جائے، شعر کہنے والے کو شاعر نہیں تسلیم کیا جاتا۔ لیکن تخلیق کی دیوی کے بطن سے پیدا ہونے والی تخلیقی قوت کی چنگاری خلیل صاحب سے ایسی نظموں کی تخلیق چاہتی تھی، جو عروض کی جکڑ بندیوں سے آزاد تو ہوں، لیکن اچھی شاعری کے دیگر جملہ لوازمات سے، مثلاً اندرونی آہنگ، تمثال، استعارہ، علامت، اشارہ، کنایہ اور دیگر صنائع و بدائع سے مزین ہوں۔ ظاہر ہے کہ صنف غزل، جو کلیتاً عروض کی مرہون منت ہے، اس زمرے میں نہیں آسکتی تھی۔ صرف وہ نظمیں ہی شامل ہوسکتی تھیں، جنہیں (کسی دیگر موزوں لیبل کی غیر موجودگی میں) 'نثری نظم' کہا گیا ہے۔ یہ اصطلاح ایک Contradiction in Terms ہے، تو بھی اسے قبول عام کی سند مل چکی ہے۔ چہ آنکہ 'بلینک ورس' (آزاد نظم) سے مغائرت ظاہر کرنے کے لیے اس قبیل وقماش کی نظموں پر مشتمل شاعری کو Free Verse کہا جاسکتا تھا اور اس میں عذر بھی کیا ہوسکتا تھا جب کہ ہم 'سمبل' 'امیج' 'کولاج' وغیرہ انگریزی کی تنقیدی زبان (Parlance of Literary Criticism) سے مستعار لے کر اکثر و بیشتر استعمال میں لاتے ہیں۔ اردو املا میں 'فری ورس' بآسانی لکھا جا سکتا ہے، جبکہ کچھ Multisyllabic Words لکھنے میں بھونڈے دکھائی دیتے ہیں۔

میں نے خود ہمیشہ عروض کی سخت ترین پابندی کے ساتھ اردو میں آزاد نظمیں خلق کی ہیں اور کچھ تجربوں میں Run-on Lines کے طریق کار کے علاوہ، جدید یورپی اور امریکی شاعری میں ہر نئے دن ادبی افق پر طلوع ہونے والے نئے تجربوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ان میں ہی صوتی محاکات کا چلن ہے، جو میری کچھ نظموں کا محرک رہا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ عروض کی پابندی اور صوتی محاکات کئی بار وصل کے عمل میں بہم دگر منسلک نہیں ہوتے، میں نے عروض کی پابندی کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ اس لیے یہ بات شاید اصولی طور پر میرے نقطۂ نظر کی نفی و تردید کرتی ہو، لیکن میں یہ کہنے سے نہیں جھجکتا کہ اگر دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں، بشمول انگریزی، فرانسیسی، جرمن، لاطینی، جدید اطالوی، اور ہسپانوی زبانوں کے شعری ادب میں یہ فرق روا نہیں رکھا جاتا کہ ایک نظم 'بلینک ورس' ہے اور دوسری 'فری ورس'، تو اردو میں کیوں رکھا جائے؟

میں خلیل طوق آر صاحب کی ایک 'نثری نظم'' یہاں پیش کرنے کے بعد یہ دیکھنے کی جسارت کروں گا کہ آیا نثری نظم اپنی 'نظم' ہونے کی حیثیت میں نثر کے استعمال کی وجہ سے باقاعدہ تقطیع کی جاسکنے والی ''نظم'' سے کمتر ہے یا بہتر۔

جوبن کے دن تھے
جوبن کے دن تھے
لٹا دیے سنجوگ کے آنند اپنے
پھاگن کی شرابی پریاں
سنائیں پوس کی کہانیاں مجھے
ٹھنڈی پڑ گئی مامتا کی گرمی
اوس آنکھوں میں جم گئی
دھڑکن دھم سے رک گئی
جیون کی رسی اچانک ٹوٹ گئی
جوبن کے دن تھے جب میں نے
سُلا دیں آشائیں اپنے من میں

یہ نظم معمولی سے ردوبدل کے ساتھ، کچھ بھرتی کے الفاظ جوڑنے سے یا کچھ زیر اور واؤ سے بننے والے اضافتی اور فارسی آمیز 'ذوالجلالی' الفاظ کے اشتراک سے ایک ہی بحر میں بآسانی بدلی جاسکتی تھی۔ موجودہ حالت میں بھی کچھ سطریں ایسی ہیں جو کسی نہ کسی بحر میں تقطیع کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً ''پھاگن کی شرابی پریاں'' یا ''جوبن کے دن تھے جب میں نے'' چار بار فعلن فعلن کی تکرار، یا ''اوس آنکھوں میں جم گئی'' تین بار فعلن فعلن کی تکرار، یا ''سُنائیں پوس کی کہانیاں مجھے'' مفاعلن مفاعلن کی تکرار میں موزوں ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سب سطروں میں internal rhythm موجود ہے جو سطروں کو موسیقی کے تال میں باندھتا ہے۔ شاعری کے کچھ دیگر Pre-requisites اس نظم میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ بصری پیکر تمثالوں کی صورت میں ابھرتے ہیں۔ الفاظ کے معنوی تال میل میں دیکھا جائے تو ''پوس'' یعنی موسم سرما کا مہینہ، ''ٹھنڈی پڑ گئی مامتا کی گرمی''، ''اوس آنکھوں میں جم گئی''، ایک تسبیح میں دانوں کی طرح پروئے ہوئے لگتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہندی گیتوں کی لفظیات کے بے حد خوبصورت اور موسیقیت سے لبریز نمونے اس نظم میں اپنی چھب دکھلاتے ہوئے پیش کیے گئے ہیں۔

یہ سوال کئی بار اٹھایا گیا ہے کہ کیا نثری نظم کا کوئی تخلیقی جواز ہے بھی؟ اردو میں نثری نظم کے امکانات کی نفی میں عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ بحر کی غیر موجودگی میں چونکہ آہنگ قائم رکھنا مشکل ہے، اس لیے شاعر اگر موسیقیت کی سطح کو چھونے والا آہنگ برقرار نہیں رکھ سکتا تو اس کی تخلیق 'نثرِ لطیف' تو ہوگی، نظم نہیں۔ اردو شاعری کی بوطیقا شروع سے ہی صنف غزل کے ساتھ منسلک رہی ہے۔ س لیے پرانے ذہنوں کو یہی محسوس ہوتا ہے کہ جو شعری تخلیق تقطیع کے پیمانے پر پوری نہ اترے وہ اس صنف سے خارج ہے۔ اردو نظم کی حالیہ تاریخ سے میرا رشتہ گذشتہ ساٹھ برسوں سے قائم ہے۔ میں نے پابند نظمیں بھی لکھی ہیں اور باقاعدگی سے تقطیع کی جاسکنے والی (قافیہ اور سطروں کی طوالت میں یکسانیت کی قید سے آزاد) بلینک ورس نظمیں بھی۔ درس و تدریس میں انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں کے ادبِ عالیہ کو پڑھاتے ہوئے یہ بات

بھی وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ فی زمانہ ان زبانوں میں نناوے فیصد نظمیں ''فری ورس'' یعنی اردو اصطلاح ''نثری نظم'' کے قبیل سے ہیں۔ سانیٹ، اوڈ، اور دیگر اصناف شعر جن کو lambic Pentametre میں تقطیع کیا جا سکتا ہے، فی زمانہ ناپید ہیں۔ دور دورہ ہے تو صرف ''فری ورس'' کا۔ ایسی شاعری جس میں عروض کی جکڑ بندیاں نہ ہو اور جو فنِ شعر کے دیگر لوازمات، استعارہ، تشبیہہ، تمثال، علامت، اشارہ، کنایہ اور بین المتونیت Inter-textuality کی سطح پر تاریخ، اساطیر، لوک قصص اور مہابیانیہ کی صنف کی Epic Poetry سے نہ صرف اپنا رشتہ استوار کرے بلکہ ان سے کرداروں اور واقعات کی باز یافت کرنے کے بعد، فی زمانہ سماجی حالات کے Frame of Reference میں رکھ کر، انہیں نئے معانی کا ملبوس بھی پہنائے ۔۔۔ یہ ہے وہ شاعری (جو صنفِ غزل میں تو خیر ناممکن ہے) لیکن جو صرف ''بلینک ورس'' یا ''فری ورس'' میں پیش کی جا سکتی ہے۔

خلیل صاحب کے پہلے مجموعے ''ایک قطرہ آنسو'' میں مشمولہ نثری نظمیں ان کے دل سے نکلی ہوئی، شبنم سے دھلی ہوئی، ایسی شاعری ہے جسے لوئی میکنیس Honest to God and self کہتا ہے۔ میں ان نظموں میں سے دو اور نمونے پیش کروں گا اور قاری سے درخواست کروں گا کہ ان نظموں کی امیجری اور پیکر تراشی کی طرف ایک نظر دیکھ کر یہ ضرور تسلیم کریں کہ یہ امیجری اور استعارہ سازی پیش پا افتادہ غزلیہ استعاروں کی فہرست سے نہیں لی گئی ہے۔ یہ ساکن بھی ہے اور فلم کی طرح frame by frame متحرک بھی، لیکن ہر حال میں تر و تازہ ہے۔

ابرِ بہار
ہواؤں کی سوئی ہاتھ میں لیے
ابرِ بہار سی رہا ہوں میں
غمگین پت جھڑوں کی کالی
گھٹاؤں سے بچے ہوئے
ٹکڑوں کو ملا ملا کر
رنگ کرتا ہوں انہیں
آنکھ کی سفیدی سے بھی سفید
سفیدی سے
ایک قطرۂ اشک اس کے دل میں
ڈالتا ہوں
اکسیر کی نیت سے، جو کہ
ٹپک پڑا تھا صدیوں پہلے
ایک یتیم پاکدامن کی
چشمِ شفا بخش سے
''ھو'' کہتا ہوں اس کے کان میں
سرگوشیوں میں
آزاد کرتا ہوں اسے
اپنے تھکے ہوئے
بے بس ہاتھوں سے
جائے، جہاں چاہے
جہاں تک جا سکے
برسائے
باران مروارید
شاید بدل دے
الٹے ہوئے نصیب!

یہ نظم کلیتاً ذاتی ہے، بلکہ یوں کہنا بہتر ہوگا کہ 'وارداتی' ہے۔ موضوع 'واردات' کی سطح پر زمینی ہے، لیکن استعارے کی سطح پر ما بعد الطبعاتی ہے۔ مرکزی استعارہ ایک ایسی نیک روح کا انسانی قالب میں آنا ہے جو 'بارانِ مروارید' یعنی موتیوں کی برکھا لے کر وارد ہوئی ہے، لیکن اس کا زمینی قیام مختصر ترین ہے۔ اسے چلے جانا ہے۔ اس مرکزی استعارے کو تمثال سازی کے بصری نمونوں سے ایسے پیش کیا گیا ہے کہ پہلی سطر سے آخری سطر تک نظم اپنے اسٹرکچر میں ایک نامیاتی اکائی Organic Unity بن گئی ہے۔ پہلا متحرک امیج واحد متکلم (جو شاعر بنفس نفیس خود بھی ہو سکتا ہے) کا ایک ابرِ بہار کی چیتھڑا چیتھڑا ہوئی چادر کو سوئی کی نوک سے سینا ہے۔ یہ سوزن اپنا کام کر چکتی ہے تو narrator یعنی واحد متکلم کہتا ہے کہ ''آنکھ کی سفیدی سے بھی زیادہ سفید'' قلمی سے وہ اس ابرِ بہار کو رنگساز کی طرح رنگ کی ایک پرت دیتا ہے۔ اب استعارے میں ایک اور جہت وارد ہوتی ہے۔ 'اکسیر کی نیت سے' (یعنی شفایابی کے لیے) ایک ایسا ''قطرۂ اشک'' انسانی جسم میں حلول ہو چکی اس روح کے بند ہوتے ہوئے ''دل میں / ڈالتا ہوں / جو ٹپک پڑا تھا صدیوں پہلے / ایک یتیم پاکدامن کی / چشمِ شفا بخش سے''۔ ''پاکدامن'' کے تاریخی یا اسطوراتی حوالے کی تفسیر کرنے کی ضرورت نہیں، صرف یہ دیکھنا ضروری ہے، کہ اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔ اس کے کان میں ''اللہ ھو'' کی سرگوشی کا ورد، اور اس کے بعد اس پاک روح کو اپنے ابدی سفر پر جانے کا اذن.... یہ سب واحد متکلم کی خود نوشت داستانِ غم ہے۔ اس کے اپنے گھر کی زمین پر تو موتیوں کی بارش نہیں ہو سکی، لیکن اب:

آزاد کرتا ہوں اسے
اپنے تھکے ہوئے
بے بس ہاتھوں سے

جائے، جہاں چاہے
جہاں تک جا سکے
برسائے
بارانِ مراد و رید
شاید بدل دے
الٹے ہوئے نصیب!

یہ نظم اور اس جیسی کئی اور نظمیں اس شعری مجموعے میں ،(جسے انگریزی کی اصطلاح میں A writer's juvenalia کہا جاسکتا ہے، نہ صرف موجود ہیں بلکہ زبانِ حال سے قاری کے ساتھ محوِ گفتگو ہوتی ہیں۔ان کا یہ کمال اس تازگی میں ہے جو پیش پا افتادہ اور گھسے پٹے ہوئے استعاروں، اسلوب میں غزل کی فارمولا زبان اور اس کے ساتھ لگی بندھی ہوئی اضافتیں اور تراکیب سے گریز ہے، بلکہ فرار ہے، یعنی راقم الحروف کو ان نظموں میں تو دور دور تک ان کی منحوس شکل دکھائی نہیں دی۔

یہ بات درست ہے کہ ان نظموں کا لہجہ نہ صرف فی زمانہ اردو کے شعری اسلوب سے مختلف ہے، بلکہ entence structure کو بغور پرکھنے کے عمل میں بھی کہیں کہیں یہ شائبہ ہونے لگتا ہے کہ شاعر اندرونِ ذہن شعر کے مضمون کو اپنی مادری زبان یعنی ترکی میں الفاظ کا جامہ پہناتا ہے اور پھر اس تخلیق کو جو ابھی صفحۂ قرطاس پر منتقل نہیں ہوئی، اپنی تخلیقی قوت اور ذو جہت زباندانی کے بل پر اردو کا ملبوس زیبِ تن کرنے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ ایک زبان سے دوسری میں ترجمہ کاری کا یہ ایک مسلّم اصول ہے کہ لفظی ترجمہ کئی بار لا یعنیت کی حد کو نہ چھوئے لیکن اگر موضوع اور متن کو اس کی اصل خوشبو گنوائے بغیر ایک دوسری زبان میں منتقل کرنا ہو، تو یہ ترجمہ translation ہوتے ہوئے بھی transcreation بن جانے پر خود کو مجبور پائے گا۔اگر ذہن سے کاغذ پر انتقال کے وقت اس صورتحال سے فرار ممکن نہیں ہے تو ذولسانی یا سہ لسانی شعرا کو، جو ایک سے زیادہ زبانوں میں شعر کہنے کی قدرت رکھتے ہیں، ہمہ وقت اس سے نپٹنا پڑے گا۔

سٹیلے فِش پوچھتا ہے،''الفاظ جو کہ حروف کا مجموعہ ہیں، کیا کرتے ہیں؟'' اور پھر خود ہی جواب تجویز کرتا ہے، کہ'' الفاظ معانی کو متشکل کرتے ہیں۔'' ایک ماہر لسانیات کا یہ فرمان یقیناً قابل قبول ہوگا کہ 'لفظ'، اور اس لفظ کا کسی بھی جملے میں پیوند ایک خاص کا کردگی کا جنم داتا ہے۔لفظ اپنی آماجگاہ، یعنی جملے کے سیاق و سباق میں کیا کرتا ہے، اور اگر اس کی شکل و صورت بدل دی جائے یا زمانی اعتبار سے اس کا چلن مختلف ہو، تو کس طرح کی غلط فہمی کا احتمال ہے، اس بات کا جواب بھی تخلیق کے خلق ہونے کے عمل میں ہے۔شعری تجربے کی بھول بھلیاں سے شاعر جب گذرتا ہے تو اس کے تخلیقی ذہن میں عمل اور ردِ عمل کی ایک زنجیر سی بنتی چلی جاتی ہے۔اسے زبان دینے کے لیے کئی بار زبان کی شکست و ریخت لازمی دکھائی دیتی ہے۔اگر ایسا نہ کیا جائے تو زبان ایک جامد اور ٹھوس وجود کی حالت ہو جائے گی۔ شعر کہنے کا فن یہ تقاضا کرتا ہے کہ یہ شکست و ریخت اور نئی بنیاد وایجاد اس عمارت سازی کی شکل میں ظاہر ہوں جس سے زبان اس شعری تجربے کی صحیح معنوی نمائندگی کی اہل ہو جو شاعر کے ذہن میں 'فرضیت' کو خلق کرتا ہے اور فرضیت کی عدم قطعیت میں دلچسپی لینے کے عمل سے اپنا جواز حاصل کرتا ہے۔'زبان کے استعمال میں 'قطعیت' سمِ قاتل ہے۔ ہندی کوی کہتے ہیں کہ زبان کے ساتھ 'کھلواڑ' ضروری ہے تا کہ وہ اس سے نیا اور تازہ خون حاصل کر سکے۔

میں خود اردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی میں نظمیں لکھتا ہوں۔ اردو، ہندی اور پنجابی کی جملہ سازی ایک ہی linguistic pattern پر استوار ہے اور مجھے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑتا، لیکن انگریزی نہ صرف ایک مختلف پیٹرن کا احاطہ کرتی ہے، بلکہ بعض اوقات یہ پیٹرن اردو، ہندی یا پنجابی کی نفی بن کر ظاہر ہوتا ہے۔اسی لیے ہندوستان کے انگریزی میں لکھنے والے شاعروں کو Indo-Anglian Poets کا لیبل دیا گیا ہے۔جب کہ انگلستان کے وہ شعرا جنہوں نے اپنے وقتوں میں ہندوستانی تہذیب، رہن سہن کے موضوعات پر انگریزی اور 'دیسی' کے اختلاط سے اپنے ادب پارے تخلیق کیے، انہیں Anglo-Indian Poets کہا گیا۔اس لیے یہ ایک قدرتی امر ہے کہ ایک ترک نژاد اردو شاعر ترکی کی صرف و نحو اور تصریفی و قواعدی طرزِ بیان میں اپنے فکر کے اظہار کو سموئے اور پھر ذہنی سطح پر ہی اردو میں ان کا ترجمہ کرتے ہوئے عبارت آرائی اور مصطلحات میں نہ بھٹک جائے۔لیکن زیرِ بحث امر میں مندرجہ ذیل جملوں کو خالص فصیح بیانی کے ذیل میں شمار نہ کر کے ان کو شاعری میں تلطیفِ عبارت Eupheism کی فہرست میں بھی رکھا جاسکتا ہے۔

مرجھانے کا ڈر ہو اگر
دھوپ کی شدید گرمی سے
ہاتھ تو پھیلائیں اس کے اوپر
گلِ محبت کے بچاؤ کی خاطر۔
کیونکہ الٹے نصیبوں کو بدل دیتی ہیں
لاچار زخموں کی دوا ہوتی ہیں
اکٹھے دھڑکیں دل تو اگر
فکرِ واحد کی تخلیق کی خاطر

مجھے اس بات سے سروکار نہیں ہے کہ مروجہ روزمرہ کے مطابق 'ہاتھ پھیلانا' ایک الگ معنی میں استعمال ہوتا ہے، اور 'لاچار زخموں' میں صفت 'لاچار' موزوں اس لیے نہیں ہے کہ یہ 'لاعلاج' کا صحیح متبادل نہیں ہے۔ہاں، اس

بات سے سروکار ضرور ہے کہ چونکہ ہم نے عربی اور فارسی سے کچھ الفاظ، اصطلاحات اور مروّجہ محاورہ اور اسلوب اپنی بول چال میں قبول کر لیے ہیں، کئی بار یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ عرب اور عجم سے ہندوستان تک کے سفر میں اور پھر یہاں کی بودوباش میں ان کی شکل وصورت اور، نکھ سکھ اور عادات و اطوار میں کتنی تبدیلیاں آ گئی ہیں۔

ہر ایک تجربہ شعری نہیں ہوتا۔ شعری تجربہ زبان کی سطح پر نمودار ہونے والا ایک ایسا حادثہ ہے، جس کے لیے پہلے کوئی تیاری نہیں کرنا پڑتی (اس تھیوری کا اطلاق شاید صنف غزل پر، جو ایک مصنوعی صنفِ شعر، ہے پوری طرح نہ کیا جا سکے)۔ زبان سے عبارت اس متن میں معنی کا ایک ہلکا سا پرتو موجود ہوتا ہے، پھر شاعر اسے اپنی زباندانی کے توسط سے شعری اظہار کے کھلی معانی سے ہم کنار کرتا ہے۔ جب شعر مکمل ہو چکتا ہے تو شاعر سے یعنی اپنے خالق سے ظہور پذیر ہو چکنے والی شعری تخلیق کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا۔ اب شعر خود میں ہی ایک ایسی اکائی، ایک ایسی سالمیت ہے، جو آزاد ہے، خود کفیل ہے، اور اسے پڑھنے والا اپنے ذوق، استبداد اور زبان کی تربیت کی بنیاد پر اس کے معانی کو سمجھ کر قبول کرتا ہے۔ اس لیے مجھے خلیل صاحب کے ایسے جملوں کی اختراع اور تدوین پر کوئی اعتراض نہیں ہے، میں تو اردو کے لیے اسے ایک مبارک فال سمجھتا ہوں۔ کسی چیز کے اوپر ہاتھ ''پھیلا'' کر اس پر سایہ کرنا، اسے تحفظ دینا، اسے دھوپ، بارش اور گرد سے بچانا، میرے لیے اتنا ہی بامعنی ہے، جتنا کہ ''ہاتھ پھیلانا'' یعنی بھیک مانگنا یا کوئی چیز لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھانا کے معنی میں ہے۔

خلیل صاحب کی دوسری شعری تصنیف ''آخری فریاد' ہے۔ یہ شعری مجموعہ سن 2007ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ پہلے مجموعے کے اشاعت پذیر ہونے اور دوسرے کے منظر عام پر آنے کے درمیانی وقفے میں، ایسے لگتا ہے، جیسے خلیل صاحب کی توجہ کراچی سے ہٹ کر لاہور پر مبذول ہو گئی ہو۔ یہ مجموعہ لاہور سے چھپا، اس پر لاہور کے ہی جناب اظہر غوری صاحب، جو سیکرٹری جنرل، رائٹرز ایسوسی ایشن، لاہور'' ہیں، کا فلیپ اندراج ہے اور اس کا دیباچہ بھی اردو کے معروف استاد اور نقاد ڈاکٹر ضیا الحسن (پنجاب یونیورسٹی، لاہور) کا تحریر کردہ ہے۔ اس مجموعے میں حمد ونعت، قطعہ، غزل، نثری نظم وغیرہ سبھی اصنافِ شعر موجود ہیں۔

میں صنف غزل سے ہی بات شروع کرتا ہوں۔ روایتی غزل کے مضامین بین التونیت inter-textuality کی سطح پر لگ بھگ ایک ہی فہرست سے مستعار تسلیم کیے جانے میں کوئی قباحت نہیں۔ متشیات میں غالب اور شاید میر تقی میر کسی حد تک آ سکتے ہیں، لیکن کلاسیکی اور نیم کلاسیکی روایت میں نہ صرف مضامین بلکہ استعارے کی سطح پر ان کی contiguity ایک مسلمہ امر ہے۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے پہلے پچاس سالوں میں کسی بھی استاد شاعر کی کلیات اگر اٹھا کر دیکھی جائے اور اس میں مضامین کے Frequency Coun کا چارٹ ترتیب دیا جائے تو ان کی تعداد ایک سو سے کم ہی نکلے گی۔ اسی طرح اگر استعارات کی آمد و شد کو ایک الگ frequency chart میں رکھ کر اس سے flow chart اخذ کر لیا جائے تو contiguity and freqeuncy میں ان کی تعداد بھی شاید ایک سو سے نہ بڑھ پائے۔ کچھ دیگر امور جو ہیں وہ آج بھی روایتی غزل گو شاعروں کے بارہا آزمودہ نسخوں کی طرح ہیں۔ ان میں حال اور مستقبل کے متعلق کلیتاً بے پروائی ہے، قفل برلب سکوت ہے، تعطل اور جمود ہے اور صرف ماضی کے تئیں ایک خوش خیال رویہ ہے۔ روایتی غزل میں زندگی کے طبیعی اور مادی پہلوؤں کی طرف توجہ کا فقدان ہے۔ اگر اس میں رمزیت کا وجود ہے تو وہ بھی صرف روحانی یا غیر طبیعی حوالوں سے ہے۔ اشیا، اجسام اور طبیعی نقوش سے فرار ہے۔ ''غزلیت'' تین سطحوں پر در آتی ہے۔ اول تو قافیہ اور ردیف کی پابندی ہی ہے جو اسے آہنگ اور موسیقیت کا عنصر فراہم کرتی ہے، دوئم یہ کہ بین التونیت کے زیر اثر غزل صرف ان مضامین کو فوقیت دیتی ہے جو ذاتی وجدان کے عنصر سے مملو ہوں اور جن میں عقلیت اول تو سرے سے غائب ہی ہو، اور اگر ہو بھی تو برائے نام سی۔ سوئم یہ کہ غزل انسانی فطرت کو بھی رومانیت کے اصول کے تحت ڈھالتے ہوئے خود ترحمی self pity کا شکار ہوتی ہے۔ اسم میں وہ 'قصابیت' بھی شامل ہے، جس میں معشوق کا استعارہ 'قاتل' ہے۔

خلیل صاحب غزل کی روایت کی نفی نہ کرتے ہوئے ایسے مضامین اور استعارات کو تلانجلی نہیں دیتے جو پہلے لاکھوں بار اردو کی غزلیہ شاعری میں وارد ہو چکے ہیں، لیکن ترک نژاد ہونے اور ایک ملتی جلتی لیکن حقیقتاً مختلف تہذیب اور معاشرے میں آنکھ کھولنے اور زندگی گذارنے کے طفیل ان مضامین میں بھی اسلوب کی سطح پر تازگی دکھائی دیتی ہے۔ میں نموتاً صرف کچھ اشعار ہی یہاں پیش کروں گا۔ ملاحظہ فرمائیں۔

میں دشت عاشقی میں ہوں اک قیس آوارہ
نہ لیلیٰ کی عنایت کی کبھی خواہش کروں گا میں

اس شعر میں 'دشت عاشقی' سے مراد یقیناً 'دشت عشق' ہے، لیکن ترکی زبان کے لوازم کے مطابق مجازِ مرسل تقریباً ہر جگہ ممکن ہے، اور یہاں بھی یہی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔

''سیہ قسمتی سے شکایت نہیں، پر'' اس مصرعے میں 'سیہ قسمتی' کا استعمال 'سیہ بختی' کا نعم البدل ہے، لیکن اردو میں 'قسمتی' مستعمل نہیں ہے، حالانکہ 'بخت' اور 'قسمت' بتدریج فارسی اور عربی سے اردو میں وارد ہوئے ہیں اور قواعد کے اصولوں کے مطابق 'یائے معروف نسبتی'، (جیسے پاکستان سے پاکستانی، ایران سے ایرانی وغیرہ) برصغیر میں فارسی، عربی اور ہندی الفاظ کے اشتراک

سے عام بول چال میں استعمال کی جاتی ہے۔

یہ اشعار اور دیگر اس قماش کے اشعار خلیل صاحب کی غزلیہ شاعری میں قدم قدم پر ملتے ہیں۔ ان میں ایک عجیب سی تازگی ہے، غیریت میں بھی اپنایت ہے، اور ایسے لگتا ہے جیسے موصوف ایک نئی تحریک کو شروع کر رہے ہوں، لیکن ایسا نہیں ہے۔ خلیل اردو غزل کی جکڑ بندیوں سے بے نیاز ہیں اور یہ صنف جس ڈھنگ سے اردو میں مروج ہے، اس کے تحت یہ کہا جا سکتا ہے کہ لفظیات کی سطح پر اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ خلیل صاحب کی شعری حسیت خود آگاہ نہیں ہے۔ اگر ان کا 'جلوہ' دیکھنا مقصود ہے تو ان کی نثری نظموں کو ایک نظر دیکھنا بے حد ضروری ہے۔ ان نظموں میں ان کے فکری نظام، اور اس کے شعری اظہار میں تجرد اور تطور کا امتزاج ملتا ہے۔ ایک ایک سطر میں بسا اوقات ظاہری مفاہیم اور امکانی مفاہیم کی آمیزش ملتی ہے۔ کسی ایک معنی پر مرتکز ہونا تو نظم کا ہنر ہے ہی لیکن اگر شاعر آہنگ کی مناسبت سے نثر اور نظم کو جوڑنے والے پل صراط کے جوکھم کو کاٹ لے تو وہ کثیر المعنیاتی امکانات کا اہل بھی ہو سکتا ہے۔

مجھے یہ کہنے میں بھی عار نہیں کہ اس لحاظ سے خلیل صاحب کا پہلا شعری مجموعہ دوسرے شعری مجموعے سے کچھ زیادہ خود کفیل ہے۔ میں نے دونوں مجموعوں کا بنظر غور مطالعہ کیا ہے۔ مدرسہ اور جامعہ کی سطح پر تحقیق کرنے کے تجربے میں یہ بھی شامل ہے کہ کسی شاعر کی تخلیقات کو زمانی پیمانوں سے بھی ماپا جائے کہ وقت کے رہتے رہتے ان میں کیا تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئیں۔ اس لحاظ سے ''ایک قطرہ آنسو''، یعنی ان کا پہلا شعری مجموعہ، ''آخری فریاد'' یعنی ان کے دوسرے شعری مجموعے پر سبقت لے جاتا ہے۔ وجہ نامعلوم لیکن یہ بات خلیل صاحب کے لیے ایک لمحۂ فکریہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیا وجہ ہے کی اس مجموعے کی نثری نظمیں موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطحوں پر اعلیٰ پائے کی ہونے کے علاوہ نامیاتی وحدت کے بھی عمدہ نمونے ہیں جبکہ دوسرے مجموعے میں کچھ کمیاں رہ گئی ہیں۔ 'ایک قطرہ آنسو' سے کچھ اقتباسات پیش کر رہا ہوں۔

ایک قطرہ پانی کا ہوں میں
نہ بو ہے میری، نہ ہی رنگ میرا
لاتعداد ہم جنسوں کے بیچ میں ہوں
مجذوب!
نقش قدم نہیں پیچھے
نہ نمائندہ راہ ہوں آئندہ کا
ہزاروں نشانوں میں میرا نشان ہے مفقود
پریشان ہیں افکار
کچل رہی ہیں دماغ مالایعنیات
لیکن پھر بھی میں ہوں سوچنے پر۔ مجبور

اگر قاری یا نقاد ایک لمحے کے لیے عجیب الصوت یا ہمعصر اردو میں غیر مستعمل اصطلاحات۔ نمائندۂ راہ، ہزاراں، مالایعنیات۔ سے درگذر کرے تو اسے یہ دیکھنے پر مجبور ہونا پڑے گا کہ شاعر کا مرکزی استعارہ پانی کا ایک قطرہ ہے اور اس اعلان ''ایک قطرہ پانی کا ہوں'' کے بعد وارد ہونے والے سبھی امیج اس قطرے کی صفات پر دال ہیں جو کہ شاعر خود ہے۔ اور آخری سطر ''لیکن پھر بھی ہوں سوچنے پر مجبور'' تابوت میں آخری کیل کی طرح آتی ہے۔ یہ پانی کا قطرہ (مادۂ تولید کا اشارہ یا کنایہ)، بو، رنگ (عناصر خمسہ میں سے دو عدد) نہیں رکھتا۔ اس کا وجود لاکھوں دیگر پانی کے قطروں میں جذب ہے۔ اس کا کوئی ماضی نہیں (نقش قدم نہیں پیچھے)، کوئی مستقبل نہیں (نہ نمائندہِ راہ ہوں آئندہ کا)، لیکن یہ قطرہ (خلیہ، gene , sperm of eugenics) سوچنے، فکر و تردد میں غرق ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یعنی انسان ہے۔

کچھ اور نظمیں بھی اسی قماش کی ہیں، جن میں آخری سطر یا دو تین سطریں punch lines کی طرح وارد ہوتی ہیں۔ میں زیادہ مثالوں سے گریز کرتے ہوئے صرف دو نظموں کا ذکر کروں گا۔

زخمی تصورات کا بے لگام گھوڑا
اضطراب سے پاگل، ایک مجنوں جیسا
ایوانِ خیال کی بلور سرحدیں
پار کر کے انجانی کہیں
دور دراز فضاؤں کی پہنائیوں میں
کھو جانے کی ٹھان لیے ہوئے
تمامتر سرعت و تیزی کے ساتھ
ہواؤں سے جیسے کرتا ہے بات
جیسے اسے ایک شفا بخش دست کے
چھو جانے سے شفایابی کا ڈر ہو!

یہ دس سطریں ایک نظم بعنوان ''کہتے ہیں'' کا آخری ٹکڑا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو سب سطریں مل کر صرف ایک جملے کی تکمیل کرتی ہیں۔ یہ جملہ 'زخمی خیالات کا بے لگام گھوڑا' سے شروع ہوتا ہے اور آخری سطر کے آخری لفظ تک چلتا جاتا ہے۔ یہ ایک متحرک بصری تمثال ہے۔ بے لگام گھوڑا 'ایوانِ خیال' کی سرحدیں پار کرتا ہے، اس نے ٹھان لی ہے کہ دور دراز کی پہنائیوں میں اڑتا چلا جائے گا، ہواؤں سے بات کرتا جائے گا اور ٹھہرے گا کہیں نہیں۔ کیوں نہیں؟ اس کا جواب آخری دو سطروں میں ہے۔ ہمیں پہلی سطر سے معلوم ہوتا ہے کہ بے لگام گھوڑا کوئی عام اسپِ تازی نہیں ہے۔ 'زخمی تصورات'' کا گھوڑا ہے۔ ایک ذہین قاری کے طور پر میں خود سے وہ سوال دوبارہ پوچھتا ہوں

''تصورات کا ہیولیٰ سیماب پا برق رفتاری سے کیوں اڑتا جا رہا ہے؟ ٹھہرتا کیوں نہیں؟'' اور جواب کے لیے اس ٹکڑے کی پہلی دوسطروں کی طرف لوٹتا ہوں۔ تو مجھے علم ہوتا ہے کہ زخمی تصور تو اپنے زخم برقرار رکھنا چاہتا ہے، اسے شفا کی تلاش نہیں۔ اور اسی لیے شاعر اس لمبے جملے کو ان الفاظ پر ختم کرتا ہے

جیسے اسے ایک شفا بخش دست کے
چھو جانے سے شفایابی کا ڈر ہو!

کلاسیکی، نیم کلاسیکی اور دورِ حاضر کا روایتی شاعر اس مضمون سے واقف ہے۔ زخم کی کسک میں لذت ہے۔ اگر غالبؔ کہتا ہے، 'زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؟' تو وہ اسی مضمون کو دہرا رہا ہے، لیکن نثری نظم کے اس ترکی شاعر نے جس خوبصورتی سے اس متحرک بصری تمثال کو پیش کیا ہے، وہ قابل تعریف ہے۔

آخری نظم جس کا میں ذکر کرنا چاہوں گا، ایک مختصر نظم ہے جو خود میں ہی ایک مکمل استعارہ ہے، حتےٰ کہ ہم آخری دوسطروں تک پہنچتے ہیں اور تب ہمیں جذبہ اور خیال کی آمیزش کے ساتھ اس بصری پیکر تراشی کے فن سے عبارت تصویر کے اصل معانی سمجھ میں آتے ہیں۔

پہلے وار میں میرے بالوں پر وہ
سفید لکیریں کھینچ گیا
دوسرے وار میں چھوڑ گیا کندھوں پہ
ایک ایسا بوجھ جو اٹھانے سے نہیں اٹھتا
تیسرے وار میں بیٹھ کر سینے پہ مرے
بند کر گیا میری سانس۔۔۔۔

پیر تسمہ پا کی اسطوری کہانی ہم سب کے اجتماعی لاشعور میں کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ جونہی ہم ''بیٹھ کر سینے پہ مرے'' پر پہنچتے ہیں تو (جیسے کی یونگ Jung نے واضح کیا ہے) ہمارا لاشعور ایک ایسی اسطوری wake-up call ہمیں دیتا ہے۔ کہ ہم ایک کمزور و مجبور، بے سہارا انسان کا تصور کرنے لگتے ہیں، جو ہم خود بھی ہیں اور شاعر کا واحد متکلم بھی ہے۔ داستان گو واحد متکلم پر اب تک، تذکرہ نویسی کی پرانی روایت کے عین مطابق ہی، تین وار مکمل ہو چکے ہیں۔ اب چوتھا وار ہونے کو ہے۔

ایک اور وار کب کرے گا مجھ پر
اس بات کو نہ وہ کہتا ہے، نہ میں پوچھتا ہوں۔

ظاہر ہے کہ چوتھا وار موت کا ہے۔ شاعر یہاں غالبؔ کے اس شعر کی بازگشت میں مندرجہ بالا سطریں گنگناتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

؎ ہو چکی غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے!

غالبؔ ہی کا ایک اور مصرع اسی خیال کو زیادہ شدت اور بے باکی سے نظم کرتا ہے۔ ''اے مرگ ناگہاں، تجھے کیا انتظار ہے؟''

وقت ہے کہ اب خلیل صاحب کے دوسرے شعری مجموعے کو، خصوصی طور پر اس کی نثری نظموں کو بھی، ایک نظر دیکھ لیا جائے۔ یہ مجموعہ ضخامت میں پہلے مجموعے سے بڑا ہے، لیکن کیا وقعت و وقار میں اس سے بڑا ہے، اس پر فی الحال میں ایک سوالیہ نشان لگا دیتا ہوں۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس مجموعے کی اگر ساری نظموں میں نہیں، تو بھی بہت سی نظموں میں معانی کی ترسیل براہِ راست ہے اور ہو بہو تصاویری مفاہیم کی رسالت کے لیے امیجری وافر تعداد میں ہونے کے باوجود ایسے لگتا ہے، جیسے استعارے اور علامت سے لبریز پیکر سازی اور تمثال کو پہلے مجموعے کی نظموں کی نسبت سے پس پشت ڈال دیا گیا ہو۔ بہرحال اس سے مجموعے کی اہمیت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ ایک دو نظمیں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

یہ سچی کہانی ہے
نہ ہاتھ میں ہے سُوکھی روٹی
نہ ہی ایک آدھ گلاس پانی
ہڈّیوں کا ڈھانچا بنی
رو رہی ہے چھوٹی سی بچی
آنکھوں میں حسرتیں بھرے
آگے پیچھے کوئی نہیں
شام تک ہی سہی، جینے کی
کوئی امید نہیں
یہ ہے غربت زدہ بچی
اس کی کہانی ہے سچی!

سیدھی سادی، سچّی، جذبات سے لبریز، دل کو چھو لینے والی ایک تصویر جس میں شاعر آخری چار سطروں میں خود بولتا ہے اور ''کہانی ہے سچی'' کہہ کر اپنے فرض سے سبکدوش بھی ہو جاتا ہے۔

افریقا کی آواز
زرافے کی گردن والو!
اک ذرا ادھر کو دیکھو
ہم یہاں کچلے جا رہے ہیں
تمہارے پانو کے تلے

تمہاری نظر مستقبل پہ ہے
ہونا کیا ہے، کرنا کیا ہے

ہم تو آج میں جی رہے ہیں
کل کی ہمیں خبر نہیں

تم برساؤ آسمان سے
چاہے گولی چاہے میزائل!
ہم ترس کر مر رہے ہیں
ایک ایک قطرۂ آب کے لیے!

آخری فریاد
آخری فریاد ہوگی یہ میری
آخری آہ جو زبان سے نکلے گی
آخری شکایت ٹوٹے دل کی
آخری پرسش بجھی امیدوں کی
آخری حسرت اک نئی زندگی کی
آخری تلاش مٹی ہوئی یادوں کی
آخری فریاد ہوگی یہ میری
آخری خواہش، شہادت ہے میری!

تمثال سازی اور پیکر تراشی سے بے نیاز یہ دو نظمیں پڑھنے کے بعد دو تین وہ نظمیں بھی دیکھنی ضروری ہیں جن میں یہ وصف موجود ہے اور ایک مرکزی استعارہ جنہیں نامیاتی وحت یعنی Organic Unity میں باندھے رکھتا ہے۔

سوال
پوچھا میں نے شبنم سے
تیری عمر ہے کتنی
کہا اس نے مسکرا کر
کم سے کم تیرے جتنی
درحقیقت کم ہی سہی
دن اور رات کے حساب سے
پر رازِ حق جاننے کے لیے
میری عمر ہے لمبی تجھ سے!

نوحہ
بہار کے پہلے دن
بلبل بیٹھی ہوئی ہے
نوحہ پڑھتی ہے
گلاب کے سرہانے
کیوں کہ اس کا انجام
معلوم ہے آج اسے
شادی کی پوشاک اتارنی ہوگی
ماتم کا ملبوس پہنا ہوگا
اس معصوم کو
مرجھانا ہوگا چند دنوں تک!

ان نظموں کو آخر میں لکھنے کی غرض وغایت یہ ہے کہ ڈاکٹر خلیل طوق اَر شاعری کے اس وصف سے بخوبی واقف ہیں جو پابند شاعری کو باقاعدگی سے تقطیع کی جاسکنے والی آزاد نظموں سے اور آزاد نظموں کو ''فری ورس'' (نثری نظم) سے الگ کرتا ہے۔ علامت، تشبیہ، اشارہ اور کنایہ تو روز اول سے ہی شاعری کی صفات رہی ہیں لیکن بیسویں صدی تک آتے آتے یہ محسوس کیا جانے لگا تھا کہ رمز، استعارہ، علامت، تلطیف عبارت یعنی euphemism اور پیرایۂ کلام میں تعریف و وضاحت کی جگہ، عقدہ کشائی کی کلید دیے بغیر، استنباطی، تلمیحی اور استعاری لہجہ اختیار کرنا اس لیے ضروری ہے کہ زندگی خود ہی کثیر الجہاتی ہو چکی ہے اور شاعری میں اگر تفسیر و تبصرہ ہو تو وہ شاعری نہ ہو کر کوئی اور ہی صنف ہوگی۔ رمز اور استعارے کو ژولیدہ، مخلوط اور مبالغہ آمیز پہیلی بنا دینا بھی معیوب ہے لیکن صاف بیانی اچھے مقرر کا وصف تو ہے، شاعر کا نہیں۔ اقبال نے یونہی تو نہیں کہا تھا:

شریعت کیوں گریباں گیر ہو میرے تکلم کی
چھپا جاتا ہوں میں باتوں کا مطلب استعاروں میں

اس طویل مضمون کے آخر میں روایت کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ میں خلیل صاحب کی مدح میں کچھ کہوں، لیکن یہ خوشگوار فرض خود ادا کرنے کی خواہش سے پرہیز کرتا ہوا میں خود سے بہتر، اردو کے استاد اور نقاد، ڈاکٹر ضیاء الحسن سے ان کے وہ الفاظ مستعار لیتا ہوں، جو ''آخری فریاد'' کے دیباچے میں انہوں نے تحریر فرمائے ہیں:

''خلیل طوق رَکی کی شاعری دو زبانوں اور دو تہذیبوں کے تخلیقی عناصر کی یکجائی سے ظہور پذیر ہوئی ہے۔ ان کو پڑھتے ہوئے بار بار محسوس ہوتا ہے کہ لمحۂ تخلیق میں بھی وہ دو زبانوں کی تہذیبی سرزمینوں سے بیک وقت نمو پذیری کی قوت حاصل کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں مختلف فضا قائم ہوتی ہے۔ یہ فضا کسی مترجم کی بنائی ہوئی فضا سے اس لیے مختلف ہے کہ جہاں اس میں ترجمہ نگاری کے عناصر کارفرما ہیں، وہیں ساتھ کے ساتھ قوتِ تخلیق بھی اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ خلیل طوق اَر ترک ذہن سے سوچتے ہوئے جب تخلیقی عمل سے گزرتے ہیں تو یہ تخلیقی عمل ترجمہ نگاری سے سوا ہو جاتا ہے اور ایک نئے تخلیقی تجربے کی بازیافت بن جاتا ہے۔''

☆

''چلے چلو کے منزل ابھی نہیں آئی''

پروفیسر ڈاکٹر اے بی اشرف

(انقرہ، ترکی)

۱۹۸۵ء میں استنبول یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے ساتھ اردو چیئر کو منسلک کیا گیا تو چیئر پر حکومت پاکستان کی طرف سے پاکستان کے نامور محقق، مورخ، نقاد، ماہرِ تعلیم اور اورینٹل کالج کے معروف استاد پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کو تعینات کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف پنجاب یونیورسٹی کی ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ استنبول یونیورسٹی سے وابستگی کے بعد انھوں نے اردو کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے متعارف کرایا اور ریسرچ سکالر بھی ان کی مساعی سے شعبۂ السنۂ شرقیہ کے ساتھ وابستہ ہوئے۔ اُن میں سے ایک جناب خلیل طوق اُر اور دوسری زینب اوزون تھیں۔ اور یوں گویا اردو زبان و ادب کی تاسیس کلیۂ السنۂ شرقیہ میں رکھی گئی۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار پانچ سال تک اسی شعبے سے وابستہ رہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ خلیل طوق اُر کی دریافت ہے۔ خلیل طوق اُر بطور ریسرچ سکالر اس شعبے سے منسلک ہوئے اور اب وہ صدر شعبہ ہو چکے ہیں۔ میرا تقرّر رانقرہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں حکومت پاکستان کی طرف سے ۱۹۸۸ء میں ہوا۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اورینٹل کالج میں میرے استاد رہ چکے تھے۔ پھر ہم شام کے وقت کالج گراؤنڈ میں اکٹھے بیڈمنٹن بھی کھیلتے تھے۔ عربی شعبے کے ذوالفقار صاحب (جو بعد میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے وائس چانسلر بھی رہے) بھی کھیل میں شامل ہوتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار سے مجھے خاص اُنس اور تعلق خاطر تھا۔

جب مَیں انقرہ یونیورسٹی میں آیا تو ہر دوسرے ہفتے استنبول جاتا اور ڈاکٹر صاحب کے یہاں قیام کرتا۔ استنبول پہنچتے ہی ان کے شعبے میں جاتا جہاں وہ علمی و ادبی سرگرمیوں میں مشغول ہوتے۔ وہاں پہلی بار میرا تعارف نوجوان ریسرچ سکالر خلیل طوق اُر اور زینب اوزون کے ساتھ ہوا، جن کو وہ درس بھی دیتے تھے۔ خلیل طوق اُر سے ملاقات سے پہلے ہی مَیں ان سے غائبانہ طور پر متعارف ہو چکا تھا کیونکہ ڈاکٹر صاحب ہر موقع پر ان کی بے حد تعریف کرتے تھے۔ نہ صرف ان کی شرافت اور اخلاق کی، بلکہ ان کی ذہانت، علم دوستی، اردو زبان و ادب سے بے پناہ شغف اور انہماک کی بھی۔

پہلی ملاقات ان سے یوں ہوئی کہ مَیں ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں ان کے پاس بیٹھا تھا کہ خلیل طوق اُر کچھ پوچھنے کے لیے ان کے پاس آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کا تعارف یوں کرایا: ''اشرف صاحب! یہ ہیں ہمارے ہونہار شاگرد عزیز خلیل طوق اُر، جن کا تقرّر بطور ریسرچ سکالر شعبے میں ہوا ہے۔''

گورا چٹا حسین نوجوان ترک سکالر بڑے ادب سے ملا اور پاس رکھی ہوئی کرسی پر مؤدب ہو کر بیٹھ گیا۔ مسائل ادب پر بات ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے بھی اس گفتگو میں شامل کر لیا۔ خلیل طوق اُر بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنتا رہا۔ درمیان میں کہیں کہیں استفسار بھی کرتا۔ بعض مسائل میں اُس نے ترکی زبان و ادب کا حوالہ بھی دیا جو ہمارے لیے دلچسپی کا سبب بنا۔ پھر بات تحریک خلافت کی چلی۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ خاص موضوع رہا ہے۔ ترکی کی تحریک حریّت میں مصطفیٰ کمال پاشا کے کارناموں کی بات بھی ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کی معلومات اس سلسلے میں بہت زیادہ تھیں۔ مَیں تو ابھی نیا نیا ترکی آیا تھا اور اس سلسلے میں مجھے بھی زیادہ مطالعے کا موقع نہیں ملا تھا۔ بہرحال یہ محفل بہت پُر لطف رہی۔

جب ہم گھر آئے تو ڈاکٹر صاحب نے خلیل طوق اُر کا پھر ذکر چھیڑا اور فرمایا کی ''یہ نوجوان اِس لائق ہے کہ اسے شعبۂ اردو کو چلانے کی ذمہ داری سونپی جاسکتی ہے۔ میری کوشش یہ ہوگی کہ وہ پی ایچ ڈی کر لے اور اردو شعبے میں استاد لگ جائے۔'' ۱۹۹۰ میں ڈاکٹر صاحب کو واپس بلا لیا گیا۔ اُس وقت تک نہ تو خلیل طوق اُر پی ایچ ڈی میں رجسٹرڈ ہوئے اور نہ ہی باقاعدہ استاد بنے لیکن بعد میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی دونوں پیش گوئیاں درست ثابت ہوئیں۔ خلیل طوق اُر نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی اور شعبہ اردو کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔ ڈاکٹر خلیل طوق اُر ۳ اپریل ۱۹۶۷ء کو استنبول میں باقرکوئے (Bakirköy) کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم صلاح الدین دواسازی کے پیشے سے منسلک رہے اور اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ ان کی والدہ محترمہ گلمسر چند سال پہلے وفات پا گئیں۔ ابھی خلیل طوق اُر پانچ برس کے تھے کہ ان کا خاندان بحر اسود کے کنارے واقع ایک چھوٹے سے شہر ظونغولداق (Zonguldak) میں منتقل ہو گیا۔ پرائمری، مڈل اور ہائی سکول کی تعلیم یہیں مکمل ہوئی۔ والدین ان کو انجینئر بنانا چاہتے تھے لیکن ان کا اپنا رجحان زبان و ادبیات کی طرف تھا۔ چنانچہ انھوں نے استنبول یونورسٹی کلیہ السنہ شرقیہ کے شعبہ زبان و ادب فارسی میں داخلہ لے لیا اور ان کی فیملی دوبارہ استنبول میں لوٹ آئی۔

اسی دوران میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اس فیکلٹی سے وابستہ ہوئے۔ فارسی کے ساتھ ساتھ خلیل طوق اُر اردو درس میں بھی شامل ہونے لگے۔ ۱۹۸۹ء میں گریجویٹ ہوئے اور ۱۹۹۰ء میں ان کا تقرر بطور اسسٹنٹ شعبۂ زبان و ادبیات فارسی میں ہو گیا۔ ۱۹۹۲ء میں انھوں نے ایم اے کیا۔ ایم اے میں انھوں نے جو مقالہ قلم بند کیا اس کا عنوان تھا ''مرزا اسداللہ خان غالب۔ حیات اور کارنامے''۔

ایم اے کرنے کے فوراً بعد انھوں نے پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا۔ کورس

ورک کی تکمیل کے بعد اپنے لیے جو موضوع منتخب کیا اس میں فارسی اور اردو دونوں کا تعلق بنتا تھا۔ موضوع تھا ''ہندوستان میں فارسی اور اردو شاعری اور بہادر شاہ ظفر کے عہد کے شعراء''۔ خلیل طوق اُر نے بڑے ذوق وشوق سے اس موضوع پر ریسرچ شروع کی۔ وہ مہینے میں ایک بار میرے پاس انقرہ ضرور آتے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار واپس پاکستان جا چکے تھے اور خلیل طوق اُر کے گائڈ فارسی کے ایک استاد تھے جو اردو سے نابلد تھے۔ اس لیے اردو میں رہنمائی کے لیے خلیل میرے پاس آتے۔ پورا دن میرے ساتھ گزارتے اور شام کو واپس استنبول چلے جاتے اور یوں انھوں نے اپنا مقالہ مکمل کیا اور انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی۔ ان کی جیوری میں مَیں بھی شامل تھا۔ گویا ان کو فضلیت کی ڈگری دینے اور فرغل پہنانے والوں میں مَیں باقاعدہ شریک تھا۔ اور پھر جب بطور اسسٹنٹ پروفیسر ان کا تقرّر عمل میں لایا گیا تو اُس وقت بھی مَیں ان کی جیوری میں شامل تھا۔

اگرچہ مَیں نے ڈاکٹر خلیل طوق اُر کو اُس طرح درس نہیں دیا جیسے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب نے لیکن انھوں نے ہمیشہ مجھے اپنے استاد کا درجہ دیا۔ خطوط میں بھی استادِ محترم لکھ کر مخاطب ہوتے ہیں۔ یہ ان کی سعادت مندی اور بلند اخلاقی کا بیّن ثبوت ہے۔

پھر یوں ہوا کہ وہ پاکستان گئے اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے انھیں اپنا داماد بنالیا۔ گویا استاد شاگرد کا رشتہ اب باپ بیٹے میں بدل گیا۔ عزیزہ ثمینہ اب ثمینہ خلیل طوق اُر بن چکی ہیں۔ میری طرح اُسے بھی ترکی کی شہریت مل چکی ہے۔ ان کی شادی کے بعد مَیں جب بھی استنبول گیا خلیل کے گھر ثمینہ بیٹی کے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانے کھائے جو پاکستانی اور ترکی دسترخواں کا امتزاج پیش کرتے ہیں۔ ترکی پاکستان دوستی کا یہ خوشگوار امتزاج ایک اور نتیجے پر منتج ہوا۔ ڈاکٹر خلیل اردو اور پنجابی یوں بولتے ہیں جیسے پاکستانی اور ثمینہ اپنی ساس اور سُسر کے اثر سے ترکی زبان یوں بولتی ہیں جیسے ترک۔ اب ان کی بہت پیاری بچّی ماہم نور دونوں تینوں زبانوں میں بات کرسکتی ہے اور ۱۱ دسمبر ۲۰۰۷ء کو اُن کا بیٹا محمد طغرل پیدا ہوا۔

ڈاکٹر خلیل طوق اُر کو ۲۰۰۱ء میں ایسوسی ایٹ پروفیسر اور ۲۰۰۶ء میں فُل پروفیسر کے طور پر ترقی ملی۔ ان کی مساعی سے استنبول یونیورسٹی میں شعبہ اردو قائم ہوا اور وہ اس کے سربراہ مقرر ہوئے۔ اُسی سال سے شعبے میں اردو طالب علموں کا داخلہ ہو رہا ہے۔ تدریس کی ذمہ داری ڈاکٹر خلیل طوق اُر کے علاوہ ایک اور ترک استاد پر ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے جانے کے بعد اردو چیئر بند ہوگئی اور جب بحال ہوئی تو بدقسمتی سے اس پر ایسے لوگوں کو تعینات کیا گیا جو اردو زبان وادب کے استاد ہی نہ تھے۔ بلاشبہ استنبول اور انقرہ کی چیئر کا نام اردو اینڈ پاکستان سٹڈیز چیئر ہے لیکن عملی طور پر اس چیئر پر فائز ہونے والے سکالر اردو زبان وادب کی تدریس کرتے ہیں۔ پاکستان سٹڈیز کی تدریس ترک استاد ہی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ پاکستانی اساتذہ ترکی زبان پر اتنی قدرت پیدا نہیں کر سکتے کہ وہ مطالعہ پاکستان کے درسوں میں لیکچر دے سکیں۔ چنانچہ یہ چیئر پھر بند ہوگئی۔ اس سال ڈاکٹر خلیل طوق اُرکی کوشش سے ڈاکٹریٹ کے لیے ایک ریسرچ سکالر کا داخلہ ہوا ہے اور شعبے میں اردو طالب علموں کی تعداد بھی خاصی بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ وہاں اردو چیئر کو بحال کرنے اور اس پر کسی پاکستانی پروفیسر اردو کو تعینات کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

ڈاکٹر خلیل طوق اُر صحیح معنوں میں ایک سکالر، معلّم، مترجم، نقّاد اور محقّق ہیں۔ اپنی علمی وادبی سرگرمیوں کی بدولت بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ترکی کے علاوہ برطانیہ اور پاکستان میں منعقد ہونے والی کانفرنسوں میں شرکت کر چکے ہیں اور وہاں مقالات بھی پیش کر چکے ہیں۔ ترکی زبان تو ان کی مادری زبان ہے اردو، فارسی اور انگریزی پر بھی ان کو دسترس حاصل ہے۔ ترکی کے علاوہ اردو اور انگریزی زبان میں لکھے گئے ان کے بے شمار مقالات ومضامین ترکی، پاکستان اور برطانیہ کے جریدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر خلیل طوق اُر کی تصنیفات اور مقالات کی فہرست کافی طویل ہے۔ ۱۹۹۵ء میں انھوں نے اردو گرائمر کی ابتدائی کتاب حصہ اوّل لکھی جو استنبول سے شائع ہوئی۔ اس کتابچے میں انھوں نے اردو پڑھنے والے ترک طالب علموں کے لیے گرائمر کی ابتدائی معلومات فراہم کر دی ہیں۔

ان کی دوسری کتاب جو ۱۹۹۹ء میں استنبول سے شائع ہوئی علامہ اقبال کی شاعری کے انتخاب پر مشتمل ہے اور یہ کتاب ترکی زبان میں ہے۔ اُسی سال ان کی ایک اور کتاب ''سلک السلوک'' جو ضیاء الدین نخشبی کی تصوف پر کتاب کا ترجمہ ہے، شائع ہوئی۔ ۲۰۰۰ء میں ان کی کتاب ''پاک و ہند کی کہانیاں'' ترکی زبان میں شائع ہوئی۔ یہ دراصل اردو مختصر افسانوں کا ترجمہ ہے۔ انھوں نے منشی پریم چند سے لیکر دور جدید تک کے اردو افسانہ نگاروں کی منتخب کہانیوں کا ترجمہ ترکی زبان میں کیا ہے۔ ترکی زبان میں ایک اور کتاب دریوش عثمان کی گلشن عباد بھی شائع کرائی۔

۲۰۰۱ء میں انھوں نے ڈاکٹر محمد اقبال کی کتاب '' Stray Reflections'' کا ترجمہ استنبول سے شائع کرایا۔ اس سے اگلے سال انھوں نے ''جاوید نامہ'' کا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ بھی استنبول سے طبع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی خطوط اقبال کا ترجمہ بھی شائع کرایا۔

۲۰۰۳ء میں انھوں نے ترکمانستان کے صدر کی کتاب ''روح نامہ'' کا ترجمہ کیا جو ترکمانستان کے صدر مقام عشق آباد سے شائع ہوا۔ اسی سال ان کی شاعری کا مجموعہ ''ایک قطرہ آنسو'' بزم تخلیق ادب کراچی پاکستان سے شائع ہوا۔ ''اقبال اور ترک۔ ایک تحقیقی جائزہ'' بزبان اردو لاہور میں زیر طبع ہے۔ ان علمی و ادبی تصنیفات کے علاوہ انھوں نے کشمیر کے مسائل پر ایک کتاب مرتّب کی ہے

جو انگریزی اور ترکی دونوں زبانوں میں لکھے گئے مقالات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں ترک، پاکستانی اور ہندوستانی علماء کے مضامین شامل ہیں جو کشمیر کے موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ اس میں ڈاکٹر خلیل طوق اُر کا مقالہ بھی شامل ہے۔

ان تصنیفات و تالیفات کے علاوہ انھوں نے ترکی زبان میں کم و بیش دو درجن مقالات اور اردو اور انگریزی میں تقریباً ایک سو سے زائد مضامین قلمبند کئے ہیں جو سب کے سب مختلف جریدوں میں چھپ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ترکی کے مختلف انسکلو پیڈیا کے لیے علی ہمدانی، مومن خاں مومن، میر تقی میر، ناسخ، حضرت محمد ﷺ اردو ادب میں، اردو مثنوی، پنجابی زبان، پشتو زبان وغیرہ جیسے عنوانات پر مقالات لکھ چکے ہیں جو ان قاموسوں میں شامل ہیں۔

انٹرنیشنل علامہ اقبال کانفرنس منعقدہ لاہور ۱۹۹۸ء، انٹرنیشنل ملٹیم اردو کانفرنس لندن (۲۰۰۲ء)، کراچی یونورسٹی میں منعقدہ سمینار ۲۰۰۳ء اور کشمیر سمپوزین انقرہ ۲۰۰۴ء میں شرکت کر کے مقالات پیش کر چکے ہیں۔ اورینٹل سٹڈیز انقرہ یونیورسٹی کے ریسرچ جنرل ''نسخہ'' کے مشاورتی بورڈ کے ممبر ہیں۔ ۲۰۰۰ء میں انھیں یورپین اردو رائٹرز سوسائٹی لندن کی طرف سے علامہ اقبال ایوارڈ دیا گیا اور ترکی پاکستان ایسوسی ایشن انقرہ کی طرف سے کشمیر سمپوزیم میں مقالہ پیش کرنے پر انھیں شیلڈ سے نوازا گیا۔

ان کے تحریر کردہ مقالات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے موضوعات میں خاصا تنوع پایا جاتا ہے۔ ان کے موضوعات میں شاعری، افسانہ، سفرنامہ، اقبالیات، غالبیات، شخصیات، صحافت اور سیاست سب شامل ہیں۔ جہاں انھوں نے بے شمار اردو افسانہ نگاروں اور ان کی اہم کہانیوں کو ترکی زبان میں متعارف کرایا ہے وہاں محمد فواد کو پرولو، جناب شہاب الدین، ضیاء پاشا، نامک کمال، رضا زادے محمود اکرم، عبدالحق حامد طارخاں، نگار خانم، علی اکرم بولائر، تعفیق فکرت، نجیب فاضل، عزیز نسین، کمال بلبا شار جیسے ترک عالموں، ادیبوں اور افسانہ نگاروں کو اردو میں متعارف کرایا۔

کشمیر کے موضوع پر نہ صرف کتاب مرتب کی ہے بلکہ کئی ایک مقالات خود قلم بند کئے ہیں اور کئی ایک مقالات کے ترجمے بھی ترکی زبان میں کئے ہیں۔ یہ ان کی پاکستان دوستی کا بیّن ثبوت ہے۔ اقبال کے شیدائی ہیں۔ اقبال کی شاعری، خطوط اور مختلف تحریروں کو ترکی زبان میں منتقل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ اقبالیات کے موضوع پر کم و بیش ایک درجن مقالات قلم بند کر چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال اور مسئلہ کشمیر کو ترکی میں متعارف کرانے والوں میں ڈاکٹر خلیل طوق اُر پیش پیش ہیں۔

ڈاکٹر خلیل طوق اُر محض ایک نقاد، محقق، مترجم اور مقالہ نگار ہی نہیں ان میں تخلیقی صلاحیتیں بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ان کے سینے میں ایک شاعر کا دل دھڑکتا ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام ''ایک قطرہ آنسو'' کا مطالعہ کیا جائے تو اُس میں لطیف جذبات و احساسات کا پرتو ملتا ہے۔ ان کی نظمیں ترکی مزاج شاعری کے زیادہ قریب ہیں۔ اردو شاعری کا مزاج غزل سے متعین ہوتا ہے جس میں ردیف قافیے کی پابندی اور اوزان کی ترتیب ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اردو نظم نے بھی وہی مزاج اپنایا لیکن ترکی شاعری نے بہت عرصہ پہلے غزل کی روش کو ترک کر کے فرانسیسی اور انگریزی شاعری کے مزاج پر بلینک ورس اور غیر پابند شاعری کو اپنا لیا۔ چنانچہ ناظم حکمت کی شاعری اس کی مثال بن گئی۔ ناظم حکمت سے پہلے اور خود اُس کے دور کے اکثر شعراء کلاسیکل اسالیب کو اپنائے ہوئے تھے۔ نامک کمال، عبدالحق حامد، توفیق فکرت، ضیا گوک الپ، محمد عاکف ارصوئے سب کے سب روایتی اسلوب میں شاعری کر رہے تھے۔ خلیل طوق اُر نے ان سب کو پڑھا ہے اور ان میں سے بیشتر کو ترجمہ کر کے اردو دنیا کو متعارف بھی کرایا ہے لیکن شاعری میں وہ ناظم حکمت کی روش کو اپنائے ہوئے ہیں جس نے ان کلاسیکل شعراء کے برعکس اور کلاسیکل پس منظر میں اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی تھی۔

ناظم حکمت نے اُس وقت آزاد شاعری (free verse) کو مقبول بنایا جبکہ اُس کی روایت ترکی شاعری میں نہ تھی۔ اُس نے موضوع و معنی کے ساتھ ساتھ ہیئت اور فارم میں بھی زبردست تبدیلی پیدا کی۔ اُس نے ایک منفرد ردف اپنی شاعری میں پیدا کیا اور سطروں کو چھوٹا بڑا کیا، خوبصورت علامتیں، منفرد امیجری کا استعمال کیا۔ خلیل طوق اُر کی شاعری بھی اُس انداز کی ہے۔ یہاں تک کہ حمد و ثنا پر مشتمل نظم میں بھی وہی اسلوب اختیار کیا۔ مَیں جانتا ہوں کہ خلیل طوق اُر اپنے نظریات اور موضوع و معنی کے اعتبار سے ناظم حکمت سے اختلاف رکھتے ہیں لیکن شاعری کے اسلوب کے لحاظ سے ان سے متاثر ہیں۔ چنانچہ اپنی اردو شاعری میں بھی انھوں نے یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔ مثلاً یہ نظم دیکھئے:

افق پہ جاری ہے بے صدا جنگ
سیاہ و سفید کی
پیش قدمی کر رہی ہے سویرے کی فوج
لشکر تاریکی پیچھے ہٹتا ہے
خط میانی پہ قابض ہے
سیسے کا رنگ لئے ہوئے مدہوش سرخی
بلاوا آ رہا ہے کہ وقت فجر ہے
خواب غفلت سے اُٹھنے کی فرصت ہے
پر
رات چھائی ہے ملک تن کے اندر،
دارالخلافت پہ لہراتا ہے

اندھیرا اپنا پرچم،
کوئی خلش، کوئی رنجش
کوئی پرسش ہے؟
نہیں۔۔۔کوئی نہیں!
اوڑھا ہوا ہوں مَیں لحاف ہستی
اپنے سر پہ
سونے کی کوشش ہے مجھے
عین بیداری میں!

اُن کی نظم ''ایک قطرہ آنسو'' دیکھئے:

ایک قطرہ آنسو جو تم پر برسنے کی خاطر
تڑپ رہا تھا
اُسے روک لیا میں نے!
تا کہ
آرام جو اس کے ٹپکنے سے ملنا ہے
دل کو نہ ملے!
تا کہ
اس کے محبوس رہنے سے تن میں
آندھی طوفان آجائے!
تا کہ
نہ بہنے کے سبب جگر کی دیواریں
ٹوٹ پڑیں!
تا کہ
توڑ دے میری روح
یہ جسمی پنجرہ!
تا کہ
ختم ہوں یہ فاصلے
مٹ جائے یہ دوری!

اس نظم کا اسلوب اور اس کی ہیئت ناظم حکمت کی نظموں جیسی ہے۔ فرق یہ ہے کہ آخری ٹکڑے میں خلیل نے اسے تصوّف کا رنگ دے دیا ہے جبکہ ناظم حکمت ہوتا تو اسے انقلابی رنگ دے دیتا۔ اس وقت میرا موضوع خلیل کی شاعری نہیں لیکن بتانا یہ مقصود ہے کہ ایک ترک کا اردو میں سوچنا اور اس سوچ کو اردو زبان میں نظم کرنا بڑی بات ہے۔ ''ایک قطرہ آنسو'' کا مطالعہ کریں تو آپ کو بہت سی نظمیں متاثر کریں گی اور اگر آپ کو نہ بتایا جائے کہ اس مجموعے کا خالق ترک ہے تو آپ پہچان بھی نہ سکیں کہ ان نظموں کو تخلیق کرنے والا اہل زبان نہیں۔ انھوں نے اطہر راز مرحوم کی ایک نظم ''Journey into my existence'' کا ترکی زبان میں منظوم ترجمہ کیا ہے جو ایک ڈائری ۲۰۰۰ میں شامل ہے۔

کہتے ہیں نا کام شاعر نقاد بن جاتا ہے۔ خلیل طوق اُر پر یہ بات صادق نہیں آتی۔ وہ ایک کامیاب تخلیق کار بھی ہیں اور کامیاب نقاد اور محقق بھی۔

ڈاکٹر خلیل طوق اُرا بھی جوان ہیں۔ اب بیالیس سال کے ہیں لیکن اس نوعمری میں انھوں نے شہرت اور ترقی کی وہ منازل طے کر لی ہیں جو بیشتر لوگوں کو بڑھاپے میں جا کر نصیب ہوتی ہیں۔ اس میں ان کا خلوص، محنت، لگن، مستقل مزاجی، شرافت اور نیک دلی سب کچھ شامل ہے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے طے کر لیا۔ لیکن اب بھی وہ اپنے آپ کو بڑے حوصلے کے ساتھ سمجھاتے ہیں۔ چلے چلو کہ منزل ابھی نہیں آئی۔

وقتِ مقررہ پر ڈاکٹر صاحب شعبہ میں تشریف لائے، کچھ شخصیت میں ایسا رعب تھا اور کچھ مہمان کی زبان سے ناواقفیت کی شرمندگی کہ ہم دنگ کھڑے رہ گئے۔ پھر ڈاکٹر صاحب کے صدر شعبہ ہونے کی اطلاع پر تصور میں جو ایک ادھیڑ عمر یا بزرگ سی شخصیت کا خاکہ تھا، وہ بھی ٹوٹ گیا۔ ۳۵، ۳۶ کا سن، اونچے لمبے کوئی چھ فٹ کا قد، سرخ وسفید، انتہائی وجیہہ، اسمارٹ، سنجیدہ اور بردبار، چہرے پر نہایت متانت آمیز اور پرشفقت سی مسکراہٹ اور جب انہوں نے سلام کے بعد انتہائی شستہ اور سلجھی سنوری اردو میں مزاج پرسی کی تو حیرت آمیز خوشگوار مسرت نے ہماری صبح کی پریشانی پر غلبہ پالیا۔ ترکی وجود میں زبانِ اردو بہت زیادہ عجوبہ تو نہ تھی کہ ترکوں اور اردو کا رشتہ قدیم ہے۔ بلکہ لفظ اردو تو ہے ہی ترکی زبان کا مگر یہ اردو ڈاکٹر خلیل کی زبان سے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اردو کی خوبصورتی اور معصومیت پر اعتبار آرہا تھا۔ انہوں نے اپنا پورا لیکچر اردو میں دیا اور سامعین کے دلوں کو موہ لیا۔ ان کے لیکچر کا عنوان ''عثمانی ترکوں اور ہندوستانی مسلمانوں کے تعلقات، عہد بہ عہد'' تھا۔ انہوں نے اپنے اس مقالے کو نہایت شستہ اور علمی زبان میں پیش کر کے نہ صرف طالب علموں کو بلکہ موجود اساتذہ کو بھی مبہوت کر دیا۔ لیکچر کے بعد دورانِ طعام تبادلہ خیال بھی ہوتا رہا مگر اب یہ گراں نہ تھا بلکہ انتہائی دلچسپی کا باعث، دوران گفتگو نہ صرف ڈاکٹر خلیل کی اردو کے جوہر نکلتے رہے بلکہ ان کی شخصیت کا سحر بھی بڑھتا گیا۔

ڈاکٹر زیبا افتخار
(کراچی)

ترکی کے افق پر ایک درخشاں ستارہ

رئیس الدین رئیسؔ (علی گڑھ، بھارت)

جدّت ندرت تنوع اختراع نادرہ کاری بے مثالیت بے نظیریت بانکپن اور انوکھے پن کے عاشق وشیدائی آرزومند وتمنائی اور طالب وطلب گار اس دنیا میں کم ہی پائے جاتے ہیں جب کہ کثرت ان ہی لوگوں کی ہے جو روایت کہنہ کے فرسودۂ بوسیدہ لباس میں ملبوس ہر اُس راستے پر لکیر کے فقیر کی طرح چل پڑتے ہیں جس پر انہیں بھیڑ نظر آتی ہے۔ ایسے لوگوں کے اعمال وافعال پر چونکہ ان کے مطمحِ نظر موقف نقطۂ نگاہ منشور اور نظریے کی چھاپ نہیں ہوتی اس لئے ان کی تخلیق پر فرسودگی وکہنگی کی چھائی ہوئی دھند اُسے دل ونگاہ میں جگہ بنانے کے لائق نہیں چھوڑتی اور معیار ووقار کی بلندیاں اور روشنیاں بڑی اجنبیت وبے گانہ وشی کے ساتھ ان سے کترا کر اور دامن بچا کر گزر جاتی ہیں۔ ایسے لوگوں کے برعکس چند ہی جیالے اور متوالے ایسے ہوتے ہیں جن میں نیا نیا اپنانے اور نیا نیا کرنے کی للک ہوتی ہے۔ یورپ کے معروف شاعر کولرِج بوقت سیر وتفریح سیدھے راستے پر چلنے کے بجائے ٹیڑھے میڑھے اور بل کھائے ہوئے راستوں پر لہرا لہرا کے چلنے کو اپنے تشخص کی انفرادیت سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ شاعری میں بھی ندرت وتنوع سے کام لے کر انہوں نے نیا راستہ از خود نکالا تھا۔ روسی ادیبہ وشاعرہ لُدمیلا کی انفرادیت اس بات میں مضمر ہے کہ انہوں نے اردو ادب میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اسی طرح لندن یونی ورسٹی کے پروفیسر ڈیوڈ میتھوز کا کارنامہ یہ ہے کہ انہیں پچیس تیس زبانوں پر جن میں اردو بھی شامل ہے کما حقہ طور پر دسترس حاصل رہی اور اردو ادب کو انہوں نے اتنا کچھ دیا کہ ادب کے سر کا تاج بن گئے۔ عصمت چغتائی اور ساحر لدھیانوی کو ان کی صحبت حاصل رہی۔ ہندوستانی ہوٹلوں کے بیرے ان سے انگریزی بولتے تھے اور جب وہ انتہائی شائستہ اردو میں ان کی بات کا جواب دیتے تو ایک انگریز کو ایسی فصیح اردو بولتے دیکھ کر بیرے اس قدر حیرت زدہ ہو جاتے کہ ان کے ہاتھ سے کھانے کی ٹرے چھوٹ جاتی۔

خلیل طوقار بھی ترکی کے ایک ایسے ہی انگریز نما سرخ وسفید نوجوان شاعر ہیں۔ خلیل کی انفرادیت اور اختصاص یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ ترکی پر یورپی اثرات کما حقہ طور پر عکس ریز ہیں اور وہاں کی قومی زبان ترکی ہے انہوں نے ادبی سطح پر تخلیق کے لئے اردو ادب سے اپنا رشتہ استوار ومستحکم کیا ہے۔ انہیں انگریزی اردو فارسی اور پنجابی زبانوں پر مکمل طور پر ملکہ حاصل ہے۔ ۲۰۰۳ء میں ان کا اولیں شعری مجموعہ بعنوان ''ایک قطرہ آنسو'' کراچی سے شائع ہو کر سند قبولیت حاصل کر چکا ہے۔ ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''آخری فریاد'' ۲۰۰۷ء میں چند ماہ قبل ہی منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہوا ہے اور وہ بھی ارباب علم ودانش اور حلقہ شائقین میں پذیرائی سے ہم کنار ہو رہا ہے۔ انہوں نے اپنی اس رنگیں سرورق سے آراستہ مجلد اور دیدہ زیب ودلآویز کتاب میں حمد نعت غزلوں قطعوں اور نثری نظموں کو شمولیت دی ہے۔ ہر شاعر کو کسی ایک ہی صنف میں افتخار وامتیاز حاصل ہوتا ہے لیکن یہ فارمولہ طوقار پر صادق نہیں آتا۔ ان کے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ غزل کے بڑے شاعر ہیں یا نظم کے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انہوں نے دونوں ہی اصناف میں اپنے فن کو بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔ جہاں تک غزل کا تعلق ہے غزل خود بھی ایسی مقبول وممتاز صنف سخن ہے جو اپنے ایجاز واختصار اشارہ کنایہ رمز وایما اور علائم تلمیح کے سبب دنیا بھر کی اصناف میں اپنا الگ ہی تشخص الگ ہی شناخت اور الگ ہی اختصاص وامتیاز رکھتی ہے اور دریا کو کوزے میں مقید کرنے کا فن بھی اسی کے حصے میں آیا ہے اگر شاعر زبان وبیان پر قدرت رکھتا ہے صرف ونحو کا پابند ہے لفظی نظام کی باریکیاں سمجھتا ہے عصری ماحول پر نظر ہے خیالات وافکار شعور آگہی سے متصف ہے اور ذات وکائنات کے فلسفے سے اگر وابستگی رکھتا ہے تو ایسا شاعر غزل کی دنیا میں اپنے نام کا سکہ بخوبی بٹھا سکتا ہے۔ خلیل طوقار خوش نصیب ہیں کہ انہیں نہ صرف زبان وبیان اور عروض پر کماحقہٗ عبور حاصل ہے بلکہ ان کے پاس وہ دور رس نگاہ بھی ہے جسے مظاہر کائنات حیاتیات معاشرے کے رجحانات وتغیرات میلانات وتصادمات تضادات وحسیات افکار وخیالات واقعات وحادثات جذبات و واردات اور خیالات ونظریات تک بھی رسائی حاصل ہے اور وہ بھی مذہب فلسفہ تصوف اور سائنس سے آشنا ہونے کے ساتھ ذات وکائنات کے اسرار اور انسانی نفسیات کی گتھیوں اور پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لئے درک وآگہی بھی رکھتے ہیں۔ طوقار کا فطری جھکاؤ چونکہ مذہب وتصوف کی طرف ہے اس لئے ان کی شاعری بھی حیات وکائنات کے اسرار کی نقاب کشائی کی کوشش میں سرگرداں نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی ان کی شاعری جزو پیغمبری کا نمونہ بن کر بھی سامنے آتی ہے اور کبھی کبھی ان کے اشعار کی صوفیانہ روشنی میں رومیؔ خسروؔ اور شمسؔ تبریز کے چہرے جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔ طوقار کی غزلوں کے فانوس سے طرح طرح کے نظر افروز اور دل آویز رنگ جھلکتے ہیں۔ انھوں نے جمالیاتی افکار وخیالات اور عشق وعاشقی کے موضوعات و مضامین کو بھی شعری اظہار کے سانچے میں ڈھالا ہے اور معاصر معاشرے اور ماحول پُر آشوب زندگی کی ناہمواریت نشیب وفراز تغیرات وتصادمات واقعات وحادثات اور گوناگوں مسائل کو بھی شعری قالب میں جگہ دی ہے۔ بقول شخصے شعر ہو یا افسانہ اس کا دلچسپ ہونا شرط اول ہے۔ دلچسپی کے بغیر فن بے جان مورت بن کر رہ جاتا ہے اس لئے جمالیاتی افکار وخیالات اور جذبات واحساسات شاعری کے لئے اسی قدر اہم ہیں جتنے کہ کل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خلیل طوقار نے بھی حسن وجمال اور عشق عاشقی کے اشعار میں جذبات واحساسات اور قلبی

واردات وکیفیات کی اثر انگیز تصویر کشی کی ہے۔انھوں نے عام اور سطحی قسم کے عشقیہ محرکات سے گریز کیا ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ عشق ایک ازلی اور فطری جذبہ ہے جو کم وبیش سبھی کے دل میں موجزن رہتا ہے اور انھیں یہ بھی علم ہے کہ عشق کی تہذیب کے آگے دنیا کی تمام تہذیبیں ہیچ ہیں۔عشق حقیقی نہ ہو کر اگر مجازی بھی ہو تو بھی مائلِ حسن ضرور ہوتا ہے اور دنیا میں جو بھی حسن موجود ہے وہ خدا کا عکسِ جمال ہے اور حسنِ کائنات کا منبع ومخرج سوائے خدا کی ذات کے کوئی دوسرا نہیں ہے۔اس لئے طوقار کے اشعار میں اعلیٰ جمالیاتی مذاق اور جذبات وخیالات میں طہارت وپاکیزگی کو بہر طور ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔عشق متعدد ومتضاد موسموں منظروں اور کیفیتوں کی دھوپ چھاؤں کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ اس موقع پر ان کی بہاریہ اور غنائی شاعری کے چند نمونے بشکل شعر ملاحظہ فرمائیں۔

چراغِ محبت بجھا کر گئے
مری زندگی کو چرا کر گئے
حقیقت طلب تھا یہ عاجز ولے
دل باوفا سے دغا کر گئے

چھپایا غم دہر قلب حزیں میں
فرشتے مری آہ سن کر نہ جاگے

تمنا کی اُلفت کی میں نے مگر
محبت کی فصلیں جلاکر گئے

اے خلیلؔ اس دلربا سے بھاگ جا کوسوں دور
رکھ دیا زندانِ حسرت میں پریشاں مجھ کو

جلا کر بستیاں دل کی جگر کا خون پیوں گا میں
نہ دیکھوں گا تری صورت نہ ہی منت کروں گا میں

طوقار بحرِ ذاتِ بیکراں میں غواصی کے عمل سے محض جمالیات کے گوہر آبدار قیمتی نگینے اور زر وجواہر ہی برآمد نہیں کرتے بلکہ وہ معاصر زندگی کے خارجی عوامل اور مسائل وسائل پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔آج کے مادی ارتقا صنعت وسائنس اور برقی میڈیا کی ترقی سے جہاں انسان کو مادی عیش وآسائش کی سہولیات میسر ہوئی ہیں وہیں ہماری روحانی دنیا بھی متزلزل ہو کر رہ گئی ہے۔ سیاسی معاشرتی معاشی علمی تہذیبی اخلاقی مذہبی ادبی اور نفسیاتی قسم کے سبھی شعبے اقدار کی شکست وریخت سے گذر کر کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں۔اس کایا پلٹ سے ہمارا سارا قابلِ ناز وافتخار تہذیبی سرمایہ تباہ ہو چکا ہے۔مہمانداری وضع داری طرح داری اور رواداری جیسے معیارات اور انسان دوستی ہمدردی سخاوت دریا دلی اور چارہ گری جیسی عظیم روحانی اور اخلاقی قدریں اپنی شکلیں مسخ کر کے مکاری وریاکاری فریب ودغا بازی عیاری ودھوکہ دھری خود آرائی وخودستائی خود پرستی وخودغرضی بے حسی ومردہ ضمیری میں متبدل ہو چکی ہیں۔کبھی نہ ختم ہونے والی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہر کوئی حصول زر اور زرگری کی اندھی دوڑ میں شامل ہو چکا ہے۔حرام وحلال کے فرق کو مٹا دیا گیا ہے۔ہر کوئی دولت کو خدا مان کر اس کی پرستش میں لگا ہوا ہے۔لہو کے رشتے اپنی آب وتاب کھو چکے ہیں۔ قول وعمل کا تضاد ذہنی خلفشار بنا ہوا ہے۔حیا کی جگہ بے حیائی نے اور طہارت وپاکیزگی کی جگہ فحاشی اور ابتذال نے لے لی ہے۔عدم تحفظ عدم مساوات اور عدم انصاف اور شعبہ جاتی بدعنوانیوں بے ضابطگیوں بے اعتدالیوں اور بے راہ رویوں نے جینا محال کیا ہوا ہے۔جھوٹ کو عزت صدارت پیش کی جارہی ہے اور سچ کی ننگی پشت پر تازیانوں کا عتاب نازل ہو رہا ہے سماجی مذہبی سیاسی تہذیبی اور ادبی وثقافتی کا کوئی شعبہ کیوں نہ ہو ہر جگہ افراتفری ہے استحصال ہے ظلم وزیادتی کا سلوک عام ہے یہاں تک کہ ادب میں بھی اجارہ داریوں اور گروہ بندیوں کی وبا بری طرح پھیلی ہوئی ہے اور بے سکونی وبدامنی ومتعصبانہ فرقہ وارانہ اور متشددانہ ماحول میں آج انسان اور انسانیت کا دم گھٹ رہا ہے۔طوقار نے بھی آج کے اس کریہہ منظر نامے کو اپنی فکر وآگہی کی نظر سے دیکھ کر ان تمام حقائق کو اپنی شاعری میں ڈھال دیا ہے اور انھیں عصری حقیقتوں اور تلخ وترش سچائیوں کی وجہ سے بلا تردد کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری عصر حاضر کی اور اکیسویں صدی کی نمائندہ وترجمان شاعری ہے۔اپنے متذکرہ دعوے کی دلیل کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ سماج کی بے راہ رویوں اور انحطاط پذیر معاشرے کی بگڑی شکل کے مظہر یہاں ان کے چند اشعار پیش کروں۔ملاحظہ ہو۔

جعلی سخاوت جعلی تجارت جعلی خطابت کرتے ہیں لوگ
دوستوں سے مکاری کر کے دوست حقیقی بنتے ہیں لوگ
جعلی مشقت جعلی ریاضت جعلی عبادت کرتے ہیں لوگ
اپنی انا سے کر کے تغافل جعلی مسلماں بنتے ہیں لوگ
جعلی غلامی جعلی جدائی جعلی درد مجازی سہتے ہیں لوگ
اصل محبت غارت کر کے جعلی تعشق کرتے ہیں
جعلی تعیش جعلی تعصب جعلی تفخر کرتے ہیں لوگ
نقلی ہو کر پردیسیوں کی جعلی زندگی جیتے ہیں لوگ

خلیل طوقار کی نثری نظمیں غور وفکر شعور وآگہی فلسفہ وتصوف حیات وکائنات ازل وابد عبد ومعبود اور حیات وممات جیسے موضوعات سے مختص ہیں ساتھ ہی دل پذیر بے نظیر اور پر تاثیر بھی ہیں۔ان کی نظموں میں موت کی خوشبو، آوارہ بادل ہوں میں، اے سمندر کے قطرو، برف کے آنسو، زلزلہ زدہ کشمیری بچّی، اور مجھے کندھا چاہئے ان کی معرکتہ الآرا نظمیں ہیں۔

☆

''خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے''

سید معراج جامی (کراچی)

کیا پتا تھا کہ میرے دوست کا کہا واقعی اس طرح پورا ہو جائے گا اور میں اس کے مذاق کا صحیح نشانہ بن جاؤں گا۔ ایک محفل میں میرا تعارف کراتے ہوئے صبیح رحمانی نے کہا: ''یہ جرائد مافیا کے سرغنہ ہیں۔'' وہ گھڑی قبولیت کی تھی۔ میرے پاس اس وقت لیوٹن، برطانیہ کا ایک رسالہ ''سفیر اردو'' تھا۔ پھر تین سال بعد لندن کا ماہنامہ ''پرواز'' بھی آ گیا اور اب استنبول کا سہ ماہی ''ارتباط'' بھی میرے انتظام وانصرام میں شائع ہو رہا ہے۔ دراصل میں شاعر کی زبان میں یہ بات کہوں تو بے جا نہیں ہوگی کہ ''میرا مزاج لڑکپن سے ''مدیرانہ'' تھا۔''

ارتباط استنبول سے شائع ہونے والا سہ ماہی ہے اور اس کے مدیر اعلیٰ ایک ترک نژاد مگر اردو زبان وادب کے ممتاز ومعتبر استاد، شاعر وادیب ڈاکٹر خلیل طوق اُر ہیں۔ ڈاکٹر خلیل سے ملاقات کو اب تقریباً پانچ سال سے ہو گئے ہیں۔ اپنی بیوی اور ایک پیاری سے بیٹی کے ساتھ لاہور جانے کے لیے پہلی بار پاکستان آئے تو کراچی سے ہوتے ہوئے گئے، میں، میری بیگم، ڈاکٹر نگار اور ان کے شوہر سجاد ظہیر صبح چار بجے ایئر پورٹ ان سے ملنے پہنچے۔ سب ان سے مل کر مسرور ہوئے اور ان کی بیگم سے مل کر شاداں۔ دو گھنٹے بعد وہ لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ واپسی میں کراچی رکے اور تین دن قیام کیا۔ یہاں مجھ پر یہ راز کھلا کہ میں ان کا بڑا بھائی ہوں۔ کیوں کہ وہ مجھے آغا بیگ کے نام سے پکارتے ہیں۔ آغا بیگ بڑے بھائی کو کہتے ہیں۔ ایک ترک کا ایک پاکستانی سے اس درجہ پیار اور اپنایت، بہت حیران کن بات ہے۔ ترکی جانے کے بعد ان کے جتنے خطوط اور میل آتے ہیں، ان سب میں، میں ان کا آغا بیگ ہوں۔ بعد میں، میں نے ان سے پاکستان کا سفر نامہ لکھوایا۔ اس میں جگہ جگہ میرے نام کی جگہ آغا بیگ کا ذکر ہے۔ میرے ایک دوست سفر نامہ پڑھ کر بولے: ''یہ ترک باشندہ کسی ایرانی یا پشتون سے اس حد تک متاثر ہو گیا کہ جگہ جگہ اس کا ذکر ہے مگر اس کے بارے میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ یہ شخص کون ہے۔'' میں کیا بتاتا، گردن ہلا کر رہ گیا۔ میں اب تک حیران بلکہ ''حریان'' ہوں کہ مجھ میں آغا بیگ کہاں چھپا ہوا ہے اور ڈاکٹر خلیل ہیں کہ مجھ میں آغا بیگ کو نکالنے پر تلے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر خلیل کی اردو زبان وادب سے دلچسپی کی داستان بہت دلچسپ ہے۔ وہ ان کے سفر نامے میں درج ہے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ قدرت جب کسی پر مہربان ہو جائے تو ایسے انوکھے واقعات جنم لیتے ہیں کہ عقل حیران ہو جاتی ہے اور یہ حیرانی یک طرفہ نہیں دو طرفہ ہوتی ہے۔ نہ تو خلیل کے وہم وگمان میں تھا کہ وہ اردو سیکھتے سیکھتے اس حد تک آگے بڑھ جائیں گے کہ سیدھے لاہور آ کر دم لیں گے اور نہ ثمینہ (خلیل کی نصف بہتر) کے ذہن کے کسی کونے میں یہ درج تھا کہ وہ بیاہ کر لاہور سے اتنی دور دوسرے ملک چلی جائے گی۔ واقعی جوڑے آسمان پر بنتے ہیں اور ایسے خوبصورت جوڑے کہ اللہ کی شان کریمی پر صدقے جانے کو دل چاہتا ہے۔

ڈاکٹر خلیل نے اردو سیکھ کر کوئی گھاٹا نہیں اٹھایا ہے وہ سراسر فائدے میں رہے ہیں۔ علمی سطح پر بھی، ادبی سطح پر بھی اور سسرالی سطح پر بھی۔ ایسے خوش نصیب بے شمار ہیں جو پوری دنیا میں بھرے ہوئے ہیں۔ وہ یقیناً اللہ کی نظر کرم کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب پر اپنی چشم کرم وار رکھے۔ آمین

ڈاکٹر خلیل کی شخصیت کے بارے میں ہر ایک نے لکھا اچھا بلکہ بہت اچھا لکھا ہے۔ واقعی ایسی مقناطیسیت رکھنے والی شخصیت کہ جس پر مردوں کو رشک آئے (یہاں میم پر زبر ہے، پیش سے نہ پڑھا جائے)۔ سعادت مند ایسے کہ اپنے چھوٹوں سے بھی مودبانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ جب پہلی بار ملے تو چہرے مہرے سے مرادنگی کے آثار برائے نام تھے، شاید کسی نے اس طرف توجہ دلائی تو دوسری بار ملنے پر دیکھا کہ کالی کالی مونچھیں چہرے پر مرادنگی کا اظہار کر رہی ہیں۔ مگر مونچھیں رکھ کر بھی ان کا شرمانا بڑا ہی پیارا لگتا ہے، سو بار دل سے قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔ دراصل یہ سب اچھی تربیت اور اچھے خاندان کے فرد ہونے کی نشانی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ خلیل پاکستانیوں کو ہی نہیں بھاتے ہیں بلکہ یہ ترکی میں بھی سب کی آنکھوں میں بسے ہوئے ہوں گے۔ خصوصاً ان کے شعبے کی صنف نازک کی پڑھائی ان کی وجہ سے خاصی متاثر ہوتی ہوگی۔ ویسے خلیل بھی زاہد خشک نہیں ہیں، مجھے سب پتا ہے کہ ان کی چشم ناز بھی خوب خوب معجز نمائیاں دکھاتی ہے مگر مجال ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر ہو۔ کیوں کہ بنیادی طور پر نہایت شریف ہیں لہٰذا صرف قدرت کے اس انمول نعمت سے جسے آنکھوں والے کہتے ہیں کہ ''بابا آنکھیں بڑی نعمت ہیں'' شکر پروردگار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ع..... حیراں ہوں کہ ان آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

آدمی کسی مہ لقا کے عشق میں شاعر بنتے ہیں مگر آپ میری بات کا یقین کر لیں کہ اردو کی محبت نے ان کو شاعر بنایا ہے۔ اب اردو ادب نے ان کو مدیر بھی بنا دیا ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے۔

میں بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں، مگر بڑے بھائی ہونے کے ناطے خلیل نے میرے لیے سارے راستے بند کر دیئے ہیں کہ ستائش باہمی اور وہ بھی دائمی یقیناً پڑھنے والوں کی آنکھوں میں کھٹکے گی۔ لہٰذا خلیل کے بارے میں میرے جذبات، محسوسات، خیالات اور مشاہدات محفوظ ہیں۔ کیوں کہ دوسروں کے بیان میں، میری ترجمانی خوب خوب ہو رہی ہے۔ میں تو خلیل کی اس جستجو اور جدوجہد کے لیے صرف یہ دعا دے سکتا ہوں کہ

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے

دوسرا مصرع خلیل کے لیے نہیں ہے کہ اس کی موجوں میں اضطراب ہی نہیں جوار بھاٹا ہے اور اسی جوار بھاٹا کا یہ کرشمہ ہے کہ ڈاکٹر خلیل اقلیم اردو میں سیلاب کی مانند در آئے ہیں جس نے پاکستان کے لوگوں کے دلوں کو سیراب کر دیا ہے۔ سیلاب تباہی تو لاتا ہے مگر یہ سیراب بھی کرتا ہے۔ ڈاکٹر خلیل تباہی نہیں لائے مگر محبت کی سیرابی سے ہم سب کو نہال کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی تمام تمنائیں پوری کرے۔ ایک تمنا تو مجھے اچھی طرح سے معلوم ہے جس کی تعداد پچاس کے قریب ہے، اللہ تعالیٰ وہ پچاس والی تمنا تو سب سے پہلے پوری کرے۔ آمین ثم آمین

باغبانِ اردو

ڈاکٹر ضیاء الحسن

(لاہور)

ڈاکٹر خلیل طوق اُرایک پاکستانی ترک ہیں۔ اگرچہ وہ نسلاً ترک ہیں لیکن اردو کی وساطت سے ان کا پاکستان سے بہت گہرا تعلق استوار ہو گیا ہے۔ یہ تعلق ثمینہ طوق اُرکی وجہ سے اور بھی گہرا ہو گیا کہ خاتونِ موصوف ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی صاحب زادی ہیں اور خلیل طوق اُر کے اردو اور پاکستان کے درمیان گہرے روابط کی ضامن ہیں۔ ڈاکٹر خلیل طوق اُرکی پاکستان سے نسبت کو مسلسل قایم رکھنے میں ان کی خواہرِ نسبتی تنویر غلام حسین کا بھی بہت اہم کردار ہے جو اس ضمن میں ان کی معاونت کرتی ہیں۔

ڈاکٹر خلیل طوق اُرترکی زبان و ادب و ثقافت اور اردو زبان ادب و ثقافت کے باہمی رابطوں کے دل سے خواہاں ہیں اور اس سلسلے میں انھوں نے ایک سہ ماہی مجلّے ''ارتباط'' کا استنبول سے اجرا کیا ہے۔ اس رسالے کی بنیادی غایت باہمی رابطوں کی تلاش و جستجو ہے اور اس کا نام بھی اسی آرزو کا آئینہ دار ہے۔ اب تک اس رسالے کے دو شمارے شایع ہو چکے ہیں جس میں ترکی کے ساتھ پاک و ہند کے اہم لکھنے والوں کے نام نمایاں ہیں۔ یہ رسالہ ابھی اشاعت کے ابتدائی مراحل میں ہے لیکن ایک وقت آئے گا کہ اس کا شمار نہ صرف اردو کے اہم رسائل میں ہوگا بلکہ پاک ترک تعلقات میں بھی یہ نہایت کلیدی کردار ادا کر سکے گا۔ اردو لکھنے والوں کو اس رسالے کی غایت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے غیر مشروط تعاون کی پیش کش کرنی چاہیے کیوں کہ اس کے پسِ منظر میں ایک نیک مقصد کارفرما ہے جو بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی نیک نامی کا باعث بھی ہو سکتا ہے اور پاکستان کے بین الاقوامی تشخص میں بھی اہم راہ نما ثابت ہو سکتا ہے۔

قبل ازیں ڈاکٹر خلیل طوق اُرنے ''اقبال اور ترک'' کے نام سے جو کتاب تصنیف کی ہے وہ بھی فی الاصل پاکستان اور ترکی کے تعلقات کی بازیافت کی ایک کوشش ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اقبال کی شاعری میں ترک قوم اور ترکی کے حوالے سے کی گئی شاعری کے ساتھ اقبال کی شاعری کی طرف ترکوں کے اندازِ نظر کو بھی پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کی ایک اور اہم کاوش ''بین الاقوامی اقبال سمپوزیم'' کا انعقاد ہے جس میں راقم الحروف کو بھی اپنا مقالہ ''اقبال کے شعری اسلوب کا ارتقا'' پیش کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس کانفرنس میں دیگر ملکوں کے مندوبین کے ساتھ ترک دانش وروں نے بھی مقالات پیش کیے جن سے اقبال کے بارے میں ترکوں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ترک جب اقبال کی شاعری کو پڑھتے ہیں تو مصور پاکستان یا قومی شاعر یا حضرت علامہ رحمتہ اللہ علیہ بھول کر انھیں ایک عظیم شاعر کے طور پر پڑھتے ہیں اور وہ انھیں کسی خاص مذہبی مسلک سے بھی جدا ہو کر دیکھتے ہیں جس کی وجہ سے اقبال کے خالص شاعرانہ مطالعے کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

ڈاکٹر خلیل طوق اُر اردو کے باقاعدہ شاعر ہیں۔ ان کی اردو شاعری کے دو مجموعے ''ایک قطرہ آنسو'' اور ''آخری فریاد'' کے نام سے شایع ہو چکے ہیں۔ ان کی شاعری دو زبانوں اور دو تہذیبوں کے تخلیقی عناصر کی یک جائی سے ظہور پذیر ہوئی ہے۔ اُن کو پڑھتے ہوئے بار بار محسوس ہوتا ہے جیسے لمحۂ تخلیق میں بھی وہ دو زبانوں کی تہذیبی سرزمینوں سے بہ یک وقت نمو پذیری کی قوت حاصل کرتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کی شاعری کی مختلف فضا قائم ہوتی ہے۔ یہ فضا کسی مترجم کی بنائی ہوئی فضا سے اس لیے مختلف ہے کہ جہاں اِس میں ترجمہ نگاری کے عناصر کارفرما ہیں، وہیں ساتھ کے ساتھ قوتِ تخلیق بھی اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ خلیل طوق اُرترک ذہن سے سوچتے ہوئے جب تخلیقی عمل سے گزرتے ہیں تو یہ تخلیقی عمل ترجمہ نگاری سے سوا ہو جاتا ہے اور ایک نئے تخلیقی تجربے کی بازیافت بن جاتا ہے۔

اب ڈاکٹر خلیل طوق اُرنے جدید ترکی شاعری کی تاریخ اردو دان طبقے کے لیے لکھی ہے۔ یہ تاریخ ویسی تاریخ نہیں ہے جیسی اردو مورّخ اردو ادب کی تاریخ لکھتے ہیں یا ترکی ادب کی تاریخیں ترکی ادب کے مورخوں نے یا کسی بھی زبان کے ادب کی تاریخیں اُن زبانوں کے ادبی مورخوں نے لکھی ہیں کیونکہ انھیں اپنے نمایندہ لکھنے والوں کے ادبی نمونوں کو نقل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی لیکن جب کوئی ادبی تاریخ دوسری زبان کے قارئین کے لیے لکھی جاتی ہے تو شعرا کے تعارف اور ادبی خصائص کے ساتھ ساتھ نمونے کے طور پر شاعری کے تراجم بھی شامل کرنے پڑتے ہیں کیوں کہ ان شعرا کی شاعری عمومی طور پر غیر زبان کے قارئین کو میسر نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر خلیل طوق اُرنے جدید ترکی شاعری کی اردو میں تاریخ لکھتے ہوئے اس امر کو پیشِ نظر رکھا ہے اور اہم جدید ترکی شاعروں کے تعارف کے ساتھ ساتھ ان کی نمایندہ شاعری کے نمونے بھی ترجمہ کر کے نذرِ قارئین کیے ہیں جس کی وجہ سے ان کے ترکی ادب کے بارے میں نقطۂ نظر کی توثیق ہوتی ہے۔ جدید ترکی شاعری کے اردو دان طبقے سے تعارف کے ضمن میں یہ پہلی مربوط کاوش ہے اور پہلی ہونے کے باوصف قابلِ قدر بھی ہے۔ ڈاکٹر خلیل طوق اُران معدودے چند ادیبوں میں سے ہیں جو دونوں زبانوں پر یکساں عبور رکھتے ہیں اور صرف یہی نہیں کہ وہ زبانوں پر عبور رکھتے ہیں بلکہ شاعر ہونے کے ناطے وہ تخلیقی تجربے سے بھی آگاہ ہیں۔ اسی لیے ان کے ترجمے محض ترجمے نہیں ہیں بلکہ تخلیقی عمل کی بازیافت بن گئے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ان کا اردو زبان کا برتاؤ اردو ادیبوں سے مختلف ہے لیکن اس انفرادیت کی وجہ سے ان ترجموں کی فضا بھی مختلف ہو گئی ہے اور ترکی محاورے اور روزمرہ سے قریب ہونے کی وجہ سے اس میں فطری حسن پیدا ہوا ہے۔

جدید ترکی شاعری کے مطالعے سے ایک دل چسپ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ترکی اور اردو کی جدید شاعری کا آغاز ایک ہی دور میں ہوا۔ اردو میں جدید نظم کی تحریک ۱۸۶۷ء میں انجمنِ پنجاب کے قیام کے ساتھ آغاز ہوئی۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے ترکی زبان کے جدید شاعروں کا انتخاب ان کی تاریخِ پیدائش کے زمانی تقدم کے اعتبار سے کیا ہے۔ پہلے شاعر ضیا پاشا ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے۔ اس اعتبار سے ان کے تخلیقی کام کا آغاز انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوا۔ یوں اردو اور ترکی زبانوں کی جدید شاعری کا زمانہ ایک ہی بنتا ہے۔ اس لحاظ سے دونوں زبانوں کے شعری سرمایے میں اختلاف کے ساتھ بعض مماثلتیں بھی ملتی ہیں۔

اردو ترکی زبانوں میں افتراق کی بنیادیں ترکوں کے مجموعی قومی مزاج اور معاشی، معاشرتی وسیاسی حالات میں اختلاف پر استوار ہیں۔ بیسویں صدی ربع اوّل دونوں ملکوں میں آزادی کی تحریکوں کی شہرت کا زمانہ ہے لیکن برصغیر میں بیش تر یہ تحریکیں جلسے جلوسوں کی صورت میں تھیں جب کہ ترکوں نے آزادی کے لیے با قاعدہ مسلح جدوجہد کی جس کی وجہ سے ان کے مزاج میں قومی تفاخر نمایاں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد ر.جان ساز ترک شاعر وہی ہیں جنھوں نے سیاست میں حصہ لیا، قومیت کی تشکیل کے لیے فعال کردار ادا کیا اور اس ضمن میں جلاوطنی اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں لیکن اردو شاعری کی زیادہ سے زیادہ خدمات یہ ہیں کہ کئی شاعر دوسری جنگ عظیم کے دوران میں انگریزی فوج میں اطلاعات کے شعبے سے منسلک رہے۔ اگر چہ قیام پاکستان کے بعد فیض اور سجاد ظہیر نے پنڈی سازش کیس کی وجہ سے قید و بند کا زمانہ گزارا، اسی طرح حبیب جالب کو بھی متعدد بار شاعری کی وجہ سے جیل جانا پڑا لیکن آہستہ آہستہ اردو شاعری اور ادیبوں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا اور خاموش ہو گئے۔ گزشتہ چند سالوں سے اردو ادیبوں نے امریکی جارحیت کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے لیکن ترکی شاعروں کا کردار زیادہ متحرک اور جان دار نظر آتا ہے، انھوں نے لکھنے کے ساتھ عملی جدوجہد بھی کی ہے۔

جدید اردو شاعری برطانیہ کے توسط سے مغربی ادب اور اس کی تحریکوں سے آشنا ہوئی جب کہ ترکی میں یہ صورت فرانس کے اثرات سے آغاز ہوئی۔ اس زمانے میں فرانسیسی ادب کے تراجم سے ان اثرات کا آغاز ہوا۔ دوسرا دور قوم پرستی کے جذبات پر مشتمل شاعری کا ہے۔ ترکی جمہوریہ کے قیام کے بعد ترکی میں جمہوریتی ادب کا آغاز ہوا جو ناظم حکمت اور ان کے ہم عصروں کے کمیونسٹ خیالات کی وجہ سے ترقی پسند یا مارکسی ادب کا درجہ اختیار کر گیا۔ ترکی میں اس کا آغاز اردو میں ترقی پسند تحریک کے متوازی ہوا۔ اس طرح اردو میں جدیدیت کی تحریک کے متوازی جدید ادب کی تحریک ملتی ہے۔

''جدید ترکی شاعری'' کا مطالعہ اردو ادیبوں کے لیے ادب سمجھنے کی بہتر فضا مہیا کرتا ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ ہم ادب کے تقابلی مطالعے کے قابل ہوتے ہیں بلکہ اردو زبان وادب میں نئی لفظیات اور نئے لہجوں کی شمولیت کی صورت بھی پیدا ہوتی ہے۔ ترکی ادب کے تراجم اور تعارف کے ضمن میں پہلے بھی تھوڑا بہت کام اردو میں مل جاتا ہے لیکن یہ کتاب اس کی بھرپور اور مربوط کاوش ہے اور اردو دان طبقے کو اس سلسلے میں ڈاکٹر خلیل طوق اُر کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ امید ہے کہ اس کی اشاعت سے اردو زبان وادب پر مثبت اثرات مرتب ہوں گے۔

بقیہ
جواں سال بزرگ

تمہاری نظر مستقبل پہ
ہونا کیا ہے، کرنا کیا ہے
تو آج بھی جی رہے ہیں
کل کی خبر ہمیں نہیں

تم برساؤ آسماں سے
چاہے گولی چاہے میزائل!
ہم ترس کر مر رہے ہیں
ایک قطرۂ آب کے لیے

('آخری فریاد' ص۔۷۶)

ہمارے ہاں سندھی میں ایک کہاوت ہے ''جیکو ہٹی میں ہوندو اہوئی ہو کوڈبو'' یعنی آدمی وہ ہی پیش کر سکتا جو اس کے پاس ہو گا۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے ڈاکٹر خلیل اس کہاوت کا عملی نمونہ ہیں کیونکہ وہ قولاً وفعلاً یک رنگی شخصیت کے مالک ہیں۔ اس سلسلے میں مزید گواہیاں راقم کو ترکی کے استنبول یونیورسٹی کے دورے دوران میسر آئیں، جہاں ڈاکٹر خلیل کی غیر موجودگی میں ان کے کردار وگفتار کے معترف نہ صرف طالبعلم بلکہ رفیق کار بھی تھے۔ جوانی میں یہ رتبہ (بزرگی کا) خوش نصیبوں کو میسر آتا ہے اور ڈاکٹر خلیل بھی ان میں سے ایک ہیں۔

☆

''پیارا ملک ہے پاکستان''

پروفیسر خالد سہیل ملک
(پشاور)

بعض احباب آج کل نثر کے غیر افسانوی سرمائے کو ادب عالیہ سے خارج قرار دینے کا اعلان کر رہے ہیں گویا ناول، افسانہ اور کسی حد تک ڈرامہ اُن احباب کی نظر میں تخلیقی اضافہ ٹھہرتی ہیں جبکہ دیگر اصنافِ نثر پر اُن کی جانب سے سوالیہ نشان سا لگا دیا گیا ہے۔ اگرچہ تشکیک کی یہ آواز بہت توانا اور بلند آہنگ نہیں مگر پھر بھی اِس تشکیک کے پس منظر پر غور از حد ضروری ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ کوئی بھی تحریر ادبِ عالیہ کا حصہ بن سکتی ہے جس میں خلوص میں رچا ہوا تخلیقی آہنگ موجود ہو اور جس میں بزبان اقبال خونِ جگر شامل ہو۔ ورنہ غالب کے انتہائی ذاتی اور شخصی خطوط قطعاً ادبِ عالیہ کا حصہ نہ بن پاتے۔ غالب کی تہذیبی شخصیت نے مکتوب کو ادب کا درجہ عطا کر دیا۔ مذکورہ اعتراض سب سے زیادہ سفرنامے کی صنف پر کیا گیا ہے۔ بہر حال اِس کی بھی ضرور کچھ وجوہات رہی ہیں۔ کیونکہ بعض سفرنامہ نگاروں نے اِس اچھی خاصی صنفِ ادب کو بارہ مسالوں والی چاٹ بنا کر رکھ دیا ہے۔ خلیل صاحب کی تصویر کتاب کی پشت پر دیکھنے کے بعد سفرنامے سے میری مخصوص توقعات وابستہ ہوگئی تھیں اور یہ توقعات سطر بہ سطر بڑھتی ہی جاتی تھیں مگر کتاب کے اختتام پر مجھے شدید مایوسی ہوگئی۔ کیونکہ عطا الحق قاسمی اور مستنصر حسین تارڑ نے اپنے پاکستانی حسن کی بدولت اپنے سفرناموں میں ائیر ہوسٹسوں، سیلز گرلز اور دیگر یورپین اور امریکن خواتین کو اپنا گرویدہ بتایا اور بڑی منشکلوں اور بڑے مشکل موڑوں پر اُن سے اپنا دامن بچایا۔ مجھے افسوس اِس لئے ہوا کہ طوق اُر صاحب کے ترکی حسن نے پاکستان کے سفر میں کسی صنفِ مخالف کو متاثر نہیں کیا۔ یقیناً اِس کی وجہ وہ ابتدائی سوچ ہوگی جو کسی سفرنامہ نگار کو سفرنامہ لکھنے پر اُکساتی ہے۔ شاید طوق اُر صاحب وہ سفرنامہ نہیں لکھنا چاہتے تھے کہ جس کے لیے سفر کی نہیں فینٹسی کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ ''پیارا ملک ہے پاکستان'' فینٹسی سے عاری اور حقیقت سے نزدیک سفرنامہ ہے۔ سفرنامہ نگار کسی مقام پر بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر ہیرو یا over smart بنتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ اگرچہ بہت سے مقامات سفرنامہ میں ایسے آتے ہیں جہاں مصنف نے ہیرو بننے کے مواقع ضائع کیے ہیں۔

سفرنامے کے بارے میں کہتے ہیں کہ دو معاشروں کا تقابل دکھایا جاتا ہے۔ بظاہر لگتا ہے کہ ترکی کا ایک باشندہ پاکستان کا سفرنامہ لکھ رہا ہے۔ لیکن قطعاً ایسا نہیں لگا۔ دراصل تقابل اُس وقت ممکن ہوتا ہے جب کوئی مسافر ایک تہذیب کو روح میں سمائے جسمانی طور پر دوسری تہذیب میں سفر کر رہا ہو۔ مگر یہاں تو مسئلہ ہی کچھ اور ہے کہ ایک روح بیک وقت دو تہذیبوں میں مائل بہ سفر ہے۔ مصنف دیارِ غیر کے نہیں بلکہ دیار دیار کے سفر میں نظر آتے ہیں۔ پاکستان سے محبت مصنف کے عام رویوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ وہ عام سیاح کی طرح معاشرے میں پھیلی کجیوں کی طرف نشاندہی نہیں کرتے بلکہ کسی ہم وطن کی طرح کڑھتے ہیں اور کبھی کبھی تو دکھی ہو جاتے ہیں اور یہ دکھ صرف اپنائیت سے جنم لیتا ہے۔

سفرنامہ اُن اصنافِ ادب سے تعلق رکھتا ہے کہ جس میں مصنف غیر شعوری طور پر اپنی ذات کا اظہار کر ہی دیتا ہے۔ ذات کا اظہار اُن رویوں سے ہوتا ہے جو دورانِ سفر مصنف کی جانب سے سامنے آتے ہیں۔ یوں سفرنامے کے ساتھ ساتھ خود مصنف کی اپنی شخصیت کھل کر صفحۂ قرطاس پر پھیل جاتی ہے۔ ''پیارا ملک ہے پاکستان'' میں خلیل طوق اُر کی شخصیت کا ایک خوبصورت خاکہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اگر اُن کی شخصیت کی کوئی اکائی تلاش کی جائے تو وہ میری نظر میں عجز و انکساری ہے جو اُن کی ذات کے گرد ایک روشن ہالہ سا بن دیتی ہے۔ جس سے اُن کی شخصیت میں ایک ٹھہراؤ سا آجاتا ہے۔ اِسی لیے وہ دورانِ سفر ہر کیفیت اور ہر نظرہ کو بڑے تحمل سے اپنے تجربے کا حصہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اِس لیے اُنھیں بیان کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ وہ مزہ لے لے کر تجربات اور مشاہدات کو بیان کرتے ہیں۔ جس سے سفرنامے میں ایک خوبصورت سا ٹھہراؤ سامنے آتا ہے اور یہ ٹھہراؤ ہی اِس سفرنامے کا حسن ہے۔

مصنف اِس سفرنامے میں مختلف محبتوں میں بٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ترکی، اردو، پاکستان اور ماہم نور (اُن کی بیٹی) چار ایسی محبتیں جن کی شاید ترجیح بندی نہ ہو سکے۔ لیکن اِنھیں چار محبتوں سے جناب طوق اُر کا نقطۂ نظر سامنے آتا ہے۔ وہ تمام ایشیا کو اپنی اِنھیں محبتوں کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ماہم نور کی ہلکی سی اُداسی اُن کو دنیا سے مکمل طور پر لاتعلق کر دیتی ہے۔ نجانے کیوں ماہم نور کے ننھے سے کم گو کردار میں مجھے دو وطنوں کی دبیز محبت کی علامت چھپی ہوئی نظر آتی ہے۔ اردو سے اُن کی محبت آگے بڑھ کر عشق اور جنون کی کیفیت اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اردو کی کُتب کی چوری کو گناہ نہیں بلکہ اعمالِ نیک میں شمار کرتے ہیں۔ اردو اور اِس سے متعلقہ شخصیات کا ذکر کرتے ہوئے اُن کے بیان میں عجیب کیفیت سی در آتی ہے۔ اور یہ وہ کیفیت ہوتی ہے جو براہ راست دل سے جنم لیتی ہے۔ شاید اُن کی پاکستان سے محبت بھی اردو سے ہی جنم لیتی ہے۔ یوں سارے سفرنامے میں وہ پاکستان کی اچھائیوں اور برائیوں کو own کرتے جاتے ہیں۔ اِس سارے سفرنامے میں مصنف سسرالی عزیزوں کی ''زد'' میں رہے ہیں۔ لیکن بیان میں اُنھوں نے کسی ایک سسرالی عزیز کے مزاج کا گلہ نہیں کیا۔ شاید دنیا کی یہ واحد مثال ہو کہ کسی کو اپنے سسرالی عزیزوں سے گلہ نہ ہو۔ یہاں مصنف نے عملی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ واقعی محبت اندھی ہوتی ہے۔ دراصل خلیل صاحب کی عاجزانہ شخصیت، اردو اور پاکستان سے محبت نے اُنھیں خاندان کی

ایک ہر دل عزیز شخصیت بنادیا ہے۔ اور افرادِ خانہ اور اُن کے درمیان ایک خوبصورت کیمسٹری سی بن گئی ہے جو سفرنامے کو اوپر کی طرف اُٹھاتی ہے اور دوسری بات یہ کہ مصنف رشتوں کا پاس اور محبت رکھنے والے انسان نظر آتے ہیں۔

سفرنامہ نگار پر کوئی قید نہیں کہ وہ دَورانِ سفر کن چیزوں کو دکھائے کن چیزوں کو نہ دکھائے۔ دراصل یہ سب کچھ صاحبِ تحریر کے مذاج ومیلان پر منحصر ہوتا ہے۔ ہر سفرنامے کے اپنے مرغوب موضوعات ہوتے ہیں جن پر اُن کا قلم رواں ہوتا ہے۔ ''پیارا ملک ہے پاکستان'' میں اردو اور مغل دَورِ حکومت اُن کے مرغوب موضوعات ہیں۔ یہاں اُن کا قلم پوری آب وتاب اور شان کے ساتھ رواں دواں ہوتا ہے۔ یہاں اُن کا بیان اُس وقت تک مطمئن نہیں ہوتا جب تک خوب مصنف مطمئن نہیں ہوتے۔

سفرنامہ خاص مقامات، لوگوں سے میل جول، حادثات وواقعات اور عوامی رویوں تک ہی محدود نہیں ہوتا بلکہ ایک اچھا سفرنامہ اپنے باطن میں تحقیقی امکانات بھی رکھتا ہے۔ خلیل صاحب نے ''پیارا ملک ہے پاکستان'' میں سفرنامے کے اِس جدید تقاضے کو خوب نبھایا ہے۔ مختلف مقامات پر تاریخی حوالوں کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے موصوف نے اُن موضوعات پر لکھی گئی عمدہ کتابوں سے برمحل اقتباسات دیئے ہیں جو اُن کے بیان کو تقویت بخشتے ہیں۔ انارکلی بازار، مقبرۂ جہانگیر، شاہی مسجد، ناران، کاغان، جھیل سیف الملوک، گندھارا تہذیب پر بات کرتے وقت موصوف نے علمی وتحقیقی تقاضوں کو مدنظر رکھا ہے۔ بلکہ اپنے سادہ اسلوب سے خوب برتا بھی ہے۔

سفرنامہ میں تقریباً تمام مقامات ایسے ہیں جنھیں میں دیکھ چکا ہوں۔ خلیل صاحب کے سادہ اصلوب، اُن کے نرم رویہ اور تحقیقی اندازِ فکر سے مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں نے پاکستان کو ایک نئے تناظر سے دیکھا ہے اور یہی اِس کی کامیابی ہے۔ یوں اندر سے ایک آواز آتی ہے کہ ''پیارا ملک ہے پاکستان''۔

☆

○

ترکی زبان کے حوالے سے یہ مصرع زبان زد خاص وعام ہے

زبان یارِ من ترکی ومن ترکی نمی دانم

اس مصرعے میں شاعر نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ اس کے محبوب یا دوست کی زبان ترکی ہے اور وہ خود ترکی زبان سے نابلد ہے اب گفتگو ہو تو کیسے ہو؟ شاعر نے تو اپنی ترکی زبان سے لاعلمی کا اظہار کر دیا لیکن یہ نہ بتایا کہ جس طرح وہ خود ترکی سے نابلد تھا بالکل اسی طرح اس کا محبوب اردو زبان سے نابلد تھا ورنہ باہمی تعلق اور سلسلہ جنبانی یوں منقطع نہ ہوتا۔ یہ مصرعہ راقم الحروف کے ذہن میں کئی روز سے اس لیے گردش کر رہا ہے کہ الحمد اللہ راقم کو اب تک ایک دو نہیں بلکہ چار ایسے محترم حضرات سے تعارف حاصل ہوا اور مسلسل رابطہ رہا جو بیک وقت ترکی اور اردو دونوں زبانوں پر یکساں مہارت رکھتے تھے۔ ان محترم حضرات میں سرفہرست ڈاکٹر نثار احمد اسرار مرحوم تھے۔ جو راقم سے چھوٹے بھائیوں کی طرح شفقت اور محبت کا تعلق رکھتے تھے۔ وہ تھے تو پاکستانی شہری لیکن ۳۶ سال تک ترکی میں مقیم رہے اور ترکی سے اردو اور اردو سے ترکی میں ترجمے پر بے پناہ مہارت رکھتے تھے۔

محمد راشد شیخ

(کراچی)

○

اردو کے حبیب ہمارے خلیل پاکستان کے دولھا بھائی پہلے پہل ان کا نام کسی رسالے میں دیکھا۔ مضمون تو عمدہ تھا لیکن نام؟ خلیل تو چلو ٹھیک ہے لیکن طوق کیوں گلے میں ڈالا ہے؟ اور آر بلکہ اُر کیا ہوا؟ اگر طوق ہے تو اس سے عار ہونا چاہیے نا کہ اُر۔ لیکن معلوم یہ ہوا کہ موصوف ترک ہیں تو بڑی خوش گوار حیرت ہوئی۔ جب مزید انکشاف ہوا کہ اردو کی محبت میں ایک پاکستانی خاتون کو قید شریعت میں لا چکے ہیں تو خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی، افسوس اس لیے کہ عاشق اردو پر ہوئے اور قید کسی اور کو کیا۔ بابائے اردو سے سبق لیتے جن کی شادی اردو سے ہوگئی تھی (لیکن پھر خیال آیا کہ وہ تو شادی کی پہلی رات حجلۂ عروسی سے براستہ کھڑکی کود کر فرار ہو گئے تھے اور تمام عمر اردو کی خدمت میں گزاری چنانچہ افسوس کو ترک کر کے اس کی جگہ بھی خوشی کو رکھا۔) خیال آیا کہ اب یہ نوجوان دامادِ پاکستان ہے تو دل میں وہ احترام بھی پیدا ہوا جو ہمارے ہاں روایتی طور پر دولھا بھائی کے لیے روا رکھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پاکستانی خاتون سے شادی کر کے موصوف پورے پاکستان کے دولھا بھائی بن چکے ہیں۔ یہ اردو کے حبیب ہیں اور جب ہم سے ملاقات ہوئی تو ہمارے خلیل یعنی دوست بھی ہو گئے۔

ڈاکٹر رؤف پاریکھ

(کراچی)

جواں سال بزرگ

پروفیسر ڈاکٹر یوسف خشک
(خیرپور، سندھ)

اکثر بزرگ کا لفظ ایسے عمر رسیدہ شخص کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس کے بدن میں طاقت ادھوری ہو چکی ہو، بھنویں اور بال سفید ہوں، چربی پگھل جانے کی وجہ سے پورے جسم کی کھال بھول بھلیاں کا پینسل اسکیچ دکھائی دے رہی ہو، دنیا کی حرص و ہوس برائیوں اور گلا خوروں سے دور ہو عاجزی وانکساری کے ساتھ ہر مظلوم کے مسئلے کو نہ صرف اپنا مسئلہ تصور کرتا ہو بلکہ اپنے تجربے ومشاہدے کے ساتھ دیگر وسائل کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے اس کے حل کے لیے معاون ہو۔ دنیا کی خوبصورتی کو محسوس کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے کوشاں، رشتوں ناتوں اور قول کا بھرم رکھنے والا کسی کا برا نہ چاہنے والا عملاً صاف ستھرا شخص بزرگ کہلاتا ہے۔

مندرج بالا خصوصیات میں سے ڈاکٹر خلیل کی شخصیت میں چند خصوصیات بالکل بھی موجود نہیں ہیں۔ نہ تو وہ عمر رسیدہ ہیں (۴۲ سال کے جوان ہیں) نہ ان کے بھنویں اور بال سفید ہیں اور نہ ہی اس کے جسم کی کھال سے چربی رخصت ہوئی ہے بلکہ اس میں یہ خصوصیات پیدا ہونے کے آثار بھی کم دکھائی دیتے ہیں، کیونکہ بڑھاپے کو وقت سے پہلے لانے والوں میں، خصوصاً حرص، ہوس تعصب، فتنہ باز طبیعیت، خواہ مخواہ کے غصے جیسے عناصر کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے، اور ڈاکٹر خلیل میں یہ جراثیم دکھائی ہی نہیں دیتے۔

بزرگی کی ان ظاہری نشانیوں کے علاوہ دیگر تمام صلاحیتیں ڈاکٹر خلیل کی شخصیت میں بخوبی موجود ہیں۔ اس سلسلے میں چند داخلی شہادتیں ڈاکٹر خلیل کی شاعری کے مجموعے ''آخری فریاد'' سے پیش خدمت ہیں سب سے پہلے اس کتاب کا انتساب ملاحظہ فرمائیے۔

انتساب ان لوگوں کے نام
''جو خود شمع کی مانند جل کر دوسروں کو روشنی پہنچاتے ہیں''

عاجزی انکساری کا انداز دیکھیے:

ہم کچھ بھی نہیں
ہمیں نہ پوچھ ہم
کچھ بھی نہیں
کچھ بھی نہیں
بس کچھ بھی نہیں

(نظم: 'ہم کچھ بھی نہیں' مشمولہ آخری فریاد، ص۔۵۱)

اس پہلوئے انکساری کے ساتھ وہ دنیا کی مکاریوں کو بھی جاننے کی خوب صلاحیت رکھتے ہیں۔ مکاری کے مختلف رنگ جتنے واضح انداز میں انہیں نظر آتے ہیں وہ اسی طرح تمام افراد کو دکھانا چاہتے ہیں لیکن اس بزرگانہ انداز سے کہ جو ناواقف ہوں، واقف ہو جائیں اور جو مالک ہیں انہیں آئینہ نظر آسکے۔

جعلی سخاوت، جعلی تجارت، جعلی خطابت کرتے ہیں لوگ
دوستوں سے مکاری کر کے دوستِ حقیقی بنتے ہیں لوگ
جعلی مشقت، جعلی ریاضت، جعلی عبادت کرتے ہیں لوگ
اپنی انا سے کر کے تغافل جعلی مسلماں بنتے ہیں لوگ

(مشمولہ آخری فریاد، ص۔۲۹)

اسی طرح ڈاکٹر خلیل طوقار کی سوچ اور محبت کا دائرہ بھی نہایت وسیع ہے وہ تمام انسانوں کو ایک کنبہ تصور کرتے ہوئے تمام مظلوموں (چاہے خدائی آفات کا نشانہ بنے ہوں یا انسان کی پیدا کردہ آفات کا) کے احساسات کو ایسے شیریں الفاظ ادا کرتے ہیں کہ ہمدردی کا پہلو خود بخود اجاگر ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں بطور مثال نظم 'زلزلہ زدہ کشمیری بچی' اور نظم 'افریقا کی آواز' ملاحظہ ہوں:

زلزلہ زدہ کشمیری بچی!
ننھے منے ہاتھوں سے
اس نے خوابوں کا محل بنایا تھا
اب اس کے ملبے پر
اکیلی بیٹھی رو رہی ہے
کشمیری بچی
محبت نچھاور کرتے تھے جو
بے دریغ اور وہ بے قیاس اس پر
ان والدین کی گم ہوئی لاشیں،
اب خاک وغبار تلے
ڈھونڈ رہی ہے بے چینی سے
کشمیری بچی،

(آخری فریاد ص۔۷۰)

افریقا کی آواز
زرافے کی گردن والو
اک ذرا ادھر کو دیکھو
ہم یہاں کچلے جا رہے ہیں
تمہارے پاؤں کے تلے

باقی: صفحہ ۳۶ پر ملاحظہ فرمائیے

''آتشِ سوزانِ غم''

(ڈاکٹر خلیل طوق اَر کے کلام سے مختصر انتخاب)

ذکی کُردش (استنبول، ترکی)

تیرے آنے کی سخا کا منتظر کب سے ہوں میں
مِہر کی بادِ صبا کا منتظر کب سے ہوں میں

زلفِ تَر کی خوشبو سے ملنے کی ترغیب دی
تیرے وعدے پر وفا کا منتظر کب سے ہوں میں

سانس رک رک کر رہا تیری ادا جب سے دیکھی
سانس لینے کی فضا کا منتظر کب سے ہوں میں

نوکِ مژگاں سے مرے زخمِ جگر پُر خوں کئے
ہوش لانے کی دوا کا منتظر کب سے ہوں میں

جاں کنی کے درد سے جیتا ہوں ہر دم اے خلیلؔ
موت کی شیریں جزا کا منتظر کب سے ہوں میں

○

تم سے بچھڑ کر مجھے محسوس ہوا سوزِ جگر
آگ کو ہم راز بنا کر مَیں ہوا شہر بدر

کرکے سفر دشتِ فنا کا مجھے اندازہ ہوا
فائدہ بالکل نہیں رونے کا یہاں تا بہ سحر

تھا مَیں اکیلا مرا ہمراہِ جفا کوئی نہ تھا
یار مرے تھے وہی آتش وہی فرسودہ شجر

گوشۂ عزلت میں بھی مجھ کو نہیں حاصل سکون
درد سے بے بس رہا مَیں کیسے سَہوں دردِ دِگر

عشق سے جلتی ہے یہ جاں خوف نہیں پھر بھی خلیل
راکھ بنا ہے یہ بدن اِس پہ بھی ہے مجھ کو فخر

○

مثنوی کوتاہ ہے میری زندگی کی

سامراجی چاہتوں کی ضربتیں دروازے پر
آج دستک دے رہی ہیں آخری طاقت سے پر
سیرِ گردوں کے لیے دل میں محبت ہی سہی
ان کو دینے کے لیے میرے یہاں کچھ بھی نہیں
بھر دیا تھا اپنے بچپن کی امنگوں سے یہ تن
چھوڑ کر ان کو جوانی میں رہا تنہا بدن
قلب خالی، روح خالی مقصدیت سے بری
بے اصل رنگوں سے سجتی آج کل کی دلبری
مختصر ہے داستان زندگی میرے لیے
کچھ قدم آگے کھڑی موتِ نہاں میرے لیے؟
مثنوی کوتاہ ہے اوراق جلنے کے سبب
وقت سے پہلے جگر کا خوں بہانے کے سبب
کھٹکھٹانا چھوڑ دیں دروازہ، کردیں در گزر
گر نہیں الفت کم از کم کچھ تو ہو اللہ کا ڈر

○

تیری ہستی

اندھیرا آنکھوں کے سامنے
کالی سیاہ گہرائی
نہ کوئی ستارہ آگے
نہ کوئی روشنائی
میرے جسم کے ہر عضوء میں
کارگر ہے تنہائی؛
آویزاں ہوں دشتِ فضاء میں
نہ زیر سے تعلق ہے نہ بندشِ بالائی
وحشتناک خموشی کی گشت ہے
آہٹوں کی ندیاں کھو گئیں اپنی گویائی
شعور و لاشعور کی وسیع سرحد پہ
لے رہی ہیں افکار بے ہوش انگڑائی
تماشا گاہ ہونے کا ہر دم احساس ہے مجھے
تیز سے تیز تر ہے تیری بینائی
بس تُو ہی تُو ہے اس عالم مدہوش میں
تیری ہستی ذرہ ذرہ پہ چھائی
۲۴ فروری ۲۰۰۴ء

○

موت کی خوشبو

خوشبو آتی سنی ہے کسی سے کبھی
موت کی؟
شاید کبھی نہیں!
کہتے ہیں کہ مہک دیتی ہے زندگی
تازہ پھولوں کی،
لافانی خوبصورتی ہوتی ہے
پل پل جینے کی
پل پل اُمنگوں میں لپیٹ کر
پل پل ملنے کی،
ہوتی ہے، یہ ہے ایک سچائی
لیکن جب محسوس ہوتی ہے
روح بدن میں بھاری
ہر سانس بنتی ہے بس
آہ وزاری
تیرے گزر جانے میں لوگ
سمجھتے ہیں اپنی بھلائی
جب موتِ تسلسل کی صورت
اختیار کر لیتی ہے زندگانی
تب خوشبو آتی ہے موت کی
تب کشش ہوتی ہے اس کی
اور
تب ہونے لگتی ہے وہ بھی
پیاری!

۲۹ مارچ ۲۰۰۴ء

آؤں گا تیرے حضور!

اک نہ اک دن آؤں گا تیرے حضور
گناہوں کے بھاری بار
کندھوں پہ اُٹھائے ہوئے
ٹانگیں کانپتے ہوئے
پاؤں بھرے ہوئے آبلوں سے،
وصلت کے انتظار میں بیتے
بے خواب دنوں کی سرخی
چھائی ہوگی آنکھوں میں،
کراماً کاتبین ہوں گے
دائیں بائیں
شکایت کناں کہ
''اس کی کتاب میں
ہے نہیں کوئی ثواب!''
صف بستہ ہوں گے حقدار
ایک کنارے پر
کہ ہمارے حق واپس کر
جو چھوڑ آئے تھے ہم دنیا میں
تیرے اوپر!
لیکن جھکاؤں گا نہیں سر کبھی
شرمندہ ہوں گا نہ ہی
آنسو نہٰن بہاؤں گا
ایک قطرہ بھی،
بس مسکراؤں گا
گہرائیوں سے دل کی
پارۂ گوشت چھیڑ کر
دکھاؤں گا تجھے
جس میں بویا تھا تو نے
ایک تخم ایمان
سرسبز ہے وہ تا حال
اور کہوں گا کہ
ڈر نہیں مجھے
عذاب الحریق سے
کیونکہ مجھے بے شک ہے یقین
اے رب میرا، تو ارحم الراحمین!

ابر بہار

ہواؤں کی سوئی ہاتھ میں لئے
ابر بہار سی رہا ہوں میں
غمگین پت جھڑوں کی کالی
گھٹاؤں سے بچے ہوئے
ٹکڑوں کو ملا ملا کر،
رنگ کرتا ہوں انہیں
آنکھوں کی سفیدی سے بھی سفید
سفیدی سے،
ایک قطرۂ اشک اس کے دل میں
ڈالتا ہوں
اکسیر کی نیت سے جو کہ
ٹپک پڑا تھا صدیوں پہلے
ایک یتیم پاکدامن کی
چشم شفا بخش سے،
''ھو'' کہتا ہوں اس کے کان
سرگوشیوں میں
آزاد کرتا ہوں اسے
اپنے تھکے ہوئے
بے بس ہاتھوں سے
جائے، جہاں چاہے
جہاں تک جا سکے،
برسائے
بارانِ مروارید،
شاید بدل دے
الٹے ہوئے نصیب

پردیسی

پردیسی بن کر آیا تھا اس عالم میں
پردیسی بن کر چلا جاؤں گا اپنے دیس
سوگوار نہیں ہوگا میرے بعد کوئی
کالے کپڑے پہنے گھٹائیں نہیں آئیں گی
میرے جنازے میں،
نہ گرے گا کبھی ایک قطرۂ اشک
آسمان کی نمناک آنکھوں سے میری دھرتی کے اوپر
پیلے پتے نہیں گرائیں گے غمگین پیڑ میرے بعد
سر جھکا کر نہیں مرجھائیں گے پھول میرے ماتم میں
دیوانہ وار موج زن نہیں ہوں گے سمندر
اپنے دل میں میرے جانے کے الم لے کر.....،
اور پھر.....
اور پھر چمک کر طلوع کرے گا سورج ہنستے ہوئے
شبنم کے پانی سے منہ دھو کر جاگیں گے گلاب
تتلیاں خوشی سے اُڑ کر جشن منائیں گی آس پاس
پرندے اپنی روزی ڈھونڈنے نکلیں گے
ندیاں بہتے ہوئے شاداب کریں گی فصلیں
ایک اور نئے دن کا علم بلند ہوگا.....،
اور پھر....
اور پھر ساروں کو اپنے کام سے کام ہوگا
بس اپنی اپنی زندگی سے مطلب ہوگا
کوئی نہیں سوچے گا کہ ایک پردیسی تھا
جو یہیں آیا تھا کل، آج چلا گیا!

قیامت نزدیک ہے

قیامت کی آمد
نزدیک ہے کہ شاید
دجّال کے ڈھول بجتے
گردونواح میں،
شیرازۂ ادوار
بکھر گیا ہے
آج ہے کل یا کل
آج ہوا ہے،
گولیاں، گولیاں
گولا باریاں
آسمان جلاتی ہیں
آتش زنیاں،
ٹوٹی کھوپڑیاں
پسی ہڈیاں،
مری ہیں، پٹی ہیں
سوکھ کر مٹی ہیں
ہماری مائیں
معصوم بچیاں،
ڈھانچے بنے بچے
ماؤں کی گود میں
محروم رہی زبان
بچاؤ کی چیخ سے،
ملتِ بیضا کی لاش
پڑی زمین پر
اس کے اردگرد ناچتے
راج گدھ، بھیڑیے،
تماشا بنا ہے
وہ سب کچھ سامنے
تماشائی ہیں ہم
آنکھ پر پٹیاں!

تم سے بچھڑ کر مجھے محسوس ہوا سوزِ جگر
آگ کو ہم راز بنا کر مَیں ہوا شہر بدر

کر کے سفر دشتِ فنا کا مجھے اندازہ ہوا
فائدہ بالکل نہیں رونے کا یہاں تا بہ سحر

تھا مَیں اکیلا مرا ہمراہِ جفا کوئی نہ تھا
یار مرے تھے وہی آتش وہی فرسودہ شجر

گوشۂ عزلت میں بھی مجھ کو نہیں حاصل سکون
درد سے بے بس رہا مَیں کیسے سَہوں دردِ دِگر

عشق سے جلتی ہے یہ جاں خوف نہیں پھر بھی خلیل
راکھ بنا ہے یہ بدن اِس پہ بھی ہے مجھ کو فخر

○

بچاؤ میرے سپنے

حقیقت کے ہاتھوں سے بچاؤ میرے سپنے
سیلاب بن کر آتی ہے جو ہر رات چپکے چپکے
ذرہ ذرہ گراتی ہے میرا مٹی کا محل
جس میں میں نے چھپایا تھا اپنے بچپن کا چراغ
جس سے پیدا کرتا ہوں میں کل کی امید
جس سے روشن کرتا ہوں میں اپنے دل کو
وہ جو آج کی تاریکی میں ڈوبا ہے
وہ جو اپنے دھڑکنے سے ڈرتا ہے
وہ جو جینے کو غیروں کا حق سمجھ کر
اپنی ہستی سے الوداع کہتا ہے!

بہتے پانی پر

پلکیں قلم بنیں میری، خونِ جگر سیاہی
بہتے پانی پہ لکھتا ہوں اپنے غم کی کہانی
ہر روز ٹوٹتے ستاروں سے بھرتی ہے میری جھولی
اپنے خدا سے پوچھتا ہوں: ''یہ کیسی زندگانی؟''
کیوں بجھتے ہیں گھروں کے نئے جلے چراغ
خوش ہوتے ہی دلوں کو کیوں ملتا ہے داغ
مرتے ہیں دھماکوں میں ہر جگہ بوڑھے بچے
زمین سے مل کر مٹتے ہیں نئے ہی کھلے غنچے
چلتے ہیں اپنے آپ کو دنیا کے رستم مان کر
مارتے ہیں اپنوں کو طاقتور کے ہاتھ بن کر
ڈرتے نہیں پڑوسی پر الزام لگانے سے
روکتے نہیں بچی کے بوڑھے کو بھی بیچنے سے
لے کر غریب کی روزی امیر تر کرتے امیر
لگتا نہیں سینے میں ان کا بھی ہے ایک ضمیر
پھیلتی ہے چار طرف بے بسی، بے چارگی
رات کرتی ہیں صبح کو ان دل کی تاریکی
یہ جہان کیسا بنا اور بنی عجیب زندگی
ہر روز ٹوٹتے ستاروں سے بھرتی ہے میری جھولی

○

''وڈے مقام والا''

(میرے محترم بزرگ دے ناں
جنہاں نے مینوں ڈانٹ ڈپٹ کے ٹھیک کرن دی کوشش کیتی اے)

سکھا دتّا اے میرے پیونے
احترام دا مطلب کیہ ہوندا اے
پیار تے محبت کیہ اے
خدمت وڈے دی کیہ ہوندی اے
ساڈی حیاتی اوندی اے
جیڑا میرا سب اوہندا اے
جو اوہ کردا اوہی ٹھیک اے
جو اوہ کہندا چنگا اے
سکھاندے ہوئے ایہناں نوں
اوہندے ہتھ اچ اک ڈنڈا سی
غلطی توں بچن لئی
راہنما اوہی ہوندا سی
میرے سر تے مار مار کے
ٹھیک کیتا اے اوس نے مینوں
درست راہ تے لیایا مینوں
اوہ وڈا سی میں ای چھوٹا
اوہ سچا سی میں ای جھوٹا
بچپنے توں عادت پئی
اوہندیاں کوششاں نال
وڈے دے اگے سر جھکان دی
وڈے دی ہر گہل مانن دی
اس لئی سمجھ آیا اے مینوں
اوہی ٹھیک ہوندا اے جیڑا
وڈے مقام والا کہندا اے
حکم بجالا ناحق اے اوندا
جہیندے ہتھ وچ ڈانڈا ای اے!

ترکی میں اقبال شناسی

ڈاکٹر خلیل طوق آر

یونیورسٹیوں میں علامہ محمد اقبال سے متعلق مختلف سطح کے مقالے لکھے جانے کا افتتاح ترکی میں اقبال شناسی کے سلسلے کا ایک اور مرحلہ ہے جو ترکوں میں اقبال کے خیالات وتصورات کو بہتر انداز میں سمجھنے میں بڑا کارفرما ہوسکتا ہے۔ درحقیقت یہ مرحلہ ترکی میں اقبال شناسی کا تیسرا مرحلہ ہے جس کے پہلے دو مرحلے اقبال کی تصانیف کا ترجمہ اور اقبال کے بارے میں مضامین کی تحریر تھے جنھوں نے کافی حد تک ترکی میں اقبال کے تعارف میں کام دیا اور آج بھی دیتے رہتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ عرض کرنا چاہئے کہ ترکی کی یونیورسٹیوں کی تعلیم میں لکھے جانے والے مقالوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلی سطح پر بی اے کے مقالے ہوتے ہیں جو صرف ترکی کی چند یونیورسٹیوں میں تیار کئے جاتے ہیں جنھیں طالب علموں کی فارغ التحصیلی کے لیے لازمی قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن بی اے کے مقالے عام طور پر علمی لحاظ سے سطحی اور ترجموں پر شامل ہوتے ہیں۔ دوسری سطح کے مقالے ایم اے کے ہیں جو علمی اعتبار سے نسبتاً بہتر معیار کے اور تفصیلی ہوتے ہیں اور ان میں سے کچھ مقالہ نگار اور اس کے نگران کی علمی صلاحیت کے مطابق علمی نقطۂ نظر سے داد کے مستحق اور مفید بھی ہوتے ہیں۔ اور یہ تمام یونیورسٹیوں میں طالب علموں کی فارغ التحصیلی کے لیے لازمی ہیں۔ تیسری سطح کے مقالے پی ایچ ڈی کے ہیں۔ جن کے بارے میں یہ کہنا بے جا ہوگا کہ ان کا علمی وتحقیقی معیار اعلیٰ ہے کہ نہیں۔ کیونکہ اس سطح کے مقالوں کا بے شک اعلیٰ معیار کا ہونا ایک ضروری امر ہے۔

ترکی میں اقبال کے متعلق مقالوں کو دیکھا جائے تو تینوں سطحوں کے مقالے موجود پائے جائیں گے۔ جن میں سب سے زیادہ بی اے کے مقالے نظر آتے ہیں۔ پھر ایم اے کے اور بعد میں پی ایچ ڈی کے مقالے آتے ہیں جو آج تک صرف دو عدد ہیں۔ اگر مندرجہ ذیل دی گئی فہرست کو مدنظر رکھا جائے تو ان میں سے اکثر وبیشتر مقالے مختلف یونیورسٹیوں کی الٰہیات فیکلٹیوں میں تیار کئے جاتے ہیں جن کا مقصد اصلی عالی سطح کے عالم دین اور دینی علوم کے محقق کی تعلیم وتربیت ہیں۔ علامہ اقبال کا مفکر ومبلغ اسلام اور کم نظیر فلسفی ہونے کا طبعی نتیجہ ہے کہ ان کے خیالات وتصورات الٰہیات فیکلٹیوں کے محققوں کے لیے دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔ یوں ترکی میں اقبال سے متعلق لکھا گیا پہلا مقالہ کمال دایانیر (Kemal Dayanır) کا ''محمد اقبال کا دینی تفکر'' ہے جو ۱۹۷۸ء کو انقرہ یونیورسٹی الٰہیات فیکلٹی میں آئی آگاہ چوبوک چو (İ. Agâh Çubukçu) کی نگرانی میں تیار کیا گیا اور ۱۹۸۴ء میں ترکوں کے عظیم دوست پاکستانی ڈاکٹر محمد اقبال کی زندگی، سیاسی، ادبی اور دینی تفکر کے عنوان سے شائع ہوا۔

اس پہلے قدم کے بعد کچھ سال اس سلسلے میں انقطع واقع ہوا۔ ۱۹۸۰ء کے بعد پھر اقبال سے متعلق مقالے لکھے جانے لگے اور بالخصوص ۱۹۹۰ء کے بعد ان کی تعداد میں اور اضافہ ہوا اور ۲۰۰۱ء کو احمد آل بیراق نے اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ محمد اقبال کی تشکیلِ شخصیت اور پیش کردہ انسانی ماڈل کو لکھا ہے۔ آل بیراق کا مقالہ ترکی میں اقبال شناسی کی اہم کڑی ہے کیونکہ مقالہ نگار موصوف الٰہیات کے دینی نفسیات اور فلسفہ سے تعلق رکھنے اور اقبال سے وابستگی کی وجہ سے درون بینی سے کام لینے کی صلاحیت اور قابلیت رکھتا ہے۔ مندرجہ ذیل فہرست بھی اس کے تیار کردہ مضمون ''ترکی زبان میں محمد اقبال'' کے عنوان سے مجلۂ دیوان۔ استنبول کے صفحات ۲۹۶ تا ۳۰۰ میں موجود ہے۔

الٰہیات فیکلٹیوں کے علاوہ یونیورسٹیوں کی ادبیات فیکلٹیوں کے شعبہ جاتِ زبان وادب اردو میں بھی اقبال سے متعلق مقالے لکھے جاتے ہیں جو بہ نسبت الٰہیات فیکلٹیوں کے قدرے کم ہیں۔ اس کے اسباب موجبہ میں سے سب سے اہم ان شعبوں کا مقصدِ اول اردو زبان اور ادب کی تعلیم دی جانی ہے اور اسی بناء پر قانونی لحاظ سے ان کے میدانِ کار وتحقیق کے اس موضوع پر منحصر ہونا ہے۔ یہ پابندیاں ان شعبوں کے اقبال سے متعلق تحقیق کے دائرہ کو اور محدود کردیتی ہیں۔ لیکن پھر بھی اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کیا جاتا ہے۔

مندرجہ ذیل فہرست میں ترکی میں علامہ محمد اقبال کے بارے میں مختلف یونیورسٹیوں میں تیار کئے جانے والے مقالے دیئے گئے۔ جن کو لکھتے ہوئے ہم نے ان کو فیکلٹیوں کے لحاظ سے الگ کرکے تاریخ وار سلسلے میں دیا ہے۔ علاوہ بریں مقالوں کے نام ترکی زبان کی بجائے اردو میں دیئے گئے ہیں تاکہ اردو دان محققین اور قارئین کے لیے ان کے نام سمجھنے میں دقت پیش نہ آئے اور ان کو موضوعات کا اندازہ لگانے میں سہولت فراہم ہوجائے۔

I- الٰہیات فیکلٹیوں میں

پی ایچ ڈی کے مقالات

۱۔ احمد آل بیراق (Ahmet Albayrak)، محمد اقبال کی تشکیلِ شخصیت اور پیش کردہ انسانی ماڈل، اولوداغ یونیورسٹی سوشل سائنس انسٹی ٹیوٹ، بورسہ ۲۰۰۱ء، ص ۲۲۴ (شعبہ: دینی نفسیات، نگران: پروفیسر ڈاکٹر حیاتی ہوکیلیکلی Hayati Hökelekli، غیر مطبوعہ)۔

ایم اے کے مقالے

۱۔ جلال توریر (Celal Türer)، محمد اقبال کا فلسفۂ دین، ایرجی بیس یونیورسٹی سوشل سائنس انسٹی ٹیوٹ، قیصری ۱۹۹۲ء، ص ۸۲ (شعبہ: فلسفۂ

دین، نگران: ایسوسی ایٹ پروفیسر مرتضیٰ قورلہ ایلچی Murtaza Korlaelçi، غیر مطبوعہ)۔

۲۔ جودت قلیچ (Cevdet Kılıç)، محمد اقبال کا فلسفہ اور اس کے تصوفی اصطلاحات، انقرہ یونیورسٹی سوشل سائنس انسٹی ٹیوٹ، انقرہ ۱۹۹۴ء، ص ۲۸۷ء (شعبہ: فلسفہ اور دینی علوم، نگران: حیرانی آلتون طاش Hayrani Altıntaş، یہ مقالہ مفکر عظیم ڈاکٹر محمد اقبال: زندگی، شخصیت اور افکار کے نام سے انقرہ میں شائع ہوا ہے)۔

۳۔ علی چقماق (Ali Çakmak)، Nedoncelle اور اقبال میں تعلقاتِ خدا اور عالم، دوقوز ائیلول یونیورسٹی سوشل سائنس انسٹی ٹیوٹ، ازمیر ۱۹۹۵ء، ص ۵۷ (شعبہ: فلسفۂ دین، نگران: پروفیسر ڈاکٹر محمد ایس آئیدین Muhammed S. Aydın، غیر مطبوعہ)۔

۴۔ احمد ہونوک (Ahmet Hünük)، محمد اقبال کے نزدیک حکومت اور سماج کا فلسفہ، سلیمان دیمیریل یونیورسٹی سوشل سائنس انسٹی ٹیوٹ، اسپارتہ ۱۹۹۷ء، ص ۹۷ (شعبہ: فلسفۂ اسلام، نگران: پروفیسر ڈاکٹر اسماعیل یاقیت İsmail Yakıt، غیر مطبوعہ)۔

۵۔ مصطفےٰ یلدیرم (Mustafa Yıldırım)، محمد اقبال کے فلسفے میں انسان، اولوداغ یونیورسٹی سوشل سائنس انسٹی ٹیوٹ، بورسہ ۱۹۹۷ء، ص ۱۰۳ء (شعبہ: فلسفۂ اسلام، نگران: اسسٹنٹ پروفیسر انور اوئی سال Enver Uysal، غیر مطبوعہ)۔

۶۔ ولی اورخان (Veli Urhan)، Leibniz اور اقبال میں تعلقاتِ خدا اور عالم، دوقوز ائیلول یونیورسٹی سوشل سائنس انسٹی ٹیوٹ، ازمیر ۱۹۹۸ء، ص ۵۵ (شعبہ: اسلامی تہذیب اور سوشل سائنس، نگران: پروفیسر ڈاکٹر محمد ایس آئیدین Muhammed Aydın، غیر مطبوعہ)

۷۔ رضا بارش (Rıza Barış)، محمد اقبال کے ہاں دینی تجربہ اور علمی لحاظ سے اس کی قیمت، ایرجی بیس یونیورسٹی سوشل سائنس انسٹی ٹیوٹ، قیصری ۱۹۹۸ء، ص ۱۰۴ (شعبہ: فلسفۂ دین، نگران: ایسوسی ایٹ پروفیسر توران قوچ Turan Koç، غیر مطبوعہ)۔

۸۔ ابراہیم قاپلان (İbrahim Kaplan)، محمد اقبال کے کلامی نظریات کا تجزیہ، ایرجی بیس یونیورسٹی سوشل سائنس انسٹی ٹیوٹ، قیصری ۱۹۹۹ء، ص ۱۳۱ (نگران: پروفیسر ڈاکٹر جہاد طونچ Cihat Tunç، غیر مطبوعہ)۔

۹۔ داؤد شاہین (Davut Şahin)، محمد اقبال کی تفہیم قرآنی، انقرہ یونیورسٹی سوشل سائنس انسٹی ٹیوٹ، انقرہ ۲۰۰۲ء، ص ۷۸ (شعبہ: تفسیر، نگران: پروفیسر ڈاکٹر محمد پاچاجی Mehmet Paçacı، غیر مطبوعہ)

بی اے کے مقالے

۱۔ کمال دایانیر (Kemal Dayanır)، محمد اقبال کا دینی تفکر، انقرہ یونیورسٹی، انقرہ ۱۹۷۸ء، ص ۲۸ (نگران: آئی آگاہ چوبوک چو İ. Agâh Çubukçu، یہ مقالہ ۱۹۸۴ء میں ترکوں کے عظیم دوست پاکستانی ڈاکٹر محمد اقبال کی زندگی، سیاسی، ادبی اور دینی تفکر کے عنوان سے شائع ہوا)۔

۲۔ نظمیہ چام (Nazmiye Çam)، اقبال کی نظر میں انسان، انقرہ یونیورسٹی شعبۂ فلسفۂ اسلام، انقرہ ۱۹۸۲ء، ص ۸۴ (نگران: ایسوسی ایٹ ڈاکٹر حیرانی آلتون طاش Hayrani Altıntaş، غیر مطبوعہ)

۳۔ تحسین قرلی (Tahsin Kırlı)، محمد اقبال کا تاریخی کردار، انقرہ یونیورسٹی شعبۂ اسلامی تاریخ، انقرہ ۱۹۸۴ء، ص ۴۶ (نگران: عصمت قایہ اوغلو İsmet Kayaoğlu، غیر مطبوعہ)۔

۴۔ فاطمہ گوک (Fatma Gök)، محمد اقبال اور محمد عاکف ارصوئے کی نظر میں اصطلاح تقلید، انقرہ یونیورسٹی، انقرہ ۱۹۸۶ء، س ۷۶ (نگران: ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر سعید یازیجی اوغلو، غیر مطبوعہ)۔

۵۔ یوسف سائین (Yusuf Sayın)، ایک مجدد فلسفی: محمد اقبال، انقرہ یونیورسٹی شعبۂ فلسفۂ دین اور منطق، انقرہ ۱۹۸۹ء، ص ۵۲ (نگران: اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر طاہر یارئین Tahir Yaren، غیر مطبوعہ)۔

۶۔ ایم شوکت بیرام (M. Şevket Bayram)، اقبال کے مذہب سے متعلق افکار، انقرہ یونیورسٹی شعبۂ حدیث، انقرہ ۱۹۹۴ء، ص ۵۵ (نگران: پروفیسر ڈاکٹر سعید خطیب اوغلو Sait Hatipoğlu، یہ مقالہ David Kerr کے Muhammad Iqbal's Thoughts on Religion: Reflections in the Spirit of Christian-Muslim Dialoge, Islamochristiana, 1989, pp. 25-55 نامی مضمون کا ترجمہ ہے، غیر مطبوعہ)۔

۷۔ الیاس مینڈی (İlyas Mendi)، محمد اقبال کے ہاں اصطلاحِ شخصیت، دوقوز ائیلول یونیورسٹی شعبۂ تاریخ فلسفہ، ازمیر ۱۹۹۶ء (نگران: ڈاکٹر ولی اورخان Veli Urhan، غیر مطبوعہ)۔

۸۔ حسین شاہین (Hüseyin Şahin)، محمد اقبال کا فلسفۂ خودی اور تصورِ انسان کامل، انقرہ یونیورسٹی شعبۂ اسلامی فلسفہ، انقرہ ۱۹۹۶ء، ۵۶ (نگران: محمد بیراق دار Mehmet Bayraktar، غیر مطبوعہ)۔

۹۔ عائشہ گل شانلی (Ayşegül Şanlı)، محمد اقبال کی نظر میں خودی، انقرہ یونیورسٹی شعبۂ فلسفۂ دین، انقرہ ۱۹۹۶ء، ص ۳۵ (نگران: اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر طاہر یارئین Tahir Yaren، غیر مطبوعہ)۔

۱۰۔ فاروق آق دوغان (Faruk Akdoğan)، محمد اقبال کے اسلامی تفہیم میں بنیادی اصطلاحات، انقرہ یونیورسٹی شعبۂ تفسیر، انقرہ ۱۹۹۸ء، ص

۲۸ نگران: (ایسوسی ایٹ پروفیسر محمد پاچاجی Muhammet Paçacı غیر مطبوعہ)

۱۱۔ الیف جوشکون (Elif Coşkun)، محمد اقبال کی نظر میں اصطلاحِ عشق، دوقوزائیلول یونیورسٹی شعبۂ فلسفہ، ازمیر ۱۹۹۸ء (نگران ایسوسی ایٹ پروفیسر ابراہیم امیراوغلو İbrahim Emiroğlu، غیر مطبوعہ)۔

۱۲۔ عبدالحمید بوکوم (Abdülhamit Büküm)، محمد اقبال کے کلامی نظریات، اولوداغ یونیورسٹی شعبۂ کلام، بورسہ ۱۹۹۹ء، ص ۳۶ (نگران: اسسٹنٹ پروفیسر جعفر قرہ طاش، غیر مطبوعہ)۔

۱۳۔ نائل ایکیز (Nail Ekiz)، فلسفۂ محمد اقبال میں فکر انسان، اتاترک یونیورسٹی، ارض روم، ص ۱۴ (نگران: نامعلوم، غیر مطبوعہ)

۱۴۔ صبری آلاجہ خان (Sabri Alacahan)، فکرِ محمد اقبال میں تصوف، ارض روم یونیورسٹی شعبۂ تصوف، ارض روم ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۵ (نگران: پروفیسر ڈاکٹر عثمان توریر، غیر مطبوعہ)۔

۱۵۔ احمد کیس گین (Ahmet Kesgin)، فلسفۂ اقبال کا فعالیاتی پہلو، انقرہ یونیورسٹی شعبۂ تاریخ فلسفہ، انقرہ ۲۰۰۰ء، ص ۹۷ (نگران: پروفیسر ڈاکٹر مرتضےٰ قورلہ ایلچی Murtaza Korlaelçi، غیر مطبوعہ)۔

۱۶۔ آدم ایکمیک چی (Adem Ekmekçi)، فکری سطح پر محمد اقبال اور محمد عاکف ارصوئے کا تقابلی مطالعہ، اتاترک یونیورسٹی، ارض روم ۲۰۰۱ء، ص ۸۹ (نگران: نامعلوم، غیر مطبوعہ)۔

II-ادبیات فیکلٹیوں میں

پی ایچ ڈی کے مقالے

۱۔ جلال سوئدان (Celal Soydan)، اردو منظوم اور منثور تصانیف کی روشنی میں علامہ محمد اقبال، انقرہ یونیورسٹی سوشل سائنس انسٹی ٹیوٹ، انقرہ ۱۹۹۹ء، ص ۵۷۴ (شعبہ: زبان وادب اردو، نگران: اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر شوکت بولو Şevket Bulu، غیر مطبوعہ)۔

ایم اے کے مقالے

۱۔ سلمیٰ بینلی (Selma Benli)، ضرب کلیم اور اقبال (موسیٰ کی ضربت)، انقرہ یونیورسٹی سوشل سائنس انسٹی ٹیوٹ، انقرہ ۱۹۸۷ء، ص ۱۸۶ (شعبہ: زبان و ادب اردو، نگران: اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر شوکت بولو Şevket Bulu، غیر مطبوعہ)۔

بی اے کے مقالے

۱۔ امید اوقائی (Ümit Okay)، محمد اقبال کی کلیات اقبال نامی تصنیف سے انتخابات، انقرہ یونیورسٹی سوشل سائنس انسٹی ٹیوٹ، انقرہ ۱۹۷۷ء (نگران: نامعلوم، غیر مطبوعہ)

۲۔ عدالت چوغال (Adalet Çoğal)، محمد اقبال اور اسلام میں نظریہ قومیت، سلجوق یونیورسٹی شعبۂ زبان و ادبِ اردو، قونیہ ۱۹۹۲ء، ص ۳۸ (نگران: پروفیسر ڈاکٹر ایرکان ترکمان Erkan Türkmen، غیر مطبوعہ)۔

۳۔ پیلین اوزگین آئیدین (Pelin Özgen Aydın)، جاوید نامہ میں تنقیدِ مدنیت، سلجوق یونیورسٹی شعبۂ زبان وادبِ اردو، قونیہ ۱۹۹۳ء، ص ۴۱ (نگران: پروفیسر ڈاکٹر ایرکان ترکمان، Erkan Türkmen غیر مطبوعہ)۔

۴۔ شکری شیمشک (Şükrü Şimşek)، شکوہ، سلجوق یونیورسٹی شعبۂ زبان وادبِ اردو، قونیہ ۱۹۹۳ء، ص ۲۹ (نگران: پروفیسر ڈاکٹر ایرکان ترکمان Erkan Türkmen، غیر مطبوعہ)۔

۵۔ نظمی بیرام (Nazmi Bayram)، محمد اقبال کی تصنیف ضرب کلیم کے اوزان اور بحور، سلجوق یونیورسٹی شعبۂ زبان وادبِ اردو، قونیہ ۱۹۹۴ء، ص ۶۸ (اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر یعقوب شفق Yakup Şafak، غیر مطبوعہ)۔

۶۔ خلیل دیمیرائی (Halil Demiray)، محمد اقبال اور اس کی نظر میں مغرب، سلجوق یونیورسٹی شعبۂ زبان وادبِ اردو، قونیہ ۱۹۹۵ء، ص ۲۱ (نگران: پروفیسر ڈاکٹر ایرکان ترکمان Erkan Türkmen، غیر مطبوعہ)۔

۷۔ مظفر صاری اوز (Muzaffer Sarıöz)، محمد اقبال کی زندگی، ترکی سے تعلقات، انقلابی پہلو، شاعری، انتخابِ کلام، سلجوق یونیورسٹی شعبۂ زبان وادبِ اردو، قونیہ ۱۹۹۸ء (نگران: اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر نوریہ بیلیک، غیر مطبوعہ)۔

۸۔ گونول ایرکان (Gönül Erkan)، خطبۂ اقبال اور اس کا اثر پاکستان کے قیام پر، سلجوق یونیورسٹی شعبۂ زبان و ادبِ اردو، قونیہ ۲۰۰۰ء (نگران: لیکچرر نورائی اوزپنچ Nuray Özenç، یہ مقالہ نگار کے عزیز کی انگریزی تصنیف A History of the Idea of Pakistan کے صفحات ۱۹۸ سے ۲۳۸ تک کا ترجمہ ہے، غیر مطبوعہ)۔

۹۔ پینار دلشاد (Pınar Dilşad)، اقبال کی حقیقت (۱۹۳۰ء) اقبال کی نظر سالہائے ۱۹۳۰۔۱۹۳۴ء پر، جدید مؤرخین اور بیانات، پیچھے ہٹنا، نیا مطالعہ، سلجوق یونیورسٹی شعبۂ زبان وادبِ اردو، قونیہ ۲۰۰۰ء (نگران: لیکچرر نورائی اوزپنچ شن Nuray ÖzençŞen، یہ مقالہ نگار کے عزیز کی انگریزی تصنیف A History of the Idea of Pakistan کے صفحات ۲۸۲ سے ۳۲۷ تک کا ترجمہ ہے، غیر مطبوعہ)۔

۱۰۔ شنائی بویوک پترآک (Şenay Büyükpıtrak)، ترک مصنفوں کی اقبال پر ترکیہ میں کی ہوئی تحقیقات، سلجوق یونیورسٹی شعبۂ زبان وادبِ اردو، قونیہ ۲۰۰۲ء (نگران: لیکچرر نورائی اوزپنچ Nuray Özenç، غیر مطبوعہ)۔

ترکی میں اردو کیوں سیکھتے ہیں؟

ڈاکٹر خلیل طوق اُر

ترکی میں اردو کیوں سیکھتے ہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب اب تک نہ میں دے سکا نہ ہی اردو دان لوگ۔ مجھے یہ تو علم ہے کہ میں بذات خود کیوں اردو سیکھنے لگا لیکن اس کا سبب اردو بولنے والوں کو نہیں سمجھا سکا اور بالخصوص وہ اردو دان لوگ جو اپنی زبان کو ایک سیکنڈ کلاس (!) کی زبان ماننے کی عادت رکھتے ہیں اب تک اس راز کو نہ سمجھنے کے لیے بڑی استقامت سے کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے مطابق اس گلوبل ویلج جس کی واحد زبان صرف اور صرف انگریزی ہے، کوئی اور زبان بالخصوص اردو جیسی ایک زبان سیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اِن کے خیال میں انگریزی جانو تو دنیا میں تمام دروازے آپ کے سامنے کھل جائیں گے تو کیوں اردو سیکھنے کی تکلیف اُٹھائی جائے۔ لیکن خود اہل زبان کی اردو کے خلاف ثابت قدمی کے ساتھ سعی ومحنت کے باوجود دنیا کے مختلف ملکوں میں کم از کم یونیورسٹی کی سطح پر اردو کی تعلیم جاری ہے اور ترکی دنیا کے ان مختلف ملکوں میں سے ایک ہے۔

ترکی میں اردو کیوں سیکھتے ہیں؟ اس سوال کو مختلف پہلوؤں سے جانچا جاسکتا ہے لیکن یہاں ہمارا مقصد اس موضوع پر تفصیلی مضمون لکھنا نہیں ہے۔ در اصل اس لئے یہ کوشش کی جائے گی کہ استنبول یونیورسٹی، ادبیات فیکلٹی، شعبہ زبان وادبیات اردو کے طالبعلموں سے لئے گئے مندرجہ ذیل بیانات سے اس سوال کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے۔ لیکن اس سے قبل مختصراً اس کی وضاحت کرنا چاہوں گا تا کہ قارئین کرام کے لیے موضوع کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

مجموعی طور پر اگر ان پر بحث کرنی ہے تو یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ترکی میں اردو سیکھنے کی ایک اہم وجہ برصغیر کے لوگوں کے ساتھ ترکوں کے دلی روابط ہیں۔ صدیوں سے برقرار دوستی اور برادری کے احساسات دن بہ دن کم ہونے کے باوجود اب تک ہمارے دلوں میں بسے ہوئے ہیں اور بعض طالبعلم بس اسی بناء پر ہی اردو سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری وجہ ترکی میں یونیورسٹی میں داخلے کے امتحانات کا نظام ہے۔ اس نظام کے مطابق طالبعلم ہائی اسکول کے جس شعبے سے فارغ التحصیل ہوں اسی شعبے کے مطابق ان کو یونیورسٹی میں داخلہ ملتا ہے۔ اور امتحانوں سے اخذ کئے گئے نمبروں کے مطابق وہ مختلف شعبوں میں جاتے ہیں اور یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ اردو میں داخلے کے لیے ضروری نمبروں کی نسبت دوسری زبانوں سے کم ہے۔ دراصل یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ داخلے کے امتحان میں اردو کے لیے ضروری نمبر کم ہیں ورنہ ہمارے طالبعلموں کی تعداد آج سے بھی بہت کم ہوتی۔ یہ دو مثبت پہلو ہیں جو ترکی میں اردو کی تعلیم میں محرک ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے منفی پہلو بھی ہیں جو ترکی میں اردو تعلیم کے سامنے رکاوٹ پیدا کر دیتے ہیں۔

طالبعلم اپنے مستقبل کے لیے یونیورسٹیوں میں آتے ہیں۔ اور اردو زبان سیکھ کر ان کا جو مستقبل بننا ہے وہ ذرا مشکوک ہے۔ کیونکہ برصغیر کے انگریزی کے دل دادہ لوگ انگریزی دانی میں اتنے مست ہوگئے ہیں کہ ان کو آگے پیچھے کا کچھ خیال ہی نہیں رہا ہے۔ اگر کسی زبان کے بولنے والے اپنے ملک میں اپنی قومی زبان کو چھوڑ کر تجارت سے لے کر سیاست تک اپنے تمام کام کسی غیر زبان میں کرنے لگیں گے تو دوسروں کے ہاں ان کی زبان کے احترام کی گنجائش رہتی ہے کہ نہیں؟ اور ایک ایسی زبان کو اجنبی سیکھنا چاہیں گے کہ نہیں؟ پھر بھی اس کے باوجود کچھ طالبعلم اپنا شوق لے کر آتے ہیں اور اردو سیکھنے لگتے ہیں تو ان کے سامنے اردو دانوں کی سخت مخالفت کھڑی ہو جاتی ہے۔ یقین کیجئے میرے طالبعلموں کے ساتھ یہ واقعہ بھی ہوا ہے کہ وہ کسی سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے پاکستان کے معتبر ادارے کے آفسر کے پاس گئے تو ان سے یہ کہا گیا ''آپ لوگوں کے پاس عقل کی کمی ہے کہ اردو سیکھتے ہیں اردو سیکھ کر کیا کریں گے، انگریزی سیکھیں کسی اور زبان کی ضرورت نہیں!'' یہ کہنے والے صاحب کو یہاں تک کا پتا نہیں کہ اردو سیکھنے کے لیے جو طالبعلم ہمارے پاس آتے ہیں وہ داخلے کے امتحان میں انگریزی، جرمن یا فرانسیسی زبانوں میں سے کسی ایک زبان کے سوالات حل کر کے ہمارے شعبوں میں آتے ہیں۔ یعنی ان کو کسی یورپین زبان کی اچھی خاصی دسترس ہوتی ہے۔

یہ ایک منفی پہلو ہے۔ دوسرا منفی پہلو یہ ہے کہ دوستی اور قلبی ارتباط کے باوجود ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ اردو ترکی کا لفظ ہونے کے باوجود کسی مشخص ملک سے عنوانی تعلق قائم نہ رکھنے کی وجہ سے ذہنوں میں کوئی پہلو اجاگر نہیں کرتی ہے۔ سو ترکوں کے ذہن میں بھی پہلی دفعہ سننے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اردو کونسے ملک کی زبان ہے؟ پھر جس زبان سے لوگ ناشناس ہیں اس زبان کو سیکھنے کی طرف کم رغبت ہوتی ہے۔ اور ترکی میں اردو زبان وادب سے تعارف نہ کروائے جانے کی وجہ سے بھی اردو میں دلچسپی لینے والوں کی تعداد گھٹتی ہے۔

باقی آپ سوچئے کہ ترکی میں کیوں اردو سیکھتے ہیں؟ یہاں میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ ترکی میں اردو سیکھنے کے تمام تر وجوہات پر حاوی ایک تفصیلی مضمون لکھوں۔ میری باتیں بس اس موضوع کی کچھ جھلکیاں ہیں جس کی تفصیل ہمارے طالبعلموں کے بیانات میں بخوبی نظر آئیں گی۔

گللوشاہ یلماز (Gullusah Yilmaz)

یونیورسٹی کے امتحانات سے پہلے انٹرنیٹ کے ذریعے ایک مختصر تحقیق کی۔ میں ہائی اسکول سے غیر ملکی زبان اور ادبیات کے شعبے سے فارغ التحصیل ہونے کی وجہ سے میری پہلی ترجیح اجنبی زبان کا شعبہ تھی۔ اس کے بعد دو

یونیورسٹیوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔اُن میں سے ایک استنبول یونیورسٹی ادبیات فیکلٹی شعبہ اردو زبان وادبیات اور دوسری انقرہ یونیورسٹی شعبہ اردو زبان و ادبیات۔ اِن دونوں یونیورسٹیوں میں سے ایک میں داخلہ لینے کے لیے سوچنے کی وجہ کچھ نئی چیزیں سیکھنے کی خواہش تھی اور انگریزی زبان تو اب سب کو آتی ہے اور جگہ جگہ انگلش کے لیے کورس موجود ہیں۔اردو کوئی نہیں جانتا۔ یہاں تک کہ ننانوے (۹۹) فی صد لوگ اردو زبان کس ملک میں بولی جاتی ہے یہ بھی نہیں جانتے۔لیکن میں جانتی ہوں یہ میرے لیے اہم ہے۔اور آگے چل کر میں اردو میں ایم اے کرنا چاہتی ہوں۔پاکستان جا کر وہاں کے لوگوں کو اردو بولتے ہوئے سننا چاہتی ہوں اور کسی سرکاری ادارے میں اردو کی فروغ کے لیے کام کرنا چاہتی ہوں۔

دویگو بہار (Duygu Bahar)

سب سے پہلے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں شعبے سے منسلک ہونے سے پہلے اِس کے بارے میں مجھے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ یہاں تک کے اردو زبان کی الف بے تک نہیں جانتی تھی۔لیکن اردو زبان سے متعلق پہلے سے میرے ذہن میں کوئی منفی رائے نہیں تھی۔ جب بھی اردو زبان وادب سے متعلق کوئی نئی چیز سیکھتی تو میری دلچسپی اس کے ساتھ اور بھی بڑھتی جاتی۔اِس کے ساتھ ساتھ ایک مشرقی زبان ہونے کی بناء پر مشرقی ثقافت اور مشرقی انسانوں کی طرزِ معاشرت بھی میری دلچسپی کا باعث بنی۔کیونکہ ایک زبان سیکھنے کے لیے جس قدر اس زبان کے قواعد وقوانین جاننے اور لکھنے کی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے اس کو مکمل طور پر جاننے کے لیے اسی قدر اس زبان کو بولنے والے لوگ، علاقہ، ثقافت، ادبیات، سیاست اور تاریخ کے بارے میں بھی جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں ترکی میں مشرقی زبانوں اور ادبیات کی تعلیم سے مطمین نہیں ہوں۔مثلاً اردو ادبیات کی طالب علم ہونے کے ناطے پاکستان کے اعلیٰ سطح کے تعلیمی اداروں کے ساتھ معلوماتی اور علمی ارتباط معدوم ہے۔اپنے طور پر اپنے شعبے میں پاکستانی مہمانوں کو وقتاً فوقتاً دیکھنا چاہتی ہوں۔میرے لئے ان کے ادبی خیالات سے واقف ہونا اور ان کو اردو بولتے ہوئے سننا دلچسپی کا باعث ہوگا۔

خاقان یلدزآل قان (Hakan Yildazalkan)

شعبہ اردو زبان اور ادبیات کا انتخاب کرنے کی پہلی اور بڑی وجہ اسکول کے شعبۂ لسانیات سے فارغ التحصیل ہونا اور دوسری وجہ انگریزی کے علاوہ ایک اور زبان سیکھنے کی خواہش تھی میں چاہتا تھا کہ جو زبان میں سیکھوں گا وہ کوئی ایسی زبان ہونی چاہیئے جس کا تعلق مشرق سے ہو۔کیونکہ انگریزی مغربی زبان ہے اور مغربی زبان جاننے کے ساتھ ساتھ مشرق سے رابطے کے لیے مشرقی زبان بھی جاننے کی ضرورت ہے۔اس لئے میں نے مشرقی زبانوں میں سے اردو کو چُنا۔

موگے آندچ (Muge Andac)

میں بہت سالوں سے انگریزی پڑھتے پڑھتے تنگ آ گئی تھی۔اس لئے کوئی مختلف زبان ہونی چاہیئے سوچتے ہوئے اردو زبان و ادبیات کے شعبے کا انتخاب کیا۔فی الحال میرے لیے تھوڑی سی مشکل ہی سہی لیکن پھر بھی ایک نئی زبان سیکھنے کا شوق میرے لئے خوشی کا باعث ہے۔جب میں نے پہلی دفعہ اردو الف بے کو دیکھا تو نا امیدی کا شکار ہوگئی،لیکن پھر وقت کے ساتھ ساتھ میں نے یہ محسوس کیا کہ جتنی زیادہ میں اس سے قریب ہوتی ہوں اتنے ہی زیادہ وہ میرے لیے اپنے دروازے کھول دیتی ہے۔ اِس زبان کا انتخاب کرتے ہوئے داخلے کے امتحان کی فہرست میں اتفاقاً اس کا نام لکھا تھا لیکن اب یہ بات اہمیت کی حامل نہیں ہے۔کیونکہ میں یہ زبان سیکھنے پر خوش ہوں۔

ایمل اوزچیلک (Emel Ozcelik)

سچی بات تو یہ ہے کہ میں اِس شعبے میں داخل ہونے تک اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔اس وقت تک میرے ذہن میں کسی ایسے شعبے کو چننے کا خیال تک نہ تھا۔اِس شعبے میں داخل ہونے کی بڑی وجہ یونیورسٹی کے داخلے کے امتحان میں جو نمبر میں نے لئے وہ میری قسمت ہے۔لیکن اگر آپ مجھ سے یہ سوال کریں کہ اس شعبے سے منسلک ہونے پر خوش ہو تو میرا جواب ''جی ہاں'' ہوگا۔میں خوش ہوں اور اس سے محبت کرنے لگی ہوں۔اور اب یہ سوچتی ہوں کہ اچھا ہوا جو اس شعبے میں داخلہ ملا۔ایک نئی زبان سیکھنا سچ مچ بہت دلچسپ ہے اور اوپر سے اگر آپ کو شوق بھی ہو اور یہ کام خوشی خوشی کر رہے ہوں تو اور بھی دلچسپ ہو جاتا ہے۔مختصراً شروع میں جس زبان کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتی تھی اور اس کو سیکھ پاؤں گی کہ نہیں کا ڈر مجھے لاحق تھا اب میرے لیے خوشی کا باعث ہے۔

برگل دورموش (Birgul Durmus)

اردو زبان کو انتخاب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بہت پہلے سے عربی الف بے میرے لئے دلچسپی کا باعث تھی۔ مڈل اسکول میں طالبعلمی کے دوران اسی دلچسپی کے سبب عربی زبان کو زیادہ اچھے طریقے سے سیکھنے کے لیے عربی زبان میں تعلیم دینے والے ایک مڈل اسکول میں چلی گئی تھی۔اس کے بعد ہائی اسکول میں بھی شعبۂ لسانیات کا انتخاب کیا۔ یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہوئے ایک مختلف زبان سیکھنے کے ساتھ ساتھ میرے امتحان کے نمبر بھی اِسی شعبے کے لیے کافی تھے۔اور آج اسی وجہ سے اس شعبے میں ہوں۔عربی الف بے اور رسم الخط کو پہلے سے جاننا میرے لئے اردو سیکھنے میں آسانی کا باعث بنے۔ ہمارے شعبے میں اردو کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی زبانیں بھی سکھائی جاتی ہیں اور ان دونوں زبانوں کو سیکھنا میرے خیال میں بڑی خوش قسمتی کی بات ہے۔

سیوال کار (Seval Kar)

اس شعبے کو چننے کی سب سے بڑی وجہ ہندوستان کا میرے لیے جاذب

نظر ہونا ہے۔ بہت سی زبانیں اور ادبیات کے شعبہ جات موجود تھے پڑھنے کے لیے لیکن ہندوستان میرے لیے مختلف ہے۔ اور تاریخی لحاظ سے بھی ایسے ہی ہے۔ کونسے ملک ہیں جنھوں نے ہندوستان پر قبضہ کے لیے نہ سوچا ہو۔ وہ ایک جاذب نظر ملک ہے۔ طرز زندگی اور ثقافت کے لحاظ سے میرے لئے یہ دلچسپی کا باعث تھا اور انہیں وجوہات نے مجھے اس شعبے کے انتخاب کے لیے اور زیادہ اُکسایا۔ اور میری سب سے بڑی خواہش اِس شعبے میں سکھائی جانے والی زبان کو اہل زبان کے منہ سے سننا، ہندوستان اور پاکستان کو مکمل طور پر پھر کر دیکھنا۔ انشاء اللہ آئندہ چل کر ان ملکوں کو مختلف پہلوؤں کو اور زیادہ جان سکوں گی۔

دوگو فرطینا (Duygu Firtina)

اِس شعبے میں داخلے سے قبل مجھے اِس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ ترجیحات کی فہرست میں سب سے آخری نمبر پر اردو زبان تھی۔ وہ بھی میں نے اس لیے لکھ دی تھی کہ اگر کسی اور شعبے میں داخلہ نہیں ملے گا تو اردو ہی پڑھ لوں گی۔ یہ سوچ میرے لیے باعث اطمینان تھی۔ زندگی میں بعض چیزوں کے بارے میں ان کو جانے بغیر ان کے بارے میں رائے قائم کرنے کی اور حتیٰ اُن کو نیچا دیکھنے کی بری عادت کی وجہ سے ''یہ شعبہ اور یہ عجیب سی زبان کہاں سے میرے حصے میں آگئی؟'' سوچ کی سبب بنی۔ لیکن اب میرے لیے اس سلسلے میں کوئی بھی دکھ یا پشیمانی نہیں ہے۔ حتیٰ جب میں یہ کہتی ہوں کہ میں اردو زبان پڑھ رہی ہوں تو میرے سامنے کھڑے، بہت پڑھے لکھے انسان بھی حیرت سے مجھے دیکھ کر یہ پوچھتے ہیں کہ ''وہ کیا ہے؟ کہاں بولی جاتی ہے؟'' اور اسی طرح کے اور بہت سارے سوالات تجسس کے ساتھ پوچھتے ہیں تو اِن کے سامنے اپنے آپ کو بہت عالم فاضل انسان کی طرح محسوس کرتی ہوں۔ مختصراً اُس شعبے میں داخل ہونے پر خوش ہوں۔

☆

○

ڈاکٹر خلیل طوق اُر کے ایم۔اے کے مقالہ کا عنوان ''مرزا اسداللہ غالب، زندگی اور آثار'' اور پی ایچ۔ ڈی کے مقالہ کا عنوان ''ہندوستان میں فارسی اور اردو شاعری اور بہادر شاہ ظفر کے عہد کے شعراء'' تھا جس پر انہیں ۱۹۹۵ء میں ڈاکٹری کی ڈگری عطا ہوئی۔ گویا وہ عہد طالب علمی سے ہی اردو کی زلف گرہ گیر کے اسیر رہے، اور ابھی تک ہیں، خدا اس عشق کو سلامت رکھے۔

اس عشق کا ایک مظہر۔۔۔ان کا اردو کلام ہے جو ''ایک قطرہ آنسو'' کے عنوان سے بزم تخلیق ادب، کراچی سے اگست ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا اور جس کے بارے میں خود صاحب کتاب کا کہنا ہے کہ ''۔۔۔۔۔یہ نظمیں ان لمحوں کی یادیں ہیں جنہیں میں بھولنا نہیں چاہتا۔'' اس پورے مجموعہ کلام کے مطالعے کے اختتام تک بھی یہ گتھی سلجھ نہ سکی کہ کلام زیادہ خوبصورت ہے یا شاعر؟؟؟

پروفیسر ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر

(کراچی)

○

خلیل طوق اُر صاحب اردو سے محبت کرتے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف اردو سیکھی بلکہ اس میں شاعری بھی کی اور نثر بھی لکھی۔ شاعری میں انھوں نے نظم و غزل ہر دو اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''ایک قطرہ آنسو'' کے نام سے جامی بھائی نے کراچی سے شائع کیا تھا۔ ''پرواز'' میں بھی ان کی نظمیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ ان سب سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ وہ غزل کے نہیں نظم کے شاعر ہیں۔

ان کا سفرنامہ ''پیارا ملک ہے پاکستان'' بھی جامی بھائی نے شائع کیا۔ اس کی کمپوزنگ وہیں ہوئی اور اس کی پروف ریڈنگ کے دوران میں نے اسے پوری توجہ سے پڑھا اور شائع ہونے کے بعد دوبارہ صرف اس لیے پڑھا کہ ترک ہونے کے ناطے اردو کے جملوں کی ساخت میں جو غیر ارادی تبدیلی انھوں نے کی ہے وہ میرے لیے دلچسپی کا باعث رہی ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ سے ان کے گہرے شغف نے ان کے اس سفرنامے کو اور بھی کارآمد بنا دیا ہے کہ انھوں نے پاکستان کے ہر اس تاریخی مقام، جہاں بھی وہ گئے، کا تاریخی پس منظر جس قدر انھیں مل سکا، بیان کر دیا ہے۔

شاہین فصیح ربانی

(مسقط)

''صبح نو کے اُجالے''

جمیل یوسف
(مری)

نہ دن خوش آتا ہے، نے رات راس آتی ہے
کہاں یہ صورت، حالات راس آتی ہے

وہ جس سے اپنی ملاقات ہو نہیں سکتی
ہمیں اُس سے ملاقات راس آتی ہے

جو بات سننے کا امکاں نظر نہیں آتا
ہمارے دل کو وہی بات راس آتی ہے

وہ اک نظر جو یہ منظر بدل کے رکھ ڈالے
اُسی نظر کی کرامات راس آتی ہے

ترے جہانِ خرابی میں تیرے بندوں کو
بس ایک شام خرابات راس آتی ہے

میں جانتا ہوں خزاں کی فصلِ گل کا وقفہ ہے
مجھے بہار کی ہر بات راس آتی ہے

الم نصیب فضاؤں کے زرد موسم میں
بہت دنوں میں کوئی بات راس آتی ہے

جو صبح نو کے اُجالوں سے خوف کھاتے ہیں
انہیں فقط شبِ ظلمات راس آتی ہے

وہ جو نوشتۂ دیوار پڑھ نہیں سکتے
اُنہی کو مرگِ مفاجات راس آتی ہے

امین راحت چغتائی
(راولپنڈی)

یوں تر ہر بزم میں وہ حاضر تھے
اُتنے مخفی تھے، جتنے ظاہر تھے

ہر طرف خامشی کا اِک کہرام
اپنے مرقد کے ہم ہی زائر تھے

محوِ پرواز اور نظر نیچی
زیرِ دام آئے جتنے طاہر تھے

راستوں کا قصور کیا اس میں
سارے گم کردہ رہ مسافر تھے

سب درختوں کی چھاؤں میں سستائیں
دار کی چھاؤں میں تو شاعر تھے

ہم کسی سے گلہ کریں کیوں کر
خود ہی مسحور، خود ہی ساحر تھے

ہم بھی کچھ بے ہنر نہ تھے یارو
پھر بھی وہ ہم سے اچھے شاطر تھے

مرے کے پھر یاد بھی بہت آئے
یوں تو ہم کیا تھے، بارِ خاطر تھے

میکدے میں بس ایک راحتؔ رند
ورنہ سب پارسا و طاہر تھے

شبنم شکیل
(اسلام آباد)

ہم نشینو کچھ نہیں رکھّا یہاں پر کچھ نہیں
چھوڑ دو اس کی ہوس دنیا کے اندر کچھ نہیں

در کھُلا ہی رہنے دو گھر سے نکلتے وقت تم
کچھ اگر ہے تو تمہاری ذات ہے، گھر کچھ نہیں

بائیں میں سورج رہے اور چاند دہنے ہاتھ میں
دِل اگر روشن نہیں تو شعبدہ گر کچھ نہیں

میں سراپا رات بھی ہوں، میں سراپا صبح بھی
مجھ سے کم تر کچھ نہیں اور مجھ سے برتر کچھ نہیں

اک چمک آنکھوں میں آ جاتی ہے اس کو دیکھ کر
ورنہ دِل تو متفق ہے آپ سے، زر کچھ نہیں

آئینے سے رو کے پوچھا جب کبھی میں کون ہوں؟
آئینہ بولا وُہیں فوراً پلٹ کر، کچھ نہیں

وقت نے سب دُور کر دی ہیں مری خوش فہمیاں
یہ مِرا مخلص ہے، مجھ کو اِس سے بڑھ کر کچھ نہیں

○

مامون ایمن
(نیویارک)

تنہائی سے باتیں کر لو، دل کا دَر اب کھولو ناں
کرچی کرچی ہیں آئینے، دیوارو! کچھ بولو ناں

جگ سے کٹ کر، جگ سے بچ کر، ہر جائی سے پُروائی
خوش بُو لے کر دَر تک پہنچی، چوٹو! یادیں پھولو ناں

خواہش کے سوکھے دریا میں صحرا اُڑ کر آ پہنچا
ذرّہ ذرّہ موتی ٹھہرا، سانسو! موتی رولو ناں

جگنو سوئے، تارے سوئے، سوئے رستے، منزل بھی
خوابو اٹھو، موندو آنکھیں، چھپ کر خود سے سولو ناں

تھک کر بیٹھو گے تو اک دن مٹّی میں رُل جاؤ گے
جیون کا رستہ لمبا ہے، مَن کا بوجھا ڈھولو ناں

خاموشی کی دستک سُن کر کُنڈی کھولو دھڑکن کی
بستی، صحرا، جنگل ہی کے ساتھی، سنگی ہولو ناں

کالی راتیں، گہرے سائے مہماں ٹھہرے سانسوں کے
شبنم خوابوں کی موجوں سے دیدہ دل کا دھولو ناں

دھندلے آئینوں میں بھی ہیں روشن سچ کے کچھ چہرے
جلتے بجھتے پس منظر سے، منظر کوئی تولو ناں

ساگر کی گہرائی میں بھی طوفاں ہے پایابی کا
تم بھی، ایمنؔ صاحب! دیکھو، کھُل کر، پل بھر رولو ناں

غلام مرتضیٰ راہی

(قافیے میں تصرّف کی معذرت کے ساتھ غالبؔ کی نذر)

(فتح پور، بھارت)

ہیں اور کئی ریت کے طوفاں مرے آگے
پھیلے گا ابھی اور بیاباں مرے آگے

باہر نہیں کوئی بھی مری حدِّ نظر سے
مخفی ہے کوئی، کوئی نمایاں مرے آگے

ہستی مری صحرا ہے، سراب اس کا مقدّر
آخر اُسے ہونا ہے پشیماں مرے آگے

ہُوں میل کے پتّھر کی طرح راہ گزر میں
منزل پہ نظر رکھتے ہیں انساں مرے آگے

بڑھ بڑھ کے یہی دیکھتا آیا ہوں ازل سے
ہر پل رہا روشن کوئی امکاں مرے آگے

کاندھے پہ مرے بوجھ رہا رختِ سفر کا
یوں نکلا کیے بے سروساماں مرے آگے

جو صلح و صفائی میں ہیں پیچھے ابھی راہیؔ
رہتے ہیں بہم دست و گریباں مرے آگے

○

آصف ثاقب

(ایبٹ آباد)

بُرے سے اس طرح اچھا بنایا
مجھے ہے موت نے اپنا بنایا

اسے تخلیق میں اعلیٰ بنایا
بظاہر خاک کا پُتلا بنایا

تمہارے دیکھنے نے یہ تو دیکھو
میں کیسا تھا مجھے کیسا بنایا

ذرا سا داغ تھا سینے کے اندر
محبت نے اسے گہرا بنایا

یہی نسبت ہے میری آسماں سے
ستارہ آنکھ کا تارا بنایا

چُنے تھے میں نے موتی آنسوؤں کے
پھر ان سے ہجر کا سہرا بنایا

دلیل کم نگاہی پیش کی ہے
شجر کی اوٹ کا حیلہ بنایا

کسی دستِ ہنر نے دل کو ثاقبؔ
کھلونے کی طرح توڑا بنایا

پی ایس جین جوہر
(میرٹھ، بھارت)

سنو سنوارے دنیا والوٗ میں نے تم کو پیار دیا ہے
اپنے خونِ جگر سے لکھ کر غزلوں کا اُپہار دیا ہے

اُن اشعار کو جو مجھ پر وارد ہوتے ہیں سانجھ سویرے
غزلوں کی لڑیوں میں پرو کر کتنا سندر ہار دیا ہے

یوں تو میں اردو لکھتا ہوں، ہندی کا بھی گیان ہے مجھکو
میں نے اپنا سارا جیون سرسوتی پر وار دیا ہے

لوگ مجھے خبطی ٹھہرائیں یا مجھ کو دیوانہ کہیں
میں نے جو محسوس کیا ہے وہ کاغذ پہ اُتار دیا ہے

جاگ جاگ کر گیت لکھے ہیں، سوتے سوتے خواب بُنے ہیں
تن آسانی، عیش وطرب کے خواہشات کو مار دیا ہے

کتنا بزرگوں نے پھٹکارا، کتنا عزیزوں نے ٹوکا
کوئی نہ سمجھا دنیا کو قدرت نے اک فنکار دیا ہے

میرا یہ پیغام محبت سب کو ملے سب تک پہنچے
میں نے اردو ہندی والو تم کو کتنی بار دیا ہے

ملک تو بانٹ لیا لوگوں نے، دل کی وراثت بانٹ نہ پائے
شور و سخن کا تحفہ تو اس پار لیا، اُس پار دیا ہے

یہ بھی نہ ہو سب میری کتابیں طاقوں کی زینت بن جائیں
پڑھنے والے دل سے پکاریں جوہر نے شہکار دیا ہے

غالب عرفان
(کراچی)

ہے اک وجود کہ خوابِ رواں کسے معلوم
سفر میں، میں ہوں کہ نظمِ جہاں کسے معلوم

خیال پہلے تھا یا میں خیال سے پہلے
شعور و فکر کے راز ونشاں کسے معلوم

قدم قدم سے عیاں اُس کا نام ہے لیکن
نظر میں وہ ہے کہ نفسِ نہاں کسے معلوم

جو میری فکر سے آگے مجھے تلاش کرے
وہ میرا عکس ہے یا اک گماں کسے معلوم

عبورِ فاصلہ کے مرحلے سے قبل کہیں!
ٹھہر گیا ہے کوئی درمیاں کسے معلوم

فضا میں گونج رہی ہے جو اک صدائے خبر میں
اُسے سنے گا کوئی کب کہاں کسے معلوم

یہ ذہن و دل کے تقاضوں کے مختلف محور
یہ خواہشیں ہیں کہ مجبوریاں کسے معلوم

بلندیوں سے بہت دور، شہرِ عرفاںؔ میں
جو روشنی ہے پسِ آسماں کسے معلوم

انوار فیروز
(راولپنڈی)

اپنی صدا کا خوف مجھی کو ڈرا نہ دے
گہرے کنوئیں کی تہ میں اچانک گرا نہ دے

آئینہ تجھ کو تیری ہی صورت دکھا نہ دے
سورج سے بچ کے چل کہیں تجھ کو جلا نہ دے

اوروں پہ انگلیاں نہ اٹھا اپنی فکر کر
تجھ کو ہی یہ ہوا کہیں پتھر بنا نہ دے

اپنوں کے پھول غیر کے پتھر سے کم نہیں
تو اپنی دوستی کا مجھے آسرا نہ دے

دھندلا رہا ہے رنگ کو صدیوں کی گرد نے
اپنی نظر سے کوئی مجھے اب گرا نہ دے

اپنی صدا بھی اب مجھے پہچانتی نہیں!
اس راستے میں اب کوئی مجھ کو صدا نہ دے

انوار ہر طرف ہیں چٹانیں کھڑی ہوئی
ظلمت کی رات ہی کہیں مجھ کو دغا نہ دے

○

پروین کمار اشک
(شاہ پور کنڈی، بھارت)

دل منزل ہے یا رستا ہے
ایک مسافر سوچ رہا ہے

میری قبر کو کھود کے دیکھو
مٹّی میں کتنا سونا ہے

خالی درگہہ کی چوکھٹ پر
میرا سجدا سسک رہا ہے

دل کے سوکھے پیڑ پہ اب تک
اُس لڑکی کا نام ہرا ہے

تیری نظر کہاں پہنچے گی!
میرا زخم بہت گہرا ہے!

کیسی دعا مانگی ہے ہمنے!
خدا کے گھر کہرام مچا ہے!!

رشتوں میں گرمی لانے کو!
سورج دھرتی پر اترا ہے!

جعلی شاعر کی غزلوں کو!
جعلی قاری ہی پڑھتا ہے!!

خشک پڑا ہے سارا دریا!
اشکؔ تُو کیسے ڈوب رہا ہے!!

چھت سے گرنے والی

عبداللہ جاوید (مسی ساگا' کینیڈا)

آندھی چلی تھی' تیز بہت تیز۔ ہوا کے بدن میں بھوت اُتر کر لڑ رہے تھے۔ ہلکے ہلکے جھونکے' جھکڑوں میں بدل کر' پتنگھاڑ پتنگھاڑ کر ایک دوسرے پر وار کرتے' آپس میں گتھم گتھا ہوتے۔ اُڑ رہے تھے۔ اڑنے کے دوران ہر اس چھوٹی بڑی چیز کو اُڑا رہے تھے جو ان کی زد میں آتی۔ پیڑ' پکھیرو' جھوپڑ' چھپّر' چھت' ستون' کھمبے اور آدم زادوں کا پھیلا ہوا کاٹھ کباڑ۔ جس سے میں نے اس کو بلندی سے نیچے گرتے دیکھا' آندھی تھم کر غبار کی صورت فضا میں آویزاں ہو گئی تھی۔ سیاہ و سپید کا آمیزہ سا جو دکھاتا کم اور چھپاتا زیادہ یا نیم خواب' نیم بیداری کی ملی جلی کیفیت۔ ایسی کیفیت جس کا رشتہ اس ماحول سے اس فضا سے یا خود میرے اندرون سے تھا۔ اصل معاملہ یا مسئلہ یہی تھا کہ سب کچھ غیر واضح تھا۔ اگر کچھ صاف اور واضح تھا تو اس کا گرنا تھا عمارت کی وہ چھت جس پر چلتے ہوئے کافی بلندی سے وہ نیچے گری تھی' ابھی نیم تعمیری حالت میں تھی۔ پہلا سوال تو یہ پیدا ہو رہا تھا کہ شام کے جھٹ پٹے میں وہ ہسپتال کی چھت پر کیا کر رہی تھی؟ یہی سوال میرے اپنے بارے میں پیدا ہو سکتا تھا کہ میں وہاں اس سمے کیوں موجود تھا؟ یہ دونوں سوال بعد کی پیداوار تھے' وقوع پذیر ہو رہا تھا وہ یہ تھا کہ میں دوڑ رہا تھا اس چھت پر جو پوری طرح بنی بھی نہیں تھی۔ اس پر دوڑنا تو رہا ایک طرف چلنا بھی آسان نہیں تھا لیکن میں چھلانگیں لگاتا اور ہر رکاوٹ کو پھلانگتا ہوا اس نیم پختہ زینے کی جانب جلد سے جلد پہنچنا چاہ رہا تھا جو مجھے نچلی منزلوں تک لے جا سکتا تھا تاکہ اس تک پہنچ سکوں۔ وہ جو میری نظروں کے سامنے چوتھی منزل کی چھت سے نیچے گر پڑی تھی اگرچہ میں جانتا تھا کہ جب تک میں نیچے پہنچوں بہت تاخیر ہو چکی ہوگی پھر بھی میں یہ چاہتا تھا کہ زینہ جلد آ جائے۔ لیکن زینے پر قدم رکھتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ میں غلط زینے پر تھا۔ یہ وہ زینہ نہیں جس پر چڑھ کر میں ہسپتال کی چھت پر گیا تھا اپنے یار انجینئر راجا اکرم سے ملاقات کرنے' جسکے بارے میں نیچے اطلاع ملی تھی کہ وہ چھت پر ہو سکتا تھا۔ جیسے ہی میں زینے سے راہداری میں پہنچا مجھے معلوم ہو گیا کہ میں ہسپتال کی عمارت کی پشت پر نرسوں کے اپارٹمنٹس کی عمارت میں اتر پڑا تھا۔ دوڑتا ہوا جب میں ایلیویٹر کی جانب گیا تو دو نرسیں چیختیں چلاتی میرے پیچھے دوڑیں۔ پتہ نہیں کیوں وہ فوراً ہی رک بھی گئیں؟ میں آرام سے ایلیویٹر کے ذریعے نیچے اُتر گیا۔ نیچے انتہائی ناسازگار حالات کا سامنا تھا۔ شور ہی شور تھا۔ راستے پر ایک ٹریکٹر کھڑا تھا جو رُکا ہونے کے باوجود شور کر رہا تھا۔ کسی اللہ کے بندے کے ذہن میں یہ خیال نہیں آ رہا تھا کہ اس کو بند کر دے۔ قدرے فاصلے پر فولادی سریوں سے لدا ہوا ایک ٹرک کھڑا تھا جسکے باہر دو آدمی کسی معاملے پر بلند آواز میں بحث کر رہے تھے۔ ان دونوں سے قطع نظر کر کے میں اس نرس کی جانب گیا جو شاید ہسپتال کے شعبۂ حادثات سے آ رہی تھی۔

''اس لڑکی کا کیا ہوا جو چھت سے گری تھی'' میں نے رسمی ہائے ہیلو سے درگزر کرتے ہوئے نرس سے دریافت کیا۔ نرس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے وہ میرے سوال کو سمجھنے سے قاصر ہو۔ ''چھت سے گری تھی۔ کس چھت سے گری تھی۔؟'' اس سے پہلے کہ نرس کا سوال مجھ سے جواب کا طالب ہو میں آگے دوڑ گیا۔ شعبۂ حادثات کی کھڑکی پر ایک جوان نرس فون پر بات کر رہی تھی۔ دوسری سے جو قدرے بوڑھی تھی میں نے چھت سے گرنے والی کی بابت دریافت کیا وہ ایسی بن گئی جیسے اس پورے واقع سے لاعلم ہو۔

''لیزا ذرا سنو یہ صاحب کیا پوچھ رہے ہیں۔؟'' بوڑھی نرس نے جوان نرس کو مخاطب کیا۔ ''کیا پوچھ رہے ہیں۔؟'' جوان نرس نے سوال دہرایا۔ ''یہ کسی کو پوچھ رہے ہیں جسکو انہوں نے ہسپتال کی چھت سے نیچے گرتے دیکھا تھا۔'' بوڑھی نرس نے میرے سوال کو طنزیہ انداز میں نشر کیا۔ ''ہسپتال کی چھت سے تو کوئی نیچے نہیں گرا۔'' اچانک نہ جانے کس کونے سے ایک وارڈ بوائے نمودار ہوا اور بولا۔ میں جو غم زدہ تھا' اس کے لئے ذہنی اور دلی کرب میں مبتلا تھا اس وارڈ بوائے پر پھٹ پڑا۔ اگر کاؤنٹر کیبن کی نیم دیواری درمیان میں حائل نہ ہوتی تو میں اس وارڈ بوائے کا منہ نوچ لیتا۔

''ظالمو! بے دردو! تم سب نے اس معاملے کو دبانے کی سازش کر رکھی ہے۔ مجھے سچ بتا دو۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤنگا ہسپتال کو بدنام نہ ہونے دونگا۔ جاؤ اپنے ایڈمنسٹریٹر سے بولو ایک بندہ ہے جو ہر طرح کے فارم پر دستخط کرنے کے لئے تیار ہے۔ میں یہ بیان دینے میں راضی ہوں کہ وہ چھت سے نہیں گری تھی بلکہ میں اسے سڑک سے اٹھا لایا تھا۔ میں سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اس کے لئے۔ اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔ مجھے اس کے پاس جانے دو۔ مجھے بتاؤ تم لوگوں نے اسے کہاں چھپا رکھا ہے۔'' میں نہ جانے کب تک اور کیا کیا بکے جاتا' اچانک میری نظریں اس وارڈ بوائے پر پڑیں جو میرے سامنے ہاتھ ملتا کھڑا تھا۔ دونوں نرسیں بھی اس کے پاس کھڑیں میری جانب ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھیں جیسے میری حالت پر ترس کھا رہی ہوں۔ اس تمام دوران میں شاید روتا بھی رہا تھا اور اسی سبب سے ماحول سے بالکل بے خبر ہو گیا تھا۔ ہسپتال کی اس راہداری میں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ میں ان کی جانب پلٹا اور گریہ کرتے ہوئے ان سے گرنے والی کے بارے میں پوچھا۔ ان لوگوں نے بھی مجھ پر ترس کھانے والی نظریں ڈالیں اور وہاں سے کھسک گئے۔ ہسپتال کی راہداری میں آگے جانا بے کار تھا۔ میں نے نیچے اتر کر ہسپتال کے صحن میں دوڑ لگا دی۔ چشم زدن میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں اس کے گرنے کا سب سے زیادہ امکان تھا۔ میرے حساب سے اس کو عمارت کے قریبی لان میں کسی جگہ گرنا تھا یا اس چھوٹے سے کیبن کی چھت پر جو دیوار کے ساتھ تھا اور جس میں مالی اپنا سامان

رکھتا تھا یا پھر ان چار جُڑواں گیراجوں میں سے کسی ایک کی چھت پر جو ہسپتال کے چار بڑوں کی گاڑیوں کے لئے مختص تھے۔ میں اس ہسپتال کے پورے جغرافیے سے واقف تھا اسی سبب سے اس تمام نواح میں پوچھ گچھ کر کے اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ معاملہ اتنا آسان نہیں رہا تھا۔ کہیں نہ کہیں کچھ غلط تھا یا غلط کیا جا رہا تھا۔ ہسپتال والے ضرور کچھ چھپا رہے تھے۔ اس کو گرتے ہوئے بہت کم آدمیوں نے دیکھا ہوگا اور ان کم آدمیوں میں سے مجھے کسی ایسے آدمی کی تلاش تھی جو زبان کھولے اور وقوعے پر روشنی ڈالے۔ یوں بھی بڑی تاخیر ہو چکی تھی۔ میں نے یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنے حواس پر پوری طرح قابو رکھونگا (اگرچہ میرے اندر کوئی روئے جا رہا تھا)۔ مجھے جذباتی اور بدحواس دیکھ کر مصلحت پسندی کے مارے لوگ ترس تو کھا سکتے تھے لیکن زبان نہیں کھول سکتے تھے۔ اس معاملے میں بیشتر عوامل میرے اور اس چھت سے گرنے والی کے خلاف جاتے تھے اور جیسے جیسے سے گزرتا جاتا تھا' رات بھی آتی جاتی تھی۔ جس وقت وہ گری تھی یا میری آنکھوں نے اس کو ہسپتال کی چھت سے نیچے گرتے دیکھا تھا' شام پڑ رہی تھی لیکن اب تو رات تھی۔ رات میں ادھر اُدھر پھرنا خواہ ہسپتال میں ایسا فعل ہے جو ہسپتال کے نگراں عملے کی نظروں میں آ سکتا تھا۔ میں ہسپتال کی اس پوری عمارتی اکائی (Unit) کے اطراف اچھی طرح دیکھ بھال کرتے ہوئے چکّر لگا چکا تھا جسکی چھت سے وہ گری تھی۔ وہ یا اس کے بدن کا نام ونشان بھی نہیں ملا۔ دل گریاں کے ساتھ میں ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ اس بنچ پر پہلے سے کوئی پراگندہ لباس' پراگندہ حال بوڑھا آدمی بیٹھا تھا۔ اس کی بھویں چوڑی' کمانی دار اور سپید تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے آنکھوں کی کھڑکیوں کے اوپر دو سپید چھجے بنے ہوں میں نے اس کو بس اتنا ہی دیکھا تھا کہ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا پارکنگ کی جانب چلا گیا۔ چلتے چلتے اس نے میری طرف دیکھے بنا مجھ سے کہا۔ ''قبرستان۔ ہسپتال کا قبرستان'' اس کے جاتے ہی پارکنگ کے عقب سے اذان کی آواز میرے کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس سے قبل شاید اسی لئے سنائی نہیں دی کہ میں ایک ہی خیال میں گم رہا تھا۔

''حیّ علی الصلوۃ. حیّ علی الصلوۃ'' نماز کی طرف آؤ۔ نماز کی طرف آؤ۔ ''حیّ علی الفلاح. حیّ علی الفلاح'' فلاح کی طرف آؤ۔ فلاح کی طرف آؤ۔ میں بنچ سے اٹھا اور ہسپتال کی مسجد کی طرف روانہ ہو گیا یا اس کی جانب جسکی جانب ہر مشکل میں سارے آدم زاد رجوع ہوتے ہیں یہ میں نہیں بتا سکتا۔ وضو بنا کر نماز میں شریک ہوا اور نماز کے بعد مسجد میں پوچھ گچھ کی۔ نمازیوں میں زیادہ تعداد ان کی تھی جو بیمار تھے یا بیماروں کے رشتے دار اور احباب تھے میں نے ہر چہرے کو دعا کرتا ہوا پایا۔ ہسپتال آدمی کو جتنا خدا کے قریب کر دیتا ہے کوئی عبادت گاہ شاید ہی اتنا قریب کرے۔ چھت سے گرنے والی کے بارے میں پوچھ گچھ بیکار گئی۔ نمازی بھی جلدی میں تھے مسجد سے نکل کر میں نے سوچا ''اب ایک ہی راستہ تھا اور وہ راستہ راجا اکرم کی طرف جاتا تھا۔ ایک مرتبہ پھر اس سے ملنے کی کوشش کرنی چاہیے شاید وہی میری مدد کرے۔''

مسجد سے باہر آ کر ایک بار پھر اس علاقے میں پہنچا جہاں ٹرک وغیرہ کھڑے تھے۔ فولادی سریوں والا ٹرک غائب تھا لیکن ان دو آدمیوں میں سے جو کسی بات پر تکرار کرتے ملے تھے ایک جو قدرے موٹا' پستہ قد جو اپنی خشخشی مونچھ اور داڑھی میں خاصا اہم اور معتبر لگتا تھا موجود تھا۔ ٹریکٹر جہاں کھڑا تھا وہیں ڈٹا ہوا تھا لیکن کسی نے اس کو بند کر دیا تھا اس سبب سے خاموش تھا۔ میں نے اس الفربہ خواہ مخواہ معتبر سے بعد سلام راجا اکرم کے بارے میں دریافت کیا۔ راجا اکرم کا نام سنتے ہی وہ کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''آپ نے ان سے ملنا ہے تو جھٹ پارکنگ کی طرف دوڑ جایئے۔ وہ ابھی ابھی ادھر گئے ہیں۔''

ابھی اس کا فقرہ مکمل بھی نہ ہوا ہوگا میں دوڑ پڑا۔ راجا اکرم پارکنگ کے راستے ہی میں مل گیا۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے جو ٹیگینیشن لگتے تھے۔ مجھ سے رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔ ''میں گھر جا رہا تھا۔ چلو کسی قریبی ریستوران چلتے ہیں۔''

''مجھے تم سے کچھ کام ہے۔ ہسپتال کے اندر ہی بات کرینگے'' میں نے جواب دیا۔ راجا نے میری جانب غور سے دیکھا۔ یہ انجینئر قسم کے لوگ آدمی کو پڑھ لیتے ہیں۔ امپرسنل جو ہوئے۔ ایک ہلکے سے اشارے سے راجا نے ان دونوں بندوں سے چھٹکارا پا لیا۔ وہ سلام کر کے رخصت ہوئے پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''تیری تو بُری حالت ہے۔ کیا ہسپتال میں کوئی سیریس ہے۔؟''

''راجا میں تو اس مطلب سے آیا تھا کہ تجھے جلد سے جلد وہ چیز پیش کروں جو خاص تیرے لئے منگوائی ہے۔''

وہ آ گئی۔ مزہ آ گیا۔ اس خانہ ساز میں جو بات ہے وہ باہر کی مہنگی سے مہنگی شراب میں نہیں۔ لیکن یہ تیرے چہرے کو کیا ہو گیا ہے۔؟ پورے بارہ بج رہے ہیں۔'' راجا کو تیز کلامی کی عادت تھی وہ لمبی سے لمبی بات ایک سانس میں کہہ دیتا تھا۔

''تیری چیز آ گئی اور۔ اور میری چیز چلی گئی۔'' میں نے گریہ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ میرے روتے بسورتے چہرے نے اسے بتا دیا ہوگا کہ میں کسی بڑے دُکھ میں مبتلا ہوں۔ اس کا چربی چڑھا طبّاخی چہرہ ایک دم لٹک سا گیا۔ وہ میرا قریبی دوست تھا ہم برسوں سے ایک دوسرے کے سکھ دکھ بانٹ رہے تھے اور آپس میں بے تکلف بھی تھے۔ ''تو پیتا بھی نہیں۔۔۔ تو پھر یہ تیری چیز چلی گئی۔۔۔ صاف بتا دے مرے بھائی۔ بات کیا ہے؟'' وہ اپنائیت سے بولا۔

''وہ جو ہسپتال کی چھت سے نیچے گری ہے'' میں نے اس طرح کہا کہ میرے الفاظ ٹوٹ پھوٹ رہے تھے۔

''اس ہسپتال کی چھت سے آج تک کوئی نہیں گرا۔'' راجا نے اپنی

بھویں اوپر اٹھا کر اور آنکھوں کو پوری طرح کھول کر اعتماد کے لہجے میں کہا۔

''راجا۔تمہیں کیسے یقین دلاؤں۔آج ہی آج کی شام جب میں تمہاری تلاش میں اوپر نیم تعمیر چھت پر پہنچا۔تم تو نہیں ملے لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے۔۔۔۔اس کو چھت سے نیچے گرتے دیکھا۔نیچے دوڑا آیا ہر طرف دیکھا' پوچھ گچھ بھی کی۔۔۔۔اب تم سے مدد چاہتا ہوں۔''

''کیسی مدد۔؟'' راجا مجسم سوال ہو گیا۔اس کے لہجے میں اخلاص تھا۔''راجا۔مجھے یقین ہے کہ ہسپتال کی بدنامی کے خوف سے اس پورے واقع کو دبایا جارہا ہے۔میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے اثر ورسوخ کو استعمال کرو اور اس گرنے والی کا پتہ چلاؤ۔'' اتنا کہہ کر میں رونے لگا اور وہ بھی آواز کے ساتھ۔شاید میرے صبر اور ضبط کا بندٹوٹ چکا تھا۔مجھے روتا دیکھ کر راجا اکرم مجھ سے لپٹ گیا اور جب وہ علیحدہ ہوا تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔''میں ابھی پتہ چلا لیتا ہوں۔تم میرے ساتھ چلو۔دفتر کھلوائے دیتا ہوں۔تم بیٹھ کر چائے پیو اور میں اس مہم پر روانہ ہوتا ہوں۔'' گریہ سے بھرائی ہوئی آواز میں وہ بولا۔'' میں چائے وائے نہیں پی سکوں گا۔بس تم گرنے والی کا پتہ چلاؤ اور ہاں میری طرف سے یہ وعدہ کہ ہسپتال کی بدنامی کا باعث نہیں بنونگا'' میں راجا کے پیچھے چلا۔شعبۂ تعمیرات کی چھوٹی سی خوبصورت عمارت میں اس کا دفتر تھا۔دفتر میں ابھی تک کام ہو رہا تھا۔دو چار آدمی ایک بڑا سا بلو پرنٹ دیکھ رہے تھے۔سپید گاؤن میں ملبوس ایک لمبا پتلی مونچھوں والا گنجا آدمی کسی نقشے پر بات کر رہا تھا۔اس کے الفاظ میں سماعت تک پہنچ تو رہے تھے لیکن سنائی نہیں دے رہے تھے۔راجا اکرم نے اپنا کمرہ کھلوالیا اور میں اس کمرے کے ایک صوفے میں دھنس گیا جو ایک کونے میں رکھا تھا۔اس دوران راجا اکرم باہر جا چکا تھا میری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔آنسوؤں کی ہر چھوٹی بڑی لڑی میں ''وہ'' تھی۔وہ جو میری نہ ہوتے ہوئے بھی میری تھی۔ارض وسما میں بلکہ شاید پوری کائنات میں صرف اور صرف وہی تو تھی جو حقیقی معنوں میں میری تھی۔چھت پر سے گرنے کے باوجود وہ زندہ سلامت تھی۔اسے کچھ نہیں ہوا تھا۔''اسے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔'' میں نے اپنے آپ کو یقین دلایا۔مجھے یاد آیا اس نے مجھے لکھا تھا''جب تک میرا حافظہ نہ جاتا رہے میں تمہیں نہیں بھولونگی۔''اس نے اپنے مرنے کا نہیں لکھا تھا تو پھر وہ کیسے مر سکتی تھی۔؟'' اسے مرنا نہیں ہے۔مجھ سے پہلے تو ہرگز نہیں'' مجھے نہیں معلوم صوفے پر بیٹھے ہوئے میں روتے روتے بے ہوش ہو گیا تھا یا اس کی یاد میں گم ہو گیا تھا۔جب میں ہوش میں آیا راجا اکرم کا چپراسی مجھ سے مخاطب تھا۔''صاحب چائے حاضر ہے۔'' میں نے چپراسی کو دیکھا۔وہ مجھے کسی اور دنیا سے آئی ہوئی مخلوق لگا۔اصل بات یہ تھی کہ میں خود کسی اور دنیا میں پہنچا ہوا تھا اور چپراسی کی آواز نے مجھے اسکی دنیا میں لا ڈالا تھا۔''اللہ بخش۔تم نے چائے بیکار ہی بنائی۔میں نے تمہارے صاحب کو پہلے ہی منع کر دیا تھا۔اب تم یوں کرو کہ چائے واش بیسن میں انڈیلو اور کپ دھو ڈالو۔تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' میں نے چپراسی سے کہا۔''یہ آپ شکریہ کہہ کر شرمندہ نہ کریں صاب جی۔میں آپ کا نوکر ہوں جی۔خادم ہوں۔'' چپراسی بولا لیکن اس نے چائے کا کپ رکھا رہنے دیا۔وہ چاہتا تھا کہ اس کا صاحب راجا اکرم کسی طرح چائے کا کپ دیکھ لے۔اسی لمحے راجا اکرم آ پہنچا اور میرے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔میں نے اس پر ایک نظر ڈالی۔۔۔وہ ناکام لوٹا تھا۔

''ان لوگوں نے تم کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ظالم کمینے۔''

''یہی کہ چھت پر سے آج شام کوئی نہیں گری۔''

''اس کا مطلب ہسپتال کا ایڈمنسٹریٹر معاملے کو دبانے پر تُلا ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر میں اٹھا اور باہر جانے لگا۔راجا اکرم میرے تیور دیکھ کر اُٹھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا۔

''تم کہاں چلے۔؟''

''اس خبیث ایڈمنسٹریٹر سے نمٹوں گا۔''

''تم ہوش میں ہو۔؟ ہمارے پاس ایک گواہ بھی ایسا نہیں ہے جس نے اس کو چھت سے نیچے گرتے دیکھا ہو۔''

''میں ہوں نا۔میں نے اسے چھت سے نیچے گرتے دیکھا تھا'' یہ کہہ کر میں کسی چھوٹے بچے کی مانند رو پڑا۔''میں نے گرتے دیکھا تھا اپنی جان کو۔اپنی روح کو۔''

''جب ایڈمنسٹریٹر آپ سے پوچھے گا کہ آپ کی وہ کیا لگتی تھی تو آپ اس کو یہی جواب دینگے کہ وہ آپ کی جان تھی۔آپ کی روح تھی۔آپ کہتے ہیں وہ چھت سے گری تھی تو اس کو ہسپتال میں ہونا تھا اور ہسپتال والے ایسے کسی کیس سے لاعلم ہیں۔اگر اس کے بارے میں آپ سے پوچھ گچھ کی جائے تو آپ اس کی اور اپنی شناخت درج کروائینگے۔؟ مجھے یقین ہے کہ آپ ایسا کچھ نہیں کرینگے۔آپ اس کے لوگوں کا سامنا بھی نہیں کرینگے۔آپ پر یہ الزام بھی آ سکتا ہے کہ خود آپ ہی نے اس کو چھت سے دھکا دیا یا کسی کو اس کام پر لگایا۔بھائی۔کچھ دیر بیٹھو اور اس پورے معاملے پر نظر ثانی کرو۔''

اس لمبی تقریر کے بعد وہ خاموش ہو گیا اور مجھ کو بھی خاموشی کے غار میں دھکیل دیا۔اس غار کے اطراف سوچوں کا جنگل تھا خاموشی کے غار میں خاموشی کے علاوہ وہ بھی تھی جو چھت سے نیچے گر پڑی تھی اور جس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اس کو آسمان کھا گیا تھا یا زمین نگل گئی تھی۔سوچوں کے جنگل میں درندے میرے ذہن کی جانب منہ پھاڑ دھاڑ رہے تھے۔''تو اس کا کون ہے۔؟''

خاموشی کے غار کے باہر آتے ہی میں کھڑا ہو گیا۔رات پڑے دیر ہو چکی تھی۔میری خاطر میرا دوست راجا اکرم بھی اپنے دفتر میں رُکا ہوا تھا اور

''چہارسُو''

چپراسی اللہ بخش کو بھی گھر جانے میں تاخیر ہو رہی تھی میرے ساتھ ہی راجا اکرم بھی کھڑا ہوا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا اس سے جو کچھ بن پڑا وہ کر چکا تھا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کو اپنے دکھ میں شریک کر لیا تھا۔ بغیر کچھ بولے اس نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ میں نے اس کی آنکھوں سے اپنی انکھیں نہیں ملائیں اور دبی زبان میں خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔

ہمیشہ کی طرح باہر کی دنیا معمول کی زندگی گزارنے پر مجبور کرنے پر تلی بیٹھی تھی۔ برسوں سے یہی ہوتا چلا آیا تھا۔ چھت سے گرنے والی مجھ سے الگ کسی اور دنیا میں زندگی گزار رہی تھی۔ وہ میری ہوتے ہوئے بھی کسی اور کی ہو گئی تھی۔ ادھر میں بھی اس کا ہوتے ہوئے بھی کسی اور کا ہو گیا تھا۔ ہم دونوں کی دنیاؤں کے درمیان بڑے فاصلے اور مذہب کی سنگین دیوار حائل تھی۔ ہسپتال سے باہر نکل کر میں نے اپنی گاڑی اپنے گھر کے بجائے ایک ہوٹل کی طرف موڑ دی۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ گاڑی نے مجھے ہوٹل کی طرف موڑ دیا۔ گھر میں اطلاع دے دی کہ میں رات نہ آسکونگا۔ مزید یہ بھی کہہ دیا کہ ممکن ہے مجھے دو تین روز کے لئے اسلام آباد جانا پڑے۔ رات ہوٹل میں گزاری۔ روم سروس وغیرہ منع کر دی اور سختی سے ہدایت کر دی کہ مجھے تنہا چھوڑ دیا جائے ہوٹل کے کمرے میں بغیر معمولات شب اور بغیر کپڑے بدلے' بستر پر گر کر لحاف کے اندر چلا گیا۔ اگر میں اپنے حواس میں ہوتا تو اپنے پرائیویٹ آفس سے سفری ہینڈ کیری لے آتا جس میں ضرورت کی ہر چیز ہمہ وقت پیک رہتی تھی۔ جیسے ہی ہوٹل کے کمرے میں تنہا ہوا وہ میرے پاس آ گئی اور بولی۔

''یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔؟ اپنے آپ کو سنبھالو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں نا۔ ہمیشہ کی طرح۔۔۔۔'' اور میں اس سے لپٹ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

صبح جب میں بستر سے اٹھا تو یوں لگا جیسے وہ پہلے ہی بیدار ہو کر' شاور لے کر باہر چلی گئی ہو۔ جیسے وہ میرے ساتھ ہی رہتی ہو جیسے وہ ہوٹل کا کمرہ نہ ہو بلکہ ہمارا گھر ہو۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ میں نے دانت برش کئے بنا' شیو کئے بنا شاور لئے' روم سروس والا چائے' ناشتے کو پوچھنے کے لئے آیا میں نے منع کر دیا۔ ہوٹل کاؤنٹر پر بل ادا کر کے روم سروس اور واش روم سروس کے بندوں کو مناسب ٹپ دیکر میں باہر نکل تو گیا لیکن گاڑی میں بیٹھنے تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ مجھے آگے کیا کرنا تھا۔؟ گھر جاؤں اور میڈیا سے یہ امید کروں کہ مجھے گھر بیٹھے خبر دے دیں۔ کم از کم اس کی گمشدگی کی خبر تو آئی ہی ہوگی یا ایک بار پھر ہسپتال جاؤں اور ادھر اُدھر معلوم کروں لیکن گاڑی نے خود ہی یہ فیصلہ کر ڈالا کہ گھر کے راستے پر نہیں پڑی۔ اس کے بعد اسٹیرنگ نے گاڑی کو ہسپتال کے گیٹ کے اندر داخل کروا دیا۔ گاڑی پارک کر کے میں انکوائری اور ایمرجنسی کاؤنٹروں کے سامنے بے مقصد چکّر لگانے لگا۔

وہاں رونق تھی۔ میں نے لوگوں پر بھی نظر ڈالی لیکن کسی پر بھی نظر نہیں رُکی بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں شاید دیکھنے سے قاصر رہا اور جلد ہی وہاں سے نکل گیا۔ آئی سی یو وارڈس میں ایک دو نرسوں اور گارڈوں سے سر کھپا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اس کی شباہت رکھنے والی کوئی مریضہ آئی سی یو (I.C.U) میں تو نہیں داخل تھی۔ لیکن ناکام رہا۔ نیچے اتر کر میں نے وہ فیصلہ لیا جو میں لینا نہیں چاہتا تھا۔ ہسپتال کے قبرستان جانے کا فیصلہ۔ اس فیصلے نے ایک بار پھر میری دونوں آنکھوں کو رواں کر دیا۔ میرے اندر کا سب کچھ پانی ہونے لگا۔ میرے لئے بہتر طریقہ کار یہ تھا کہ ہسپتال کے تیسرے گیٹ سے اندر داخل ہوں اور بیرونی دیوار کے آخری سرے پر جھاڑوں سے بنائی ہوئی ایک باڑھ کے پیچھے پہنچ جاؤں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ لاوارثوں کے اس قبرستان میں داخل ہو کر میں نے چاروں اور نظر ڈالی۔ اسلام علیک یا اہل القبور (تم پر سلامتی ہو اے قبر والو) میں نے اپنی دین کی شریعت پر عمل کرتے ہوئے ہلکی لیکن صاف آواز میں کہا۔ اس دوران ایک جوان آدمی' دو دس بارہ سالہ لڑکوں کے ساتھ نہ جانے کہاں سے برآمد ہو گیا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور بولا ''آپ کا کوئی بندہ۔؟'' میں نے اس کو اور ان لڑکوں کو نہ دیکھتے ہوئے دیکھا اور اپنی بہ سبب گریہ بھرّائی ہوئی آواز پر قابو پا کر پوچھا۔ ''کسی مائی کی قبر۔ کل رات یا آج فجر والی'' ''آپ کی کون۔؟'' اس نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔ مجھے اس کے اس سوال پر غصّہ آ گیا۔ ''عجیب دنیا ہے۔'' میں نے سوچا۔ ''یہاں قبروں پر بھی رشتے داروں کا اجارا ہے۔'' اپنی مجبوری پر خود مجھے بھی ترس آنے لگا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے یہی سوال دہرایا۔ ''آپ کی کون۔؟'' اور خود ہی جواب دیا۔ ''میری سب کچھ۔'' یہ جواب میں اس قبرستان کے مجاور نما آدمی کو نہیں دے سکتا تھا سو خاموش رہا۔

''کس کا کون۔؟'' میرے لاجواب ہو جانے کے فوراً بعد کسی نے میرے عقب سے سوال کیا۔ یہ وہی درویش تھا جس نے مجھے ''قبرستان'' کا اشارہ دیا تھا۔ اُس وقت جب میں ہسپتال میں چھت سے گرنے والی کے بارے میں پوچھتا پھر رہا تھا۔ میں نے پلٹ کر اس کو دیکھا۔ اس مرتبہ اس کے بال کھُل کر' دونوں شانوں اور پیٹھ پر لہرا رہے تھے اور اس کے روشن چہرے کو اپنے احاطے میں لیکر روشن تر بنا رہے تھے۔ اس روشنی نے میری آنکھوں میں چکا چوند سی پیدا کر دی اور میری نگاہیں آپ ہی آپ جھک گئیں۔ میں نے دیکھا یا محسوس کیا اس مجاور نما شخص نے اپنے دونوں ہاتھ' ادب سے پیٹ پر ناف کے قریب باندھ لئے تھے دونوں لڑکے بھی ادب کے انداز میں آ گئے اگرچہ انہوں نے آنکھیں نہیں جھکائیں۔ وہ ٹکٹکی باندھے اس درویش کو دیکھ رہے تھے۔

''اسلام علیکم سائیں۔ یا علی مدد'' مجاور نما آدمی نے درویش کو سلام کیا۔

''یا علی مدد۔ وقت شاہ بابا۔'' لڑکوں نے بلند آواز میں کہا۔

''کوئی کسی کا نہیں۔ سب وقت کے ہیں۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ وہ

باقی: صفحہ ۷۷ پر ملاحظہ فرمائیے

سن ۲۰۰۹

پروین عاطف (فیصل آباد)

بیٹے کی پیدائش کا سن کر صبا گل کی آنکھوں سے تو آنسو ہی نہ رکتے تھے۔ اُن کی خاندانی دائی رضیہ ماسی نے جب اُسے بتایا خدا نے تمہیں بیٹے سے نوازا ہے تو اسے بالکل یقین نہیں آیا اور اس نے بدن پہ چادر اوڑھتے ہی رضیہ ماسی سے درخواست کی کہ وہ اسے ابھی ابھی دنیا میں آنے والے بچے کی جھلک دکھا دے تاکہ اُسے یقین آ سکے کہ اوپر تلے آنے والی تین بیٹیوں کے بعد وہ واقعی برکت اللہ کو اولادِ نرینہ دے سکی ہے۔ صحتمند بیٹے کی جھلک دیکھنے کے بعد اُس کا جی چاہتا تھا کہ رات بھر کی دردِ زہ سے نڈھال ہونے کے باوجود وہ اچھل کر بستر سے اُٹھے اور باہر گلی میں کھڑے محلے داروں کی مبارکبادیاں وصولتے اپنے شوہر برکت اللہ کے ساتھ جا کھڑی ہو اور اپنی ساس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھے آپ کے پسندیدہ قاری فضل حسین نے کونسے استخارے کے بعد اعلان کیا تھا کہ صبا گل کے بدن میں رب نے وہ قوت یا ہنرمندی ہی پیدا نہیں کی جو بیٹے کی پیدائش کا باعث بنتی ہے اور صبا کی تیسری گلاب کی کلی سی بیٹی زرگل کے بعد تو برکت اللہ کی ماں نے بباانگِ دُہل اعلان کر دیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی دوسری شادی کرے گی تاکہ اولادِ نرینہ ایک دن اس کی زندگی کا سہارا بن سکے۔ لیکن پرانی پشتون روایات کے خلاف جن میں ملک کے باقی پس ماندہ سماجوں کی طرح عورت کو محض مرد کی جنسی تسکین یا بچے پیدا کرنے کی مشین کے علاوہ کچھ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ برکت اللہ اپنے علاقے کے مردوں کی روایتی انا کے باوجود لمبے بالوں اور چمکیلی آنکھوں والی اپنی بیوی صبا گل سہاگ رات ہی دل کو بری طرح بھا گئی تھی۔ بار بار بیٹیوں کی ماں بننے پر گھر بھر کی لعن طعن کا نشانہ بننے اور برکت اللہ کی دوسری شادی کے اعلانات کے باوجود وہ صبا گل کی محبت سے آزاد نہ ہو سکا تھا۔ اور ایک بیٹے کی خواہش میں پیروں فقیروں کی دہلیزوں میں بیٹھا رہتا تھا۔ اور اب جو تین بیٹیوں کی پیدائش کی لعن طعن کے بعد صبا گل نے اُسے ایک بیٹے کا باپ بنا دیا تو وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا۔ تتلیوں جیسی اڑانیں بھرتی بیٹیاں بھی اب اُسے باعث برکت لگنے لگی تھیں۔ بیٹے کی پیدائش پر اُس نے نہ صرف پورے محلے میں مٹھائی بانٹی بلکہ صبا گل کے لئے بھی خاص چاندی کا ہار اور جھمکے بطورِ تحفہ خرید کر لایا۔

میرا بیٹا شہر کا سب سے بڑا ڈاکٹر بنے گا، اس کا نام نہ صرف پشاور شہر میں گونجے گا بلکہ پورے صوبے کے لوگ اس کے گن گایا کریں گے۔ وہ صبا سے کہتا۔

پر برکت اللہ محض ایک محنتی ڈرائیور تھا۔ مہنگائی کے عفریت نے لوگوں کا جینا حرام کر رکھا تھا اور برکت اللہ کی آمدن اسقدر محدود تھی کہ وہ اپنی لڑکیوں کو گلی کے کونے کے بغیر چھت اور غسلخانے والے سکول کے علاوہ کہیں اور تعلیم نہیں دلوا سکتا تھا۔ لیکن ایمان اللہ! ایمان اللہ کے لئے پیدا ہوتے ہی اُسنے بڑے بڑے خواب دیکھنا شروع کر دیئے تھے۔ کسی بھی قیمت پر اکلوتے بیٹے کو بڑا آدمی بنا کر چھوڑے گا وہ ارادے باندھتا۔ وہ اس کے خاندان کا روشن چراغ تھا۔ اس کی روشنی سے آبادیوں کی تاریکی دور ہوگی، وہ اپنی بیوی سے کہتا۔ ایمان اللہ کی پیدائش کے بعد اُس نے دن کے علاوہ رات کے بھی کئی گھنٹے کی محنت شروع کر دی تھی لیکن جس رفتار سے اس کی آمدن بڑھتی اس کی تین گُنا رفتار سے مہنگائی کی سونامی چلنے لگتی پھر وطن دشمن عناصر کی روز بروز بڑھتی دہشت گردی اور بدامنی۔ اپنے خاندان کے روشن اور آسودہ مستقبل کا فکر برکت اللہ کو مضطرب رکھتا۔ صبا گل کہتی، جب سے ایمان اللہ آیا ہے تم پریشان رہنے لگے ہو، مجھے وجہ کیوں نہیں بتاتے۔ لیکن برکت اللہ اس کی بات ہنس کے ٹال دیتا اور اُسے کہتا وہ غلط سمجھ رہی تھی۔ وہ خدا کی مہربانیوں کا پوری طرح شکریہ نہیں ادا کر سکتا جس نے مجھے تم جیسی صابر بیوی اور چار خوبصورت بچوں سے نوازا ہے۔

لیکن ایمان اللہ کی بہترین تعلیم اور پرورش کی فکر اسے جینے نہ دیتی۔ بستیوں کو اچانک بھسم کر دینے کا رواج روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ سڑکیں اور راستے غیر محفوظ ہوتے جا رہے تھے لیکن برکت اللہ بغیر سوچے سمجھے اپنی ویگن چلاتا رہتا تھا اور رزق وسیع کرنے کی فکر میں گم رہتا تھا یا پھر کبھی تھک ہار کر وہ قصہ خوانی بازار کے ایک تاریخی قہوہ خانے میں دھیان بٹانے کیلئے اپنے دوستوں کے پاس جا بیٹھتا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتا۔ لوگوں کو رقم کے عوض ملازمتوں کے لئے غیر قانونی طور پر دوسرے ممالک بھجوانے والا ایجنٹ نصر اللہ شاہ بھی اکثر اوقات اس قہوہ خانے میں آتا۔ اُس نے برکت اللہ کی پریشانی دیکھ کر اس سے کہا کہ اگر وہ اسے تین لاکھ روپیہ دے دے تو وہ اسے کسی ایسے مغربی ملک بھجوا دے گا جہاں جاتے ہی اس کی قسمت بدلنا شروع ہو جائے گی اور روزگار کی تمام پریشانیاں دُور ہو جائینگی۔ برکت اللہ کا ایک محلے دار اسی طرح زیرِ زمیں انگلستان سمگل کیا گیا تھا، اور اب چند ہی برسوں میں اُس کے گھر والوں نے نیا گھر تعمیر کر لیا ہے۔ اور گھر میں فرج اور ٹی وی سجا دیئے گئے ہیں۔

ایک دو ملاقاتوں میں ہی نصر اللہ شاہ نے برکت اللہ کے دل میں خواہشوں کی نئی فلیتی سلگا دی تھی۔ اچھی ڈرائیوری کا ہنر تو اس کے ہاتھ میں تھا ہی لیکن کسی ایسے ملک جا کر تو اسے روڑی کوٹنا، گھاس کاٹنا یا سڑکیں صاف کرنا بھی منظور تھا جہاں اس کی کمائی میں اضافہ ہو سکے اور اس کے بیٹے کو ایک قابلِ فخر مستقبل میسر ہو۔ نصر اللہ شاہ ایک کائیاں اور لالچی ایجنٹ تھا برکت اللہ کو مل کر اسے احساس ہو گیا تھا کہ زمین زرخیز ہے۔ اُس نے اچانک ایک روز اُس سے مل کر کہا کہ اُس نے انگلستان میں دس لوگوں کی ملازمتوں کا انتظام کر لیا ہے وہ جلد از جلد پیسوں کا انتظام کر لے تاکہ وہ اسے دس لوگوں کے جتھے میں شامل کر کے انگلینڈ بھجوا سکے۔ اپنے خاندان کے روشن مستقبل کے لئے یہ کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔۔ برکت اللہ رات بھر بے چینی سے چارپائی پہ پہلو بدلتا رہا۔ بڑا ڈاکٹر بننے کے بعد ایمان اللہ جب اپنے بچوں سے کہے گا تمہارے دادا نے ہم سب کی بہتری کی

خاطر اپنی پوری جوانی داؤ پر لگادی تو میرا سر فخر سے تن جائے گا۔ صبا گل کی خدمت کے لئے اپنی ذاتی ملازمہ ہوگی۔ ہم سب کی زندگی بھر کی دیکھ بھال کی مشقت نے اُسے تھکا دیا ہوگا۔ ہم دونوں ایمان اللہ کے آرام دہ گھر میں اپنے پوتے پوتیوں سے کھیل کر اپنی آخری عمر سنواریں گے۔ لیکن اپنے ان پیاروں سے، برسوں کی دوری، اوران جانی زمینوں کے جبر؟؟ رات بھر ایسی ہی ہونے نہ ہونے کی کیفیت میں پڑے پڑے اُس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اپنا مارکیٹ کے پچھواڑے بنا دو چار مرلے کا گھر گروی رکھ کر انگلینڈ جانے کے لیے تین لاکھ روپیہ حاصل کرے گا پھر پتہ نہیں کونسی چھٹی حس کے تحت سوئی سوئی صبا گل نے برکت اللہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ جیسے اُسے برکت کے تحفظ کی ضرورت ہو۔ چار بچوں کی ماں بننے کے بعد بھی صبا گل کے بھرے بھرے بدن میں پتا نہیں کیا تھا اُس کے قریب جاتے ہی برکت اللہ کے بدن میں پارہ سا گھلنے لگتا اور وہ جب تک اپنے جلتے بھڑکتے سانسوں، اور خواہش سے تنے بدن کے ذریعے صبا گل پر اپنا آپ نچھاور نہ کر لیتا اُسے چین نہ ملتا۔ اُس روز صبا گل کے سینے پر سر رکھے صبح ہونے سے پہلے اُسے بتا رہا تھا کہ وہ زندگی کے اتھاہ سمندر میں ایک بڑی ڈُبکی لگانے جا رہا تھا اور سارے امتحان میں اس کی پیاری بیوی کو مردانہ وار اس کا ساتھ دینا ہوگا۔ صبا بنیادی طور پر ایک حوصلہ مند صابرہ، شاکرہ عورت تھی، لیکن اُس کے یہ سارے جذبے صرف اور صرف برکت اللہ کی محبت اور اعتماد سے سیراب ہوتے تھے۔ برکت اللہ کا فیصلہ سُن کر اسے لگا وہ پل بھر میں ٹوٹے ہوئے کانچ کی طرح بکھر جائے گی۔ لیکن ایمان اللہ۔۔۔؟؟ ایمان اللہ اور لڑکیوں کے روشن مستقبل کے خواب اُسے بھی اتنے ہی دلربا اور سنہری دکھنے لگے جتنے اُس کے شوہر کو۔ ''میں تمہاری تابعدار ہوں برکت، میں یہ تمہارا گھر بار ایک امانت کے طور پر سنبھالونگی۔''

گلیوں بازاروں کے رنگ پُر اسرار طریقے سے بدل رہتے تھے، اِدھر سے اُدھر تیز تیز چلتے نقابوں میں چھپے اسلحہ بردار مرد، جگہ جگہ دیواروں پہ لکھے قتال کے پیغامات، سکولوں اور محافظوں پر برسائے جانے والے ہلاکت خیز بم۔ اپنے مستقبل کی سوچوں میں ڈوبے برکت اللہ کو اردگرد پھیلتی سونامی کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ایسی ہی سوچوں میں ڈوبا وہ ایکدن بارات سے بھری ویگن لے کر پشاور سے کوہاٹ کی طرف جا رہا تھا ساتھ والی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا اونچا لمبا دولھا، تلے کا سہرا پگڑی پہ دھرے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ باراتی تالیاں بجا بجا کر پشتو میں شادی کے لوک گیت گاتے جا رہے تھے۔ درہ کے اسلحہ بازار کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی بے آب و گیاہ پہاڑیاں تھیں۔ برکت اللہ اسلحہ بازار پار کر کے کوہاٹ روڈ پر پڑا تو ڈھاٹوں والے بندوق برداروں نے اس کا راستہ روک لیا اور برکت اللہ کے سر پر بندوق رکھ کر اُسے ویگن سے باہر آنے کو کہا۔ برکت اللہ نیچے اترا تو دونوں بندوق بردار بھری بھرائی ویگن کو لے کر جنگل کی طرف روانہ ہوگئے، باراتیوں کی چیخ و پکار اور نقاب پوشوں کی ہوائی فائرنگ برکت اللہ کو دیر تک سنائی دیتی رہی۔ دو تین روز تک برکت اللہ پشاور کے کسی تھانے میں بند رہا، پولیس نے دورانِ تفتیش اُسے تشدد کا نشانہ بھی بنایا، جب انہیں اچھی طرح یقین ہو گیا کہ برکت اللہ بے گناہ ہے تو کمر پر لات مار کر اُسے گھر واپس جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اُس روز برکت اللہ نے گھر آتے ہی صبا کو ملک چھوڑ کر بہتر کمائی کی خاطر کسی دُور دیس جانے کا فیصلہ سُنا دیا۔

مکان گروی رکھنے کے بعد برکت اللہ نے جب تین لاکھ نصر اللہ شاہ کے حوالے کئے تو اس نے اس کے گھر کئی پھیرے ڈالنے شروع کر دیئے، صبا اور بچوں کو ایک سگے بھائی کی دیکھ بھائی کا یقین دلایا۔

صبا نے صرف برکت اللہ کے جانے کی آخری رات، اُس کے بدن کا تحفظ اپنے اوپر اوڑھتے ہوئے کہا۔ ''تین لاکھ شاہ سے واپس لے لو برکت، ہم جیسے ہیں ٹھیک ہیں، یہ کئی دنیاؤں کی دوری ہم سے برداشت نہ ہوگی۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے، برکت تمہارے بنا جینے کے تصور سے تنِ تنہا، پورے خاندان کو سنبھالنے کی ذمہ داری سے۔''

لیکن صبا کو اس نے یہ کہہ کر تسلی دی کہ وہ چند ماہ میں ان سے ملنے واپس آئے گا اور نصر اللہ شاہ اُن کے ہر مسئلے میں ان کا مددگار ثابت ہوگا۔

پھر صبا گل کو برکت اللہ کی خیریت کی آخری خبر کوئٹہ سے موصول ہوئی۔ وہ ٹیلیفون پر اُسے اور بچوں کو خدا حافظ کہہ رہا تھا اُس کی آواز پُر عزم اور پُر امید تھی۔ پھر وہ دس کے دس لوگ کسی اچھے کل کی تلاش میں بارڈر پار چلے گئے تھے۔ اور نصر اللہ شاہ ان کے خاندانوں کو ہر تیسرے چوتھے دن ان کے بحفاظت سفر کی خیر خیریت پہنچاتا رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اُس نے خاموشی اختیار کرنا شروع کر دی تھی اور صبا کو اس سے رابطہ قائم کرنے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلنے لگے تھے۔ لیکن برکت اللہ اور اسکے ساتھیوں کو جیسے زمین نگل گئی تھی۔ نصر اللہ شاہ نے برکت اللہ کے جانے سے پہلے جو فون صبا گل کو دیا تھا اب وہاں سے کوئی جواب نہ آتا تھا۔ پھر پوچھتی پچھاتی اپنی بوڑھی ماسی کے ساتھ صبا گل شاہ کا پتا معلوم کرنے قصہ خوانی کے اس قہوہ خانے بھی جا پہنچی تھی۔ جہاں نصر اللہ شاہ بیٹھتا تھا، لیکن وہاں بھی اس کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ قہوہ خانے کا مالک برکت اللہ کا دوست تو برکت اللہ کے بارے میں خود بھی پریشان تھا لیکن وہ صبا گل کی پوچھ تاچھ کے بارے میں اس کی کچھ بھی مدد نہ کر سکا۔ اپنی اور بچوں کے سانس کی ڈوری قائم رکھنے کی خاطر صبا کے پاس برکت اللہ کے دادا کی مینا بازار پشاور میں کرائے پہ اُٹھی دو دکانوں کے علاوہ کوئی بھی ذریعہ آمدن نہ تھا۔ اُس نے دکانداروں سے اُون حاصل کر کے چھوٹے بچوں کے سویٹر بُننے کا کام شروع کر دیا۔ لیکن مہنگائی کی تیز چلتی بادِ سموم نے لوگوں کے لئے نمک کے ساتھ روٹی کھانا بھی محال کر دیا تھا۔

سنگلاخ پہاڑوں اور وادیوں میں چھوٹے منافرت اور بہمیت کے لاوے نے اب روشن شہروں کا رخ کر لیا تھا۔ انسانیت اور انسانی تہذیب کے دشمنوں نے بستیوں پر آگ برسانا شروع کر دی تھی۔ گلیاں کوچے بے گناہ انسانی

بدنوں کے چیتھڑوں سے بھر گئے تھے۔موت سے ڈرے لوگ گھروں میں چھپ کرزندگی بسر کررہے تھے۔ برکت اللہ جس دھند میں غائب ہوا تھا، وہ روز بروز مزید گہری ہوتی جارہی تھی۔دن بھر محنت مشقت کے بعد جب صبا تھکن سے چور بستر میں گرتی تو برکت اللہ کی گمشدگی اُسے کانٹوں پرلوٹاتی۔ وہ گھنٹوں میں قد نکالتے ایمان اللہ کو دیکھتی جو ڈاکٹری کی تعلیم تو کیا ایک عام سکول کی فیس بھی ادا کرنے سے قاصر تھا۔لڑکیوں کا سکول تو بم سے مسمار ہونے کے بعد یونہی گھر بیٹھ گئی تھیں۔قاری فضل حسین محلے کا پرانا امام مسجد اور بچوں کو قرآن پڑھانے والا تھا۔دوسرے بہت سے گھروں کی طرح برکت اللہ کے خاندان میں بھی اس کا آنا جانا تھا۔اوران لوگوں کے حالات سے اچھی طرح واقف تھا۔عیدالضحیٰ سے کچھ پہلے اُس نے صبا اوراس کی بوڑھی ساس کو آکر بتایا کہ نصر اللہ شاہ غریبوں سے جھوٹ بول کر رقم ہتھیانے اورانہیں غیر قانونی طور پر ملک سے باہر بھجوانے کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا ہے، کیونکہ اس کے بھیجے ہوئے جتھوں میں سے بہت سے لوگ دوسرے ممالک کی جیلوں میں سڑرہے ہیں یا ان کی گولیوں کا نشانہ بن چکے ہیں۔صبا کو لگا قاری فضل حسین نے اس کے گھر کی کِر کِر کرتی چھت کو آگ لگا دی ہے اوراب کچھ ہی منٹوں میں برکت اللہ کا جدی پشتی گھر اُن کے سروں پہ آن رہے گا۔ برکت اللہ کی ماں کے دلدوز بینوں نے سارا محلّہ سر پہ اُٹھالیا اوروہ سب لوگ اُسے جھوٹی تسلیاں دینے کے لئے کئی دن تک اُس کے اردگرد بیٹھے رہے۔پھر صبا گل نے اپنے آپ کو خود ہی حوصلہ دے دیا وہ یہ ماننے پر کسی طرح تیارنہیں تھی کہ اُس کا سرو کے بوٹے جیسا لمبا اونچا برکت اللہ کسی فنا کا شکار ہوسکتا ہے۔شدید عذاب میں گھر جانے کے بعداس کے اندر کی چھٹی حِس اُسے زندگی سے لڑنے کی ہمت اسی طرح دے دیا کرتی تھی۔

دکانداروں سے اُس نے روزانہ محنتانے پر سلائی کڑھائی کے چھوٹے چھوٹے کام لینا شروع کردیئے۔اور برکت اللہ کی واپسی کی آس لگائے زندگی کا سرا ایک نئی ہمت سے پکڑلیا۔

وحشت اور بربریت کا طوفان گھروں میں گھسنے لگا تھا۔تعلیمی اداروں کو بچوں کی اجتماعی قبروں میں تبدیل کیا جارہا تھا۔

قاری فضل حسین ایک مدت سے محلے کی چھوٹی مسجد میں دو ہزار مہینے پر پیش امام کی ملازمت کرتا تھا۔اس کا باقی خاندان بارڈر کے کسی سنگلاخ پہاڑی گاؤں میں رہتا تھا۔ بارہا محلے کے لوگ اس کی مذہبی خدمات کے عوض اُسے ایک وقت کی روٹی بھیج دیا کرتے تھے۔صبا گل کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ ایمان اللہ کو وہ قرآن پڑھانے اور مفت میں کھانے پینے کے لیے قاری فضل حسین کے مدرسے میں چھوڑ دے۔ برکت اللہ کا اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بنانے کا خواب کہیں اس کے وجود کے ساتھ ہی دفن ہوگیا تھا۔

صبا گل جب ایمان اللہ کو انگلی لگا کر قاری فضل حسین کے مدرسے چھوڑنے گئی تو کچھ دیر اسے یقین ہی نہ آیا کہ سنگِ مرمر کی اونچے برجوں والی خوبصورت عمارت قاضی فضل حسین کا مدرسہ تھی۔مدرسے کے صاف ستھرے کشادہ صحن میں مختلف عمروں کے بچے سیپاروں کا ایک ہی ردھم میں ہل ہل کر رٹہ لگا رہے تھے۔رٹہ لگاتے لگاتے وہ بوریت سے کبھی ایک دوسرے کے ساتھ دھکم پیل کرنے لگتے،کبھی منہ چھپا چھپا کر ہنستے۔ایمان اللہ کو قاری نے انتہائی شفقت اوراپنائیت سے خوش آمدید کہا۔اور صبا سے کہا اتوار کے دن وہ اُسے خود لے کر گھر آئے گا۔وہ اطمینان سے گھر چلی جائے۔صبا ایمان اللہ کو قاری کے حوالے کر کے مدرسے سے باہر نکل رہی تھی تواس نے دیکھا، قاری کی رہائش کی طرف اوپر جانے والی سیڑھیوں سے دو اونچے لمبے نقاب پوش بندوقیں لٹکائے نیچے اتر رہے تھے۔چادر میں لپٹی صبا کو دیکھ کر وہ ایک پل رکے اور انتہائی غصے میں اُسے کہا کہ مسلمان عورت کا گھر سے باہر نکلنا گناہ ہے۔تم یقیناً دوزخ کی خوراک ہو۔آئندہ ہمیں کہیں دکھائی دی تو گولیوں سے چھلنی کردی جاؤ گی۔ برکت اللہ کے بعد گھر میں کوئی دوسرا مرد موجود نہ تھا۔صبا گل کے سر پر پورے گھر کی ذمہ داری تھی۔گھر میں قید ہوکر بیٹھنا اُس کے بس میں نہ تھا۔اُس پر ایسی درشتی سے گرجنے والے نقاب پوش کون تھے۔وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ برکت اللہ ہوتا تو اُن سے اچھی طرح پوچھتا غیر عورتوں پر اپنی حاکمیت جتانے والے وہ کون ہوتے ہیں۔لیکن اب اپنے تمام مصائب پر چپکے چپکے آنسو بہانے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ بیٹیاں بھی گندل قد ایک ساتھ جوان ہوتی جارہی تھیں۔ برکت اللہ کے بارے میں اب اس کے انتظار کی شمعیں ایک ایک کر کے بجھتی جارہی تھیں۔اب وہ بچوں کو روٹی صرف آدھی آدھی بانٹ کردیتی تھی۔قتل وغارت اور مہنگائی سر چڑھ کر بولنے لگے تھے۔

ایک برس میں ایمان اللہ نے پورا پہلا سیپارہ حفظ کرلیا تھا۔تھوڑے بہت اردو کے الفاظ سے بھی اس کی شناسائی ہوچکی تھی۔ پشاور کے موسمِ سرما میں اس سے پہلے کبھی ایسی گھنی اور سیاہ دھند نہ پھیلی تھی۔دن کے دوران بھی لوگ ہاتھوں میں ٹارچیں لئے پھرتے تھے۔ایمان اللہ کو گھر آئے بہت دن گذر چکے۔قاری فضل حسین آٹھ دس روز کے بعد اُسے خود ہی ساتھ لے کر آجایا کرتے تھے۔تیز موسمی بخار نے صبا کو گھر سنبھالنے جوگا بھی نہ چھوڑا تھا۔ بخار کی تندی میں اُسے کئی بار لگا برکت اللہ کے صحتمند سانس اُس کے چہرے کو چھو رہے تھے۔بستر کے اندر اس کے بدن کی مہک تھی لیکن جب نیم بے ہوشی کے عالم میں اپنا ہاتھ برکت اللہ کی چوڑی چھاتی پہ رکھتی تو اسے اپنے مہربان شوہر کا کہیں ہیولہ بھی محسوس نہ ہوتا۔پھر سائیں سائیں کرتی تنہائی اور تھکن اس کی آنکھوں سے تیزاب بن کر برسنے لگتی۔

قتل وغارت کی کہانیاں اب بستی بستی بھڑکنے لگی تھیں۔خوف سے سمٹی زندگی گھروں میں چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔بیس روز بعد صبا گل بستر سے اُٹھی تو علی الصبح اپنے بیٹے ایمان اللہ کی خیریت معلوم کرنے مدرسے جا پہنچی۔کپڑے کی مذہبی ٹوپیوں والے بچے صحن میں بیٹھے بدستور ہل ہل کر قرآن حفظ کر رہے تھے۔ برآمدے میں ایک طرف کارتوسوں کی پیٹیاں اور بندوقیں رکھی تھیں اور بے ہنگم سیاہ ڈاڑھیوں اور لمبے لمبے بالوں والے جنگلی نوجوان اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔

''نکل جاؤ باہر، مدرسے میں عورت نہیں آ سکتی۔ یہ ایک پاکیزہ جگہ ہے۔'' ایک ڈاڑھی والا صبا پر گرجا۔

''دوزخی بے حیا۔ چہرہ ننگا کر کے گھوم رہی ہے۔'' دوسرا پختہ عمر آگے بڑھ کر صبا پر چیخا۔

''چادر! میں ہمیشہ چادر لیتی ہوں۔ مجھے قاری فضل حسین سے ملنا ہے یہاں میرا بیٹا ایمان اللہ پڑھتا ہے۔'' صبا گل نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

لے جاؤ یہاں سے اپنا ناپاک وجود، یہاں نہ کوئی قاری فضل حسین ہے نہ ایمان اللہ۔ دفعہ ہو جاؤ۔ پہلے نے صبا گل کو تقریباً باہر کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

''یوں نہیں ہو سکتا، میں ایسا نہیں ہونے دونگی میں پولیس کے پاس جاؤنگی مجھے میرا بیٹا چاہیے۔'' کئی گھنٹے مدرسے کے باہر بیٹھی وہ سینہ کوبی کرتی رہی، مدرسے والوں کو تبرے بولتی رہی لیکن سہمے سہمے لوگ اس کے قریب کھڑے ہونے سے بھی گریز کر رہے تھے۔ تھانے والوں نے اُس سے کہا بیٹا گم ہو جانے کا کوئی پکا ثبوت لاؤ۔ اگر تم نے اسے مدرسے میں چھوڑا تھا تو ممکن ہے وہ اپنی مرضی سے کہیں چلا گیا ہو۔''

ایسا نہیں ہو سکتا کہ میرا اور میری بیٹیوں یا ان کی دادی کا کوئی خدا ہی نہ ہو اور وہ ہماری ہڈیوں کے گودے کو چاٹتے ہمارے دکھوں کا کوئی مداوا نہ کر سکے۔ اوپر والے کو ایمان اللہ کی تلاش میں میری مدد کرنا ہوگی میں اُسے گھر واپس لا کر اپنے گھر بار کا والی وارث بناؤنگی وہ اپنی بہنوں کی ڈولیاں اپنے ہاتھوں سے رخصت کرے گا۔ اُس نے قاضی فضل حسین کے پرانے گھر کی طرف جاتے ہوئے ارادہ باندھا۔ شدید مشکلات میں زندگی کے سامنے ڈٹ جانے کی صبا گل کی اسی عادت نے برکت اللہ کو وطن چھوڑنے کا حوصلہ دیا تھا۔

قاری فضل حسین کے گھر میں نئے کرائے دار آ چکے تھے۔ اور قاری کے غائب ہو جانے کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ مدرسے کے اردگرد پھر پھر کر وہ بے حال ہو چکی تھی۔ نئے سے نئے اسلحہ بردار صبا کے ایمان اللہ کے بارے میں سوالات پر اُسے مغلظات سے نوازتے اور خون کے آنسو بہاتی وہ گھر واپس لوٹ آتی۔

ایمان اللہ کا بارہواں جنم دن قریب آ رہا تھا اور صبا گل کی عادت تھی کہ ایمان اللہ کی سالگرہ سے پہلے محلے کی بیبیوں میں قرآن کے سیپارے بانٹ کر وہ اپنے بیٹے کی خیر و برکت کی خاطر قرآن ختم کرایا کرتی تھی۔ بیوہ ماسی خدیجہ پورے محلے کی ماں تھی۔ اُس کے بدن میں خون صرف دوسروں کے دُکھ درد کی سانجھ سے گردش کرتا تھا۔ ایمان اللہ کے ہر جنم دن پہ قرآن ختم کرانے اور خیر و برکت کی دعا کرانے کی ذمہ داری ماسی ہمیشہ اپنے سر لیتی تھی۔ زندگی کی بند گلی میں پل پل بڑھتی تاریکی نے صبا کے دعاؤں کے جذبے کو بھی متزلزل کر دیا تھا۔ خدیجہ ماسی نے گھر آ کر صبا کو اُٹھایا ''مینا بازار کی مسجد سے سیپارے مانگنے جانا ہے۔ ایمان اللہ کی سالگرہ میں صرف تین دن باقی ہیں۔ ہم لوگ روز کا ایک قرآن پڑھیں گے۔ خدا اسے خود گھر لے آئے گا چلو میرے ساتھ اور ان بے چاری لڑکیوں کو بھی ساتھ لے لو، بازار سے میں انہیں کوئی گاجر مولی لے دونگی، باہر کی ہوا کو ترس گئی ہیں بے چاری۔''

شہروں میں بارود تو برس رہا تھا لیکن لوگ سمجھتے تھے بے ضرر، پرانی غیر اہم بستیوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ دھند بہت دنوں بعد چھٹی تھی۔ روشنی اور دھوپ نے بازاروں اور سڑکوں پر لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگا دیئے تھے۔ ماسی خدیجہ نے کہا پہلے وہ لڑکیوں کو بازار سے کھانے پینے کی کوئی چیز لے کر دے گی واپسی پر مسجد سے سیپارے حاصل کریں گے۔

مینا بازار میں تل دھرنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ شادیوں کے موسم کی وجہ سے دکانیں زرق برق لباسوں، جوتوں، مہندی، چوڑیوں سے لبالب بھری تھیں۔ رش کی وجہ سے کھوّے پہ کھوّا اچھل رہا تھا۔ خدیجہ ماسی لڑکیوں کو لے کر چوڑیوں کی دکان پہ کھڑی تھی۔ صبا گل چادر لپیٹ کر چاٹ والی ریڑھی کے ساتھ پڑی ٹوٹی پھوٹی کرسی پہ بیٹھ گئی۔ منہ پہ ڈھاٹا باندھے بھاری شال میں لپٹا، وہ صبا گل سے کچھ فاصلے پر آن کھڑا ہوا۔ اُس کی آنکھوں میں غصے اور تحیّر کے ملے جلے جذبات تھے۔ لمبی لمبی پلکوں والی وہی سیاہ چمکیلی آنکھیں تھیں جو صبا کی چھاتی کا دودھ گلے میں اتارتے وقت مسلسل اُس کے چہرے پہ ٹکی رہتی تھیں۔ دودھ سے نہائے لمبے لمبے ہاتھ بھی اُس کے بیٹے ایمان اللہ کے تھے اور اس کے ہاتھ کی پشت پہ پھیلا سیاہ تل بھی وہی، جسے پیدائش کے وقت دیکھ کر برکت اللہ نے کہا تھا ''ایسے تل والوں کے ہاتھ ہمیشہ دوسروں کی مدد کرتے رہتے ہیں۔'' ایمان اللہ ماں کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے جامد ہو گیا تھا۔ اس کے ماتھے پر اللہ اکبر کی سبز پٹی بندھی تھی۔ ''ایمانے'' صبا گل چیخی میرے پیارے بیٹے اور جھپٹ کر اُس نے ایمان اللہ کو اپنی چھاتی سے لگا لیا۔

پھر کسی نے اچانک سارے میں صور پھونک دیا۔ جہنم کی آگ کے سارے ستون ایک ساتھ بھڑک اُٹھے۔ لڑکیوں، عورتوں، دکانداروں کے چیتھڑا چیتھڑا بدن ہوا میں اچھلنے لگے۔ انسانی چیخوں اور کراہوں کی آواز عرش کے پائے ہلانے والی تھی۔ چوڑیوں اور مہندیوں والے بچیوں کے کٹے ہوئے بازو سوختہ شاخوں کی طرح جگہ جگہ بکھرے سلگ رہے تھے۔ مینا بازار کی صدیوں پرانی ثقافت اُسی محلے کے اپنے بیٹے کے ہاتھوں نیست و نابود ہو چکی تھی۔ صبا نے آخری سانس لیتے ہوئے اپنے پہلو میں پڑے ایمان اللہ کے بدن سے کٹے چہرے کو دیکھا اس کے چہرے کی معصومیت اس وقت بھی فرشتوں کو مات کر رہی تھی۔ صبا گل کو لگا وہ انسانوں کے اس بے ہنگم شور میں بھی اُسے کہہ رہا تھا ''امی میں بے گناہ ہوں۔ وہ لوگ کہتے تھے جنت میں داخل ہونے کے لئے غافلوں اور بے خبروں کو راستے سے ہٹانا پڑتا ہے وہ بے شک اپنے ہوں یا بے گانے۔'' ڈاکٹر ایمان اللہ'' لوگوں کی آہوں اور کراہوں میں ایک سرگوشی گونجی۔ اور شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔

بے منزل

محمد سعید شیخ (لاہور)

سو روپے کی مسافت تھی' جلد ہی کٹ گئی۔ ابھی کوئی منزل بھی نہیں آئی تھی۔ کوئی منزل تھی بھی نہیں۔

ڈرائیور نے سڑک کے کنارے رکشہ کھڑا کیا اور پیچھے گردن موڑ کر سواری سے کہنے لگا۔ ''لو بزرگو۔ آپ کے سو روپے ختم ہو گئے' اِدھر ہی اتر جاؤ۔'' اور وہ خاموشی سے رکشہ سے اترا' بغیر کچھ کہے سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر لگے کمزور سی روشنی والے لیمپ پوسٹ کے سائے میں کھڑا ہو گیا۔

رات کا وقت گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اِکّا دُکّا لوگ اس کے پاس سے گزرتے رہے بغیر اس کے اس طرح سے کھڑے ہونے پر توجہ دیئے۔ اور وہ سوچتا رہا میں کہاں سے آیا ہوں، میں نے کدھر جانا ہے۔ کہیں بھی پہنچنے کی اُسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ دو ایک دفعہ اس نے اپنے دائیں بائیں دیکھا' کوئی راستہ مانوس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کے سامنے دو رویہ سڑک خالی پڑی تھی جسے پار کرنے کی اُسے کوئی خواہش محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اسے ابھی تک یاد تھا کہ ایک رکشہ والے نے اُسے یہاں اتارا تھا یہ کہتے ہوئے ''لو بزرگو۔ آپ کے سو روپے ختم ہو گئے' اِدھر ہی اتر جاؤ۔'' رکشے والے کو یہ سو روپے شاید اس کے بیٹے نے دیئے تھے بغیر اسے کچھ بتائے کہ وہ اُسے کہاں بھیج رہا ہے۔ اب وہ اپنے بیٹے کے پاس واپس جانے جوگا بھی نہیں تھا۔ واپسی کے سو روپے اس کے پاس نہیں تھے اور نہ ہی اُسے یہ یاد تھا کہ اس کا بیٹا کہاں رہتا تھا۔ اس بیٹے کی شبیہہ سی اس کے دماغ میں رہ گئی تھی جسے جب وہ یاد کرنے کی کوشش کرتا تو وہ مزید دھندلانے لگتی۔

پھر اچانک ایک شخص اس کے پاس سے گزرتا ہوا اس کی جسمانی زبان کی بے بسی دیکھ کر اس کے پاس کھڑا ہو کر پوچھنے لگا۔

''کہاں جانا ہے آپ نے؟''

''کہیں بھی۔ کہیں بھی جہاں مجھے سر چھپانے کو جگہ مل جائے۔''

''کوئی تو ہو گا آپ کا اس شہر میں؟''

''نہیں۔ کوئی نہیں۔'' جواب کے لئے اُسے کچھ بھی سوچنا نہیں پڑا۔ تو اس شخص نے اس کا ہاتھ پکڑا سامنے والی سڑک پار کرائی اور بائیں جانب تھوڑی دیر چلے اور پھر دائیں جانب چھوٹی سڑک پر مڑ گئے۔ نئی آبادی شروع ہو گئی۔

''ادھر لاوارث بوڑھوں کے لئے گورنمنٹ نے ایک ادارہ قائم کیا ہے، میں آپ کو وہاں لے چلتا ہوں۔''

وہ خاموش رہا۔

یہ ''عافیت خانہ'' تھا۔ وہ وہاں پہنچ گیا۔

ادارہ کی انچارج ایک خاتون تھی جسے بوڑھے لاوارث لوگوں سے ہمدردی تھی۔ اُس کے پوچھنے پر وہ بمشکل اپنا نام بتا سکا۔ جمیل بٹ۔

اس وقت۔ بس مجھے سونے کے لئے تھوڑی سی جگہ چاہیے اور کچھ نہیں۔ باقی کچھ نہ پوچھیں۔ اور۔

''اور کیا؟'' انچارج نے پوچھا۔

علیحدہ کمرہ۔ جہاں سے رات کو کوئی بھی میری چیخیں نہ سن سکے۔ میں رات کو شاید اونچی اونچی آواز میں چیختا ہوں۔ میرے گھر والے میری اس عادت سے بہت تنگ تھے۔

''گھر والے۔؟'' عافیت کی انچارج چونک پڑی۔

''تم تو کہتے تھے میرا کوئی نہیں۔ کوئی گھر نہیں۔''

اور وہ گھبرایا نہیں۔ ''اب نہیں ہیں۔ انہوں نے گھر سے نکال جو دیا۔ اب وہ میرا گھر نہیں کوئی بیٹا بھی نہیں۔

انچارج چُپ ہو گئی۔

''کچھ کھاؤ گے؟ تمہیں بھوک تو لگی ہو گی۔''

وہ خاموش رہا۔ اُسے یاد نہیں تھا اس نے آخری کھانا کب کھایا تھا۔

''نہیں۔ مجھے بھوک نہیں۔'' ایک لمحہ پہلے تک وہ بھوکا۔ اب جو کہا بھوک نہیں' تو اس کی بھوک غائب ہو گئی۔ عجیب سی خوشی کا احساس ہوا اُسے۔ ایک طرح کی ایکسائٹمنٹ جیسے اب بھی اس ہاری ہوئی حالت میں بھی اس کے اختیار میں کچھ تو تھا۔ وہ خود کو بھوکا رکھنا چاہتا تھا یہ جاننے کے لئے کہ بھوک کیا ہوتی ہے۔

''ایک مکین کا کھانا بچا ہوا ہے۔ اتفاق سے ویسے تو ہمیں ہر مکین کے تین وقت کے کھانوں کے لئے چوبیس روپے ملتے ہیں۔ مشکل ہوتی ہے پھر بھی پورا کر ہی لیتی ہوں۔ آج تو ایک مکین کا کھانا بچا رکھا ہے۔ چاہو تو منگوا دوں۔''

''نہیں جی۔ شکریہ۔ مجھے بھوک نہیں۔'' وہ اپنی انچارج کے سامنے سے اٹھ گیا۔ اُسے کمرہ مل گیا۔ بستر مل گیا۔

اُسے پتا تھا اس کے دشمنوں نے نیند میں اس کا پیچھا کرنا تھا اور اس نے اپنی جان بچانے کے لئے چیختے ہوئے ان کے آگے آگے بھاگنا تھا۔ وہ روز بچ جاتا تھا۔ جب وہ اس کے سر پر آ پہنچتے تھے خوف سے اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔

وہ سمجھتا تھا انہیں اب بدلہ لینے کا کوئی حق نہیں۔ وہ اس دوہرے قتل کی سزا بھگت چکا تھا۔ عدالت نے اسے پھانسی کی سزا دی تھی جس کے خلاف ان کی اپیل بھی مسترد ہو گئی تھی اور پھر جب وہ جیل کی کال کوٹھری میں بلیک وارنٹ کا انتظار کر رہا تھا تو وہ خود کو مردہ تصور کرنے لگا تھا صرف مرنے کی پھانسی کی رسم ادا کی جانا باقی تھی۔

مقتول کے وارث مطمئن ہو گئے تھے کہ ان کا مجرم اب کسی روز پھانسی پر لٹک جائے گا۔ اس کی مدت یقینی ہو چکی تھی۔

پھر اُس مرے ہوئے قیدی کو برٹش گورنمنٹ نے خرید لیا۔ انڈیا پر

حکومت تو ان کی ہی تھی پھر بھی اس کی زندگی کا سودا ہوا۔ غلام قوم کے اس پھانسی کے جرم کی قیمت ہی کیا تھی وہ بہت ہی سستے داموں بک گیا۔ خفیہ سودا ہوا۔ اس وقت میڈیا نہ ہونے کے برابر تھا۔ کوئی نہ جان پایا کہ وہ کس قیمت پر بکا اور قیمت کس کرنسی میں ادا کی گئی۔

برطانیہ کے سائنس دانوں اور ڈاکٹروں کو ایسے کسی انسان کی ضرورت تھی جسے وہ ہیروشیما کی بستی میں بھیج کر دیکھنا چاہتے تھے کہ امریکی ایٹم بم نے جو وہاں تباہی مچائی تھی اس کے انسانی جسم پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اس کے لئے جمیل بٹ کا انتخاب ہوا تھا۔

اور جمیل بٹ جو خود کو مردہ سمجھ چکا تھا خود کو زندہ پا کر حیران رہ گیا اس کی حیرت ایک خوشی سے زیادہ صدمہ کی کیفیت تھی اور اُسے اندازہ نہیں تھا کہ زندگی یوں بھی اپنے رنگ بدل سکتی تھی۔ وہ اس کے لئے ایک طرح سے نئی زندگی کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ تو مرنے کے متعلق سوچا کرتا تھا۔ کال کوٹھری کا ایک ایک دن، ایک ایک رات اس کے وجود اس کے احساس پر پاؤں رکھ کر گزرتا تھا۔ اور کبھی کبھی یہ وقت ٹھہر جاتا تھا۔ رات اتنی لمبی ہو جاتی تھی کہ گزرے نہیں گزرتی تھی۔ صبح تھی کہ ہونے کو ہی نہیں آتی تھی۔ زندگی سے عدم کی مسافت کتنی ہوگی اس کے ساتھ کیا ہوگا' مرنے کے بعد کیا وہ بالکل ختم ہو جائے گا؟ یا وہ کسی نئی حالت میں منتقل ہو جائے گا، وہ سوچتا تھا اور خوف کی ایک تیز لہر اس کی پشت میں دوڑ جاتی تھی۔ جیل کے سپاہی' وارڈن اُسے رحم کی نظروں سے دیکھتے تھے' یوں جیسے اس کی خلقت میں کوئی خاص تبدیلی ہو رہی ہو۔ اس کی کوٹھری کے پاس سے گزرتے سپاہیوں کے قدم مدہم ہو جاتے تھے خود بخود جیسے وہ موت کا احترام کر رہے ہوں۔ کوئی اُسے دُکھ نہیں پہنچانا چاہتا تھا، کوئی اُس کی دل شکنی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی اتنی ہی دیکھ بھال کرنے لگے تھے جیسے کسی مہمان کی کی جاتی ہے۔

اور اب اچانک اُسے زندگی بخش دی گئی تھی اور مری ہوئی حالت سے زندہ حالت میں آنے کے لئے اُسے شعوری کوشش کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ جس حالت کو وہ قبول کر چکا تھا جس کے سپرد وہ خود کو کر چکا تھا اب اسے اس سے نکلنے کے لیے نئی قوت' نئی توانائی کی ضرورت پڑ رہی تھی۔

وہ تو جیسے اپنی مسافت طے کر کے اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ مگر اب اسے نئے راستے پر ڈال دیا گیا تھا۔ ایک نئی مسافت اُسے نظر آ رہی تھی۔

اُسے تو بعد میں بتایا گیا کہ اس کی زندگی کس مقصد کے لئے بچائی گئی تھی۔ یہ اس کا مقصد نہیں تھا' اس کا تو اب کوئی بھی مقصد نہیں تھا وہ تو جیسے دوسروں کی خاطر زندہ رہ رہا تھا۔ اپنی زندگی تو وہ پہلے ہی گزار آیا تھا اس لئے اسے اس بات کی زیادہ پرواہ نہیں تھی کہ کوئی اس کی زندگی سے کیا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اُسے ایک ماہ کی ٹریننگ دی گئی۔ یہ ایک طرح کی فوجی ٹریننگ تھی جیسے اسے کسی مہم پر بھیجا جا رہا ہو۔ اس عرصہ میں اس کی صحت کا خاص خیال رکھا گیا اور کسی حد تک اس کی وہ توانائیاں بحال کرنے کی کوشش کی گئی جو جیل میں رہ کر ضائع ہو گئی تھیں۔

اور پھر تمام تیاریوں کے بعد جن کی تفصیل اس کے علم میں نہیں تھی اُسے جہاز میں ایک مقام تک لے جایا گیا جس کے متعلق اُسے نہیں بتایا گیا اور وہاں ایک دن کے قیام سے اُسے بتایا گیا کہ اُسے ہیروشیما کے اس شہر میں اتارا جائے گا وہاں وہ اُتنی دیر رہے گا جتنی دیر وہ برداشت کر سکے گا اور پھر جب وہ کہے گا وائرلیس کے ذریعہ اس کے پیغام پر اُسے وہاں سے اٹھا لیا جائے گا۔ اور واپس برطانیہ لیجا کر اس کے جسم کو زیر مشاہدہ رکھا جائے گا یہ جاننے کے لئے کہ اس کے جسم پر اس ماحول کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ یہ بڑی ترقی پسند قوم تھی وہ اپنے اس تجربے سے جاننا چاہتے تھے کہ تابکاری اثرات انسانی جسم پر کیا اثر چھوڑتے ہیں۔ وہ اپنے اور دنیا کے علم میں اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ اس تجربہ کے لئے انہیں چوہے نہیں انسان چاہیے تھے ایسے انسان جو چوہوں کی جگہ ان ہی مقاصد کے لئے استعمال ہو سکیں۔ ایسے انسان انہیں چوہوں کی قیمت پر کہیں نہ کہیں سے مل جاتے تھے۔

وہ اکیلا نہیں تھا، دو تین تھے۔ ایسے ہی کم قیمتے جو کسی نہ کسی وجہ سے کسی نہ کسی بشری قصور یا کمزوری کی وجہ سے انسان کے درجہ سے گر چکے تھے۔ ان تینوں کو ہیلی کاپٹر سے پیراشوٹوں سے ہیروشیما کی بستی پر گرایا گیا۔ دوسرے دو تو کسی پہاڑ سے ٹکرا کر مر گئے۔ صرف وہ بچا۔ کسی مکان کی چھت پر گرا جو اس کے بوجھ سے زمین بوس ہو گیا۔ کسی نہ کسی طرح وہ ہمت کر کے ملبے سے نکل آیا۔ مگر یہ جانداروں کی بستی نظر نہیں آتی تھی۔ وحشت اور دہشت کی دُھول تھی ہر طرف سیاہی کی صورت بکھری ہوئی۔ جلد ہی اس کی جلد کٹنے اور جلنے لگی۔ آنکھیں کھولنا مشکل ہو گیا۔ اس کا سانس بار بار رکنا ہموار ہو جاتا تھا۔

پھر اس نے وائرلیس پر پیغام دیا۔ انہیں اس کے مالکوں نے اوپر آسمان سے سیڑھی گرا کے بچا لیا، وہ اسے بچا کے لے گئے۔ انگلینڈ کے کسی ہسپتال میں وہ ایک سال تک موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ ڈاکٹرز اور سائنس دان اس کی کشمکش کا جائزہ لیتے رہے۔ اپنے نتائج اخذ کرتے رہے۔

سال بعد جمیل بٹ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ آہستہ آہستہ صحت یاب ہونے لگا۔ اور پھر اس نے واپس اپنے وطن جانے کی خواہش کی۔ برطانوی سرکار نے اسے بڑے اعزاز سے رخصت کیا اور اتنی دولت بھی اس کے ساتھ کر دی کہ باقی عمر وہ سہولت سے بسر کر سکے۔

ایک قتل کی سزا بھگتنے اور دوسرے قتل کے ارتکاب کے درمیان اس کی زندگی میں جو وقفہ تھا اس میں اس نے اپنی فیملی میں شادی کر لی تھی جس سے اس کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھے، جو اس کی واپسی کے انتظار میں جوان ہونے والے تھے مگر جب وہ واپس آیا تو وہ ان کے پاس نہیں گیا۔

وہ اپنے ایک دوست کے پاس ٹھہر گیا۔لیکن وہ رات کو جاگ جاتا تھا پھر اسے نیند نہیں آتی تھی۔صبح تک سگریٹ پھونکتا تھا اور بے چینی سے اِدھر اُدھر یوں پھرتا رہتا تھا جیسے اُسے کسی کھوئی ہوئی شے کی تلاش ہو اور وہ تلاش اُسے پاگل کئے دیتی ہو۔

گھر سے باہر نکلتا تھا تو حیرت سے ہر چیز کو' ہر چہرے کو' ہر منظر کو گھورتا تھا جیسے اُسے پہچاننے کی کوشش کرتا ہو۔اُسے لگتا تھا کہیں بھی کسی بھی وقت کچھ بھی تبدیل ہو سکتا ہو۔شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی مختصر سی زندگی میں اتنے واقعات کا سامنا کر چکا تھا کہ زندگی اُسے تماشا لگنے لگی تھی۔وہ خود کو تماشبین سمجھنے لگتا ہو۔

جب وہ جوان تھا اور اس سے دوسرے قتل کا ارتکاب نہیں ہوا تھا تو اس نے شہر کی ایک طوائف کا نام سُنا تھا اور ساتھ ہی اس کی تعریف بھی کہ وہ اتنی خوبصورت ہے کہ دیکھنے سے میلی ہوتی ہے۔لوگ اسے چاندنی کہتے تھے۔اس وقت اسے اس چاندنی کو دیکھنے کی شدید خواہش محسوس ہوا کرتی تھی مگر اس کے دربار میں تو کوئی دولت مند نواب ہی پہنچ سکتے تھے۔اور اب وہ بھی دولت مند تھا اور اس چاندنی تک پہنچنے کی استطاعت اس میں آ گئی تھی۔

وہ ہر شام اس کے پاس گزار سکتا تھا۔وہ اس وقت اس کے پاس جاتا تھا جب اس کے سارے عاشق اس کا گانا سُن کر واپس جا چکے ہوتے تھے۔وہ لباس بدل کر' تھک کر' اپنی اصل میں واپس آنے کے عمل میں ہوتی تھی۔وہ اب بھی اتنی ہی خوبصورت تھی جتنی کہ اس کی جوانی کے دنوں ہوا کرتی تھی جب اس نے اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔وہ اس کی ہر خواہش پوری کرتا تھا، ہر خوشی اسے خرید کے لا دیتا تھا اور وہ حیران ہوتی تھی کہ صلے میں وہ اس سے کچھ نہیں مانگتا تھا۔

وہ حیرت سے پوچھتی ''تمہیں کیا میری چاہت کی' میری محبت کی خواہش نہیں ہوتی۔تم اپنی مہربانیوں کا صلہ نہیں مانگتے۔''

''کیا مانگوں تم سے۔؟ تمہارے پاس ہے ہی کیا؟ چاندنی۔چار دن کی چاندنی۔؟''

اُسے دھچکا لگا۔''یہ شخص کیا سمجھتا ہے۔؟''

''تو پھر میرے پاس کیا لینے آتے ہو۔؟'' وہ چمک کر بولی۔

''دھوکہ کھانے۔کیوں کہ تم صرف دھوکہ دے سکتی ہو۔''

وہ حیران رہ گئی۔وہ تو اُسے جانتا تھا۔اندر تک اس کی اصلیت تک۔

''پھر بھی تمہیں میرے جسم کی خواہش تو ہوتی ہوگی۔آخر لوگ مجھے دیکھنے کے لئے' ایک جھلک دیکھنے کے لیے دُور دُور سے آتے ہیں۔'' وہ بھی اسے سمجھنا چاہتی تھی۔

''نہیں۔شاید اس لئے کہ میں نے دیکھا ہے یہ جسم جس میں انسان رہتا ہے کتنا کچا ٹھکانا ہے۔مجھے تمہارے جسم کو دیکھ کر حیرت ضرور ہوتی ہے۔خوشگوار حیرت۔ہاں یہ ضرور ہے کہ میں تمہیں چھونا چاہتا ہوں' محسوس کرنا چاہتا ہوں' یہ جاننے کے لئے کہ کیا تم اصلی ہو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا دایاں بازو اٹھایا، اس کے چہرے کی طرف بڑھا دیا۔وہ پیچھے نہیں ہٹی اور نہ ہی اس نے اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کی مزاحمت کی۔

اس نے اس کے گال چھوئے' پھر اس کی ناک اور پھر اس کے ہونٹوں پر انگلی پھیرنے لگا۔عین اُسی لمحے جیسے اندھیرے میں' تصور میں کوئی روشنی پھوٹی' اس نے دیکھا جہاں وہ گرا تھا نیچے کسی مکان کے کمرے میں وہاں ایک بھر بھری کالی سی فضا میں دیوار کے ساتھ ایک ڈھانچہ پڑا تھا جس کا چہرہ' جسم جلا ہوا تھا۔آنکھیں بجھی ہوئی تھیں جو وحشت سے کھُلی رہ گئی تھیں ہونٹ سلامت تھے جو سیاہ مٹی میں تبدیل ہو چکے تھے اور ان ہونٹوں سے نکلتی ہوئی چیخ فضا میں ساکت لمحہ بنی ایسے نظر آتی تھی۔اس نے ہوش سنبھالتے ہوئے ہاتھ سے اس چہرے کو چھوا تھا اور ہونٹوں پر انگلی رکھی تھی اور اس کے انگلی کے لمس سے وہ ہونٹ ٹوٹ کر گر پڑا تھا۔اُس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا یُوں جیسے کسی بچھو نے اُسے ڈنک مارا ہو۔وہ گھبرا کر چاندنی کی طرف دیکھنے لگا۔

''عجیب شخص ہو تم۔'' وہ کہے بغیر نہ رہ سکی کیوں کہ اس کے چہرے پر خوشی کی بجائے درد کی کیفیت تھی۔

''ہاں۔'' اس نے اپنی یاد کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''میں تو تمہارے پاس اس لئے آتا ہوں کہ تم بھی زندگی کا مذاق اڑاتی ہو، اُسے حقیر سمجھتی ہو اسی لئے خود کو اتنا گرا لیتی ہو۔'' وہ چپ ہو گئی۔جمیل کی بات اس کے دل میں ترازو ہو گئی۔فوراً اس کا دھیان اس غم کے احساس کے علاج کی طرف مڑ گیا۔وہ کوشش سے مسکرائی یوں جیسے کسی تکلیف دہ احساس کو ضبط سے چھپاتی ہو۔پھر اُٹھی اور دوسرے کمرے سے شراب کے دو پیمانے بھر لائی، ایک جمیل کے لئے اور دوسرا اپنے لئے۔وہ خود بہت کم پیتی تھی۔آج جمیل نے جیسا اس کا سویا درد جگا دیا تھا جسے بھلانے کے لئے اسے بھی کسی نشے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔وہ ایسی ہی تکلیف دہ اور المناک کیفیت سے بچنے کے لیے کبھی کبھی پیتی تھی اور پینے کے بعد جب اکیلی رہ جاتی تھی تو روتی تھی اور روتے روتے سو جاتی تھی۔

پیمانے خالی ہو گئے تو وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا، شراب کی تاثیر کو اپنے جسم کے ایک ایک ریشے' ایک ایک روئیں میں اُترتے محسوس کرتا رہا اور وہ اسے دیکھتی رہی۔پھر اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور درد بھری آواز میں بولا۔

''میں بھی اس حقیر زندگی کا مذاق اڑانے تمہارے پاس آتا ہوں۔اس مقصد کے لئے اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں۔لوگ پاگل ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ میں یہاں عیاشی کے لئے آتا ہوں۔'' پھر وہ ہچکی لینے کے لیے رکا۔

''یہاں آ کر مجھے سکون ملتا ہے۔میری بے چینی کم ہو جاتی ہے۔تم مجھ پر احسان جو کرتی ہو۔''

چاندنی کی آنکھیں نشے سے بھر جاتی تھیں اور اس کا دل رونے کو

مچلنے لگتا تھا۔ وہ چاہنے لگتی تھی کہ اب جمیل وہاں سے چلا جائے، اُسے اکیلا چھوڑ دے کھُل کر رونے کے لئے۔

اور جمیل وہاں سے چلا گیا پھر لوٹ کے نہیں آیا اور چاندنی وہیں رہ گئی ہندوستان میں۔ وہ شاید اُسے بہت یاد کرتا اگر اُسے خاک وخون کے دریا سے نہیں گزرنا پڑتا جو اس کے راستے میں پڑا جس راستے سے وہ پاکستان آیا۔ اُس نے ایک دفعہ پھر زندگی کی تذلیل کے بے پناہ مناظر دیکھے' انسانی لاشے جن کے اعضاء کٹے پھٹے تھے، جن کی آنکھیں وحشت سے پھٹی ہوئی تھیں، جن کی حرمتیں ادھڑی ہوئی تھیں۔ اُسے ایک دفعہ پھر ہیروشیما کی سڑکیں، گلیاں یاد آ گئیں جہاں زندہ انسان راکھ میں تبدیل ہو کر وقت کے گزران میں ٹھہرے ہوئے تھے حیرت اور وحشت اور بربریت کے ہاتھوں زندگی کی حقارت کا منہ بولتا ثبوت۔ یہ منظر جو انسانیت کا منہ چڑا رہے تھے اس کے حافظے میں نقش ہوتے گئے تھے۔ اور یہ نقش مٹتے نہیں تھے۔ پرانے زخموں کی طرح اُن کے منہ کھلنے لگتے تھے۔

وہ جس قافلے کے ساتھ چلا تھا راستے میں اس پر بلوائیوں نے نیزوں' کرپانوں سے حملہ کر دیا تو وہ اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ جان بچانے کے لیے وہاں سے بھاگا تھا۔ وہ دونوں قریبی جنگل میں گھُس گئے تھے۔ دشمنوں سے بچنے کے لئے وہ دو راتیں وہاں چھپے رہے۔ دوسری رات کے اندھیرے میں اس کے ساتھی نے اس کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ اسے شک تھا کہ اس کے پاس دولت ہے' روپے ہیں۔

میرے پاس کچھ دولت تھی جو میں نے ایک کپڑے میں باندھ کر اپنی کمر کے گرد لپیٹ رکھی تھی اور میرے ساتھی نے اسی پر ہاتھ ڈالا تھا۔ وہ میرے اوپر چڑھ کر دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دبا رہا تھا کیوں کہ وہ جان چکا تھا مجھے مارے بغیر وہ میری پیٹی نہیں چھین سکتا۔ اس کے ہاتھوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ میرا سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ تب میں نے اپنے دائیں ہاتھ سے اپنے دائیں بوٹ کی جراب سے پتلا' لمبے پھل والا چھوٹا تیز چاقو نکالا جو ایسے ہی کسی وقت میں نے چھپایا ہوا تھا اور اسے کھول کر اس کے پہلو میں گھونپ دیا۔ میرا وہ ساتھی ہائے کر کے میرے اوپر سے الٹ گیا اور میں اس کی گرفت سے آزاد ہو کر بے تحاشا بغیر کسی سمت کے تعین کے بھاگ اُٹھا۔ اور ساری رات بھاگتا رہا۔ گرتا پڑتا، خستہ حالوں وہ کسی نہ کسی طرح لاہور پہنچ گیا۔ مہاجر کیمپ میں ایک سماجی کارکن سے اس کی شناسائی ہوگئی جو اپنی کسی بچی کھچی خوبی کی وجہ سے اس پر مہربان ہو گیا اور اس نے اُسے شہر میں انارکلی کے گردونواح میں ایک ٹھکانا دلا دیا جہاں وہ مقیم ہو گیا۔ اور اسی مہربان نے اُسے انارکلی میں ایک چھوٹی سی دکان پر قبضہ کرا دیا جس میں اس نے کھلونے بیچنے کا کاروبار شروع کر دیا۔

اصل میں یہ کاروبار نہیں تھا اور نہ ہی اُسے مال وزر کی خواہش تھی یہ تو ایک طرح کی دل لگی تھی، وقت گزارنے کا ذریعہ تھا۔

دشتِ ماضی کی وحشتوں سے بچ نکلنے کی سعیِ ناکام تھی۔ میں زندگی کو پھر سے نئے رنگ میں جینے کا آرزومند تھا میں نے کھلونوں کی دکان کھول لی تھی کہ یہ بچوں کے شوق کو پورا کرتی تھی۔ بچے اپنے والدین کے ساتھ میری دکان پر آتے تھے، کھلونوں کو دیکھ کر ان کی آنکھیں چمک سے' خوشی سے بھر جاتی تھیں اور میں ان آنکھوں کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ میں بڑوں سے چھپتا تھا، کھلونوں اور بچوں کی آڑ میں رہ کر میں اپنی کمی' اپنی بدصورتی سے بچنا چاہتا تھا۔ میں خود کو دوسرے درجے بلکہ کم تر درجے کی مخلوق سمجھتا تھا۔ میں دنیا کا سامنا کرنے سے گھبراتا تھا۔ خود کو دیکھنے کی' خود کو سمجھنے کی اور خود سے محبت کرنے کی مجھ میں کوئی خواہش نہیں تھی۔ میں بچوں کو خوش دیکھ کر ہی خوش ہو جاتا تھا یہ کافی تھا۔''

اپنی کہانی سُناتے سُناتے وہ تھک جاتا تو چند لمحوں کے لئے خاموش ہو جاتا۔ ''مجھے لگتا ہے میری کہانی بہت لمبی ہوگئی ہے۔ ختم ہونے کو ہی نہیں آتی' آپ اُکتاتی نہیں۔'' وہ عافیت خانہ کی میڈم کو حیرت سے تکتے ہوئے پوچھتا۔ ''نہیں۔ میں تو آپ کی ہمت کی داد دیتی ہوں کہ آپ نے کتنے واقعات جھیلے ہیں۔''

''اور پھر بھی میں زندہ ہوں۔ ہے نا!'' وہ المناکی سے مسکرایا۔

عافیت خانہ کی انچارج کے لئے جس کا اصل نام مسز صالحہ نصیب تھا اور جسے سب لوگ میڈم کہتے تھے جمیل بٹ کی کہانی بڑی دلچسپ تھی اور دردناک بھی وہ ہر دوسرے تیسرے روز جب اُسے اپنے کام سے کچھ فراغت ملتی تو وہ جمیل بٹ کے پاس آ بیٹھتی۔ نشست در نشست وہ اس کی کہانی سنتی جا رہی تھی اور جمع کرتی جا رہی تھی۔ اور جمیل بٹ کی کہانی اُسے کبھی کبھی کسی خیالی کردار کی کہانی سُنائی دیتی تھی جسے کسی کہانی کار نے اپنے تخیل کی مدد سے تخلیق کیا ہو۔

اپنی کہانی سناتے ہوئے جمیل بٹ کی آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک کے اندر سے اس کی آنکھیں گزرتے وقت کو دیکھتی تھیں اور وہیں وہ ماضی کے دھندلکوں میں دیکھتے ہوئے بولتا تھا۔

''میری کھلونوں کی دکان پر دو بچے آتے تھے اپنی ماں کے ساتھ' ہر دو چار دن بعد نئے کھلونے خریدنے کیونکہ ان کے پرانے کھلونے ٹوٹ جاتے تھے۔ آہستہ آہستہ میری ان بچوں سے دوستی ہوگئی اور ان کے واسطہ سے میں ان کی ماں کے بھی نزدیک آ گیا اگرچہ وہ کوشش اور ارادے سے مجھے اپنے نزدیک آنے سے روکتی تھی۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ کسی حاجی ذوالفقار صاحب کے گھر ان کے مکان کے حصے میں رہتی تھی۔ حاجی صاحب اُسے مہاجر کیمپ سے اپنے گھر لے آئے تھے جہاں وہ لاوارث تھی کیوں کہ اس کے تمام گھر والے ہجرت کے دوران مارے گئے تھے۔ اور اُسے کسی جائے پناہ کی تلاش تھی۔

اُس کے بچے اُسے میری دوکان پر کھینچ لاتے تھے اور کبھی کبھی اس کے پاس کھلونوں کی قیمت ادا کرنے کے لئے پیسے نہیں ہوتے تھے تو میں بچوں کو تحفۃً کھلونے دے دیتا تھا۔ جب وہ کچھ دن میری دوکان پر نہیں آتے تھے تو مجھے

بے چینی ہونے لگتی تھی۔ مجھے ان کی عادت ہوتی جارہی تھی اور میں محسوس کررہا تھا ان بچوں کی وجہ سے میں زندگی میں کچھ دلچسپی لینے لگا تھا۔

''ایک روز میں نے چابی والی ایک گڑیا اس بچی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا تھا ہم بھی فطرت کی اندھی طاقتوں کے ہاتھوں میں کھلونوں کی طرح ہیں کہ وہ طاقتیں ہم سے کھیلتی رہتی ہیں اور پھر کسی روز اُکتا کر ہمیں توڑ ڈالتی ہیں۔''

اب کی دفعہ سلطانہ میری دکان پر آئی تو اکیلی تھی بچے ساتھ نہیں تھے۔ اس نے بادامی رنگ کی چادر میں خود کو لپیٹا ہوا تھا۔ میری دکان پر آ کر اس نے اپنا چہرہ کھولا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ وہ بول پڑی۔

''آج میں بچوں کے کھلونے لینے نہیں آئی۔ اپنا مسئلہ لے کے آئی ہوں۔'' وہ کچھ دیر خاموش رہی' یوں جیسے سوچتی ہو کہ وہ کیسے بات کرے۔ پھر بولی۔

''وہ حاجی ذوالفقار جنہوں نے مجھے اپنے مکان میں رہنے کی جگہ دے رکھی ہے اور جن کے لئے میرے دل میں بڑا احترام تھا، عجیب سے مطالبہ پر اتر آئے ہیں۔ اچانک ان کا رویہ بدل گیا ہے ان کی نظریں بدل گئی ہیں۔''

''کیا کہتے ہیں وہ۔؟''

''وہ کہتے ہیں مجھ سے نکاح کرلو۔ میں اور برداشت نہیں کرسکتا۔''

''اچھا۔۔۔!'' میں حیران رہ گیا۔

''اب تک تو برداشت کرتے رہے ہیں۔''

''وہ تو مجھے بیٹیوں کی طرح سمجھتے تھے۔ پتا ہی نہیں چلا کیسے ان کی نظریں بدل گئیں۔ میں اب یہ گھر چھوڑ کر کہیں اور جا بھی تو نہیں سکتی۔''

تم فکر نہ کرو۔ ان سے ایک ہفتہ کی مہلت حاصل کرو۔ میں اتنی دیر میں کچھ انتظام کرتا ہوں۔ اور دھیان رہے کہ تم نے پریشان نہیں ہونا۔ تمہارا یہ مسئلہ میری ذمہ داری ہے۔

حاجی صاحب نے سلطانہ کو مہلت دے دی اس امید میں کہ اس کے ختم ہونے پر ان کے حق میں فیصلہ ہوگا۔

اور میں نے ایک شخص کا پتہ چلایا جو محکمہ بحالیات کا اہلکار تھا اور اس کی مدد سے وہ مکان اپنے نام الاٹ کرالیا جسے خالی پا کر حاجی صاحب نے اس پر اپنا قبضہ کرلیا تھا۔ مجھے بس تھوڑی سی رقم خرچ کرنا پڑی جس کی میرے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔

تیسرے دن حاجی صاحب کو وہ مکان خالی کرنے کا نوٹس مل چکا تھا اور چوتھے دن میں ان کے گھر پہنچ گیا اور میں نے انہیں صاف صاف بتا دیا کہ یہ مکان مجھے الاٹ ہو چکا ہے اور وہ اس پر ناجائز قابض ہیں' اسے فوراً خالی کردیں۔

انہوں نے مجھ سے مہلت مانگی۔ اور میں نے انہیں دو دن کی مہلت دے دی اور ساتھ ہی ان کو اتنی ہی رقم بھی دے دی جس کی کہ وہ خواہش کرسکتے تھے۔

اور ساتویں دن حاجی صاحب وہ مکان چھوڑ کر چلے گئے۔ اور میں نے بڑی خوشی سے سلطانہ کو بتایا کہ اب وہ اس گھر کی مالک ہے۔

''نہیں۔ آپ اس گھر کے مالک ہیں۔ میں اس گھر میں اکیلی نہیں رہ سکتی۔ بہتر ہوگا کہ آپ بھی یہاں آجائیں، ویسے بھی آپ جہاں رہتے ہیں وہ کوئی گھر تو نہیں۔ وہاں آپ اکیلے ہی رہتے ہیں۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔

''میں آپ سے نکاح کرنے کو تیار ہوں۔'' اس نے مجھے سوچتے ہوئے دیکھ کر کہا اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔''

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں تم نے کیا سوچ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔؟''

میں نے اپنے تعجب کا اظہار کرنا ضروری خیال کیا۔

''بس آپ مجھے اچھے لگے ہیں۔ اور پھر مجھے آپ جیسے کسی مرد کی پناہ کی بھی ضرورت ہے۔ میرے بچوں کو بھی ایک باپ کی شفقت مل جائے۔ وہ ویسے بھی آپ سے بہت مانوس ہو چکے ہیں۔

میرے لئے انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں تو خود کسی ایسے سہارے کی تلاش میں تھا جو مجھ میں پھر سے زندگی کا شوق جگا دے، میری سوئی ہوئی مایوس قوتوں کو زندہ کردے، مجھے میرا اعتبار واپس دے دے جو زندگی کے حادثات نے مجھ سے چھین لیا تھا۔

اس طرح میں نے سلطانہ سے شادی کرلی، اس کے دو پیارے پیارے بچوں کا باپ بن گیا۔

میں ان بچوں اور ان کی ماں کی مدد سے نئے سرے سے زندگی شروع کرنا چاہتا تھا، میں چاہتا تھا وہ میری مدد کریں، زندگی پر میرا اعتماد بحال کرنے میں میرا ساتھ دیں اور اس کے لئے میں نے اپنی محبت، اپنی دولت اُن پر نچھاور کرنا شروع کردی۔ انہیں اچھی سے اچھی تعلیم کے لئے سہولتیں فراہم کیں اور میں بھول ہی گیا کہ وہ میری اولاد نہیں ہیں۔ جب میں نے ان کی ماں کو اپنا لیا تھا تو ان بچوں کو بھی اپنی اولاد بنا لیا وار سب لوگ یہی سمجھنے لگے۔ بچے بڑے ہوتے گئے لیکن خلاف توقع ان کی ماں بوڑھی نہیں ہوئی۔ زندگی کی سہولتوں کی فراوانی نے اس کے کمزور، سوکھے جسم میں نئی تازگی بھر دی۔ ایک نیا نکھار اس کے جسم پر' اس کے چہرے پر پھیلتا گیا۔ میں جانتا تھا یہ سب اس خوشحالی کی وجہ سے تھا جو اُسے میسر آ گئی تھی مگر وہ اس کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ وہ خوش تھی لیکن وہ اس خوشی کے لئے میری شکر گزار نہیں تھی۔

اس نے نئے دوست بنا لئے تھے اور امیر گھرانوں کی عورتوں کے گھروں کی محفلوں میں شرکت اس کا نیا شوق بن گیا تھا۔

بچے بڑے ہوتے ہی اپنے رویے اور اپنے طرزِ زندگی میں کافی آزاد ہو گئے تھے۔ بیٹی کی تو میں نے شادی کردی مگر بیٹا ابھی آزاد رہنا چاہتا تھا۔ اس نے ریڈی میڈ کارمنٹس کی فیکٹری لگا لی جس کے لئے میں نے اپنی

کھلونوں کی دکان بیچ دی۔ ''میں تم لوگوں کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔'' اس نے ان تینوں کو کہا تھا۔ وہ ان کی خوشی کے ذریعہ اپنی بازیافت کرنا چاہتا تھا۔

عجیب بات یہ تھی کہ وہ تو خوش تھے مگر انہیں یہ جاننے کی فرصت نہیں تھی کہ وہ کیا محسوس کر رہا تھا۔ اور وہ تھا کہ اس کی تنہائی کا احساس اب بھی اس پر محیط رہتا تھا یہاں تک کہ وہ راتوں کو اچانک چیخ مار کر بیدار ہو جاتا تھا ''وہ مجھے مارنا چاہتے ہیں۔'' وہ سلطانہ کو بتاتا۔

''تمہیں تو وہم ہو گیا ہے جمیل۔ نہ خود سوتے ہو نہ مجھے سونے دیتے ہو۔''

وہ اسے ڈانٹ دیتی جب کہ اس کی خواہش ہوتی کہ وہ اُسے اپنے سینے سے لگا کر تسلی دے' اسے تھپک کر سُلائے۔ وہ تو سو جاتی پہلو بدل کر مگر وہ جاگتا رہتا کسمساتا رہتا۔ اور سونے سے ڈرتا رہتا کہ خواب میں اس کے دشمن پھر اس کے پیچھے بھاگنے لگیں گے۔

اُس شام بھی وہ اپنے بستر پر لیٹا اپنی زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا جب ''عافیت خانہ'' کی میڈم اپنے کام کاج سے وقت نکال کر اس کے پاس آ گئی۔ وہ اسے دیکھ کر اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اُسے پتا تھا اب اُسے پھر سے اپنی بقیہ کہانی بیان کرنا پڑے گی۔ اس نے اپنی عینک اتاری' اپنی قمیض کے دامن سے اسے صاف کیا اور اپنی آنکھوں پر پہن لی' دو چار لمحوں کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے دیکھا وہ اپنی بیوی سلطانہ اور اپنے بیٹے کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور تصور کی آنکھ سے انہیں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ میں نے ان کی زندگی بدل دی تھی اپنا سب کچھ اُن پر نثار کر دیا تھا۔ انہیں زندگی میں بحال کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ بیٹے کی شادی بھی کر دی تھی' اس کی اور اس کی ماں کی مرضی کے مطابق۔ وہ خوش تھے کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ اپنے حال پر خوش نہ ہوتے۔ مگر وہ میری خوشی' غمی سے غافل ہو چکے تھے۔ یوں جیسے میرا کام ختم ہو چکا تھا جیسے میرا رول بس اتنا ہی تھا۔ انہیں ایک اچھی زندگی مہیا کر دینا۔ لیکن میں خود تو تہی دست ہو گیا تھا۔ خالی ہو گیا تھا۔ اور ہر نئے دن کے ساتھ مجھے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ گھر میرا نہیں تھا۔ اس گھر کو اور اس گھر والوں کو میری ضرورت نہیں تھی۔

اگر یہ بھی میری دنیا نہیں تھی تو پھر مجھے کہاں جانا تھا۔ میں سوچتا رہتا تھا۔

اور پھر رات آتی تھی اور وہ مجھے میرے ڈراؤنے خوابوں کے ساتھ میرے کمرے میں اکیلا چھوڑ دیتے تھے۔ سلطانہ نے اپنا کمرہ علیحدہ کر لیا تھا۔ رات کو جو میں چیخیں مارتا اُٹھ جاتا تھا' اس سے اُس کی نیند میں خلل پڑتا تھا۔

پھر وہ عورت جو میری محبت' میری توجہ سے یوں پھلی پھُولی تھی جیسے مردہ مٹی بارشوں سے زندہ ہوتی ہے اور بارآور ہو جاتی ہے' اُسے کینسر ہو گیا۔ اچانک ہی۔ جگر کا کینسر۔ میں نے اس کا علاج کرایا' اپنا سارا وقت اپنی بچی کھچی دولت اس کے علاوج پر صرف کر دی مگر وہ صحت یاب نہیں ہوئی۔ وہ میری نظروں کے سامنے ایک بے بس مخلوق کی طرح' ایک عام جاندار کی طرح مر گئی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ میری نہیں تھی، وہ مجھے محروم کر گئی۔ آخری دنوں میں موت کے خوف سے روتی تھی اور میں اسے اپنے سینے سے چمٹا چمٹا کر اسے تسلیاں دیتا تھا۔ زندہ رہنے کی پوری خواہش کے باوجود وہ مر گئی۔ میں صدمہ کے بوجھ تلے کئی دن سسکتا رہا۔ مگر ان دونوں نے' میرے بیٹے اور میری بیٹی مجھے حوصلہ دینے نہیں آئے۔

اور تب سے میں نے جینا چھوڑ دیا۔ میری زندگی میں کچھ بھی ایسا نہ رہا جو مجھے زندہ لوگوں میں شمار ہونے کے قابل چھوڑ دے۔ اور پھر میں راتوں کو چیختا تھا۔ خواب میں چیخنا شروع کرتا تھا' جاگ جاتا تب بھی چیختا رہتا۔ بھاگتا رہتا اپنے دشمنوں سے بچاؤ کی خاطر' اپنی مرضی' اپنی خواہش کے بغیر۔

اور پھر ایک رات میرے بیٹے نے مجھے میرے بستر سے اُٹھایا' وہ جیسے مجھے دھکیلتا ہوا گھر سے باہر لایا۔ دروازے پر رکشہ کھڑا تھا، اس میں مجھے بٹھایا، ڈرائیور کو ایک سو روپے کا نوٹ دیا اور اُسے میں نے کہتے سُنا ''جہاں یہ پیسے ختم ہو جائیں وہیں انہیں اُتار دینا۔

اور میں چپ بیٹھا رہا۔ چیخا نہ چلایا اور رکشہ چل پڑا۔

سو روپے کی مسافت تھی ہی کتنی' وہ مجھے بڑی سڑک کے کنارے اتار کر چلا گیا' جہاں سے ایک راہ گیر مجھے انگلی لگا کر یہاں لے آیا، اس عافیت خانہ میں۔ اور بس۔

اس کی نظر کی موٹی عینک کے پیچھے اس کی دھندلائی ہوئی آنکھیں آنسوؤں میں بھیگ رہی تھیں۔

اور صالحہ نصیب۔ عافیت خانہ کی انچارج نہیں جانتی تھی کہ وہ کن الفاظ میں اُسے تسلی دے۔

''تو بٹ صاحب۔ آپ کا سفر اس طرح کٹ گیا۔ مکمل ہو گیا۔''

صالحہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی مگر وہ اپنے الفاظ کو سوالیہ انداز میں نہیں ڈھال سکی۔ جمیل بٹ نے چند لمحے غور سے اپنی اس محسن کو دیکھا اور پھر کہا۔ کٹنے کو تو میرا سفر کٹ گیا ہے۔ مگر۔ مگر۔۔۔'' وہ کچھ سوچنے کے لئے رکا۔ ''میری منزل ابھی نہیں آئی۔'' پھر جیسے وہ چپ ہو گیا۔ اس کی سانس ہی رُک گئی۔ کسی خیال کی پھانس اٹک گئی اس کے دماغ میں۔

''یا ہو سکتا ہے میری کوئی منزل ہی نہ ہو۔ سب سفر ہی ہو۔ مسلسل سفر جس سے اب میں تھک گیا ہوں۔ اور اب میں سونا چاہتا ہوں۔ آپ جاؤ۔ آپ کی بڑی مہربانی۔''

یہ کہہ کر وہ اپنے بستر پر چت لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں' خاموش ہو گیا یوں جیسے اب کبھی نہیں جاگے گا۔

☆

پانچ بجکر بیالیس منٹ

فیروز عالم
(کیلی فورنیا)

شاید کسی آواز سے میری آنکھ کھلی تھی۔ میں نے اٹھ کر دبے پاؤں جا کر برابر والے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ بھائی صاحب ابھی تک جاگ رہے تھے اور لیمپ کی بہت ہی مدھم روشنی میں میز پر جھکے ہوئے کچھ لکھ رہے تھے۔ انکے سامنے ایک لفافہ اور کچھ تصویریں بکھری پڑی تھیں۔ یہ شاید انہی کی دبی دبی سسکی تھی جس سے میری نیند کا سلسلہ ٹوٹا تھا۔ میں کچھ دیر کے لئے جیسے ساکت سا ہوگیا۔ چاروں طرف ایک بیحد دلدوز ویرانی چھائی تھی اور ماحول بہت ہی یاس انگیز تھا۔ دور دور تک ایک روح فرسا سناٹا تھا۔ میرے اپارٹمنٹ کے باہر چیڑھ کے اونچے اونچے اور گھنے درخت مشیگن کے شدید موسم سرما میں پتوں سے محروم ہوکر جیسے تنہا اور اداس کھڑے تھے۔ کبھی کبھی ہوا کا ایک تیز اور تند جھونکا میری کھڑکی کے بندشیشوں سے ٹکراتا اور پھر یہ کھڑکی دیر تک لرزتی رہتی۔ میں نے باہر جھانکا۔ برفباری تھم چکی تھی اور فضا پر ایک چمکیلا اندھیرا مسلط تھا۔

ہم دونوں تنہا تھے اور اپنے وطن کی رونقوں سے ہزراوں میل دور۔۔ کہاں رہ گئیں وہ بارونق شامیں اور وہ منور راتیں جب زندگی مسکراتی تھی۔ میں نے بڑے دکھ سے سوچا۔۔ کہیں یہ فیصلہ غلط تو نہیں تھا!!

مجھے معلوم تھا بھائی صاحب کیا لکھ رہے ہیں اور کسے لکھ رہے ہیں مگر مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میں انکی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ بلکہ مجھے تو ان کے سلسلے میں ایک شدید احساس ندامت اور احساس جرم تھا کہ انکی اس حالت کا شاید میں ہی ذمہ دار ہوں۔

۱۹۷۰ کے اوائل میں، میں پاکستان میں کیمسٹری میں ایم ایس سی کر نے کے بعد ایک مقامی کالج میں لیکچرر کی ملازمت کر رہا تھا جب میرے کسی دوست نے مجھے یہ نوید سنائی کہ وہ امریکہ جارہا ہے۔ ''امریکہ۔۔؟؟'' مجھے شدید حیرت ہوئی۔ امریکہ تو کائنات کے کسی اور ہی ستارے کی بستی ہے۔ وہاں تو کسی دوسری دنیا کی مخلوق رہتی ہے۔ اس جادونگری کی جو داستانیں ہم نے سنی تھیں اسکی وجہ سے یہی کچھ خیالات امریکہ کے متعلق ہم تیسری دنیا کے باسیوں کے تھے۔ پھر یہ کہ کسی بیحد معمولی حیثیت کے انسان کا امریکہ جانا تو بالکل ہی ناممکن خیال کیا جاتا تھا۔ اس نے یہ کہہ کر مجھے ایک خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیا کہ آج کل ''ضرورت'' کے تحت سائنس اور ایسے ہی دوسرے مضامین میں گریجویشن کرنے والے افراد کو فوراً امریکہ کا ویزا مل رہا ہے۔ میں نے ایک لمحہ ذائع کئے بنا کراچی میں فریئر ہال کے عقب میں واقع امریکی ایمبسی میں ویزے کی درخواست دیدی جو جلد ہی منظور ہوگئی۔ میرے راستے میں امریکہ آنے میں کوئی رکاوٹیں بھی نہیں تھیں۔ میں نوجوان تھا اور ابھی میری شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اماں سے اجازت لینے میں ذرا مشکل ہوئی پھر انہوں نے بھی میرے اچھے مستقبل کی خاطر دل پر پتھر رکھ لیا اور اس طرح میں بھی ان لاتعداد لوگوں کی طرح جو اپنی قسمت آزمانے امریکہ کے خواب دیکھتے تھے ڈیٹرائٹ پہنچ گیا۔

اگرچہ شروع میں مجھے بھی تنہائی، اپنوں سے دوری، دوستوں سے محرومی اور ایک انجانے کلچر کی وجہ سے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور میں بھی شدید ذہنی الجھن اور ڈپریشن کا شکار ہوا تھا مگر جلد ہی مجھے فورڈ موٹر کمپنی میں پٹرولیم کی تحقیق پر ملازمت مل گئی۔ اور نہ صرف اس سے میرا ذہن بٹ گیا بلکہ اس کے ساتھ ہی جب مالی فراغت بھی حاصل ہوئی تو مجھے بہتر لگنے لگا۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اچھا لگنے لگا تھا یا گذرے وقت اور کراچی کی رونقیں یاد نہ آتی تھیں مگر وقت کے ساتھ ساتھ میں امریکہ کے ماحول کا عادی ہوگیا اور کچھ نئے پاکستانی دوست بھی بن گئے۔

میں پھر بھی اکیلا تھا اور میرا دل چاہتا تھا کہ میرے گھر والے بھی یہاں آجائیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ بہت سے گھرانے ایسے تھے کہ کئی لوگ یہاں ساتھ ساتھ آئے تھے۔ اس سے ان لوگوں کو بڑی تقویت محسوس ہوتی تھی اور تنہائی اور وطن سے دوری کا احساس بڑی حد تک مٹ گیا تھا۔ میرے بڑے بھائی بی اے کر کے کسی سرکاری محکمے میں کلرکی کر رہے تھے۔ مشکل سے گذارا ہوتا تھا۔ انکا ایک پیارا پیارا بیٹا بھی تھا جس سے وہ اس قدر پیار کرتے تھے کہ وہ انکی ساری کائنات اور انکا مقصد حیات تھا۔ ان کے گھر آتے ہی وہ انکے پیروں سے لپٹ جاتا اور وہ کتنے بھی تھکے ہوتے وہ اسے گود میں اٹھا کر سینے سے لگاتے اور کبھی کندھے اور کبھی پیٹھ پر بٹھا کر سواری کراتے۔ میں بھی نہ صرف بھائی جان سے بلکہ ثریا بھابی سے بھی ذہنی طور پر بہت قریب تھا اور مجھے انکی کمی بہت محسوس ہوتی تھی۔ پھر میں یہ بھی سوچتا تھا کہ انکے آنے سے بھائی صاحب کے حالات میں بھی ایک خوشگوار تبدیلی آئیگی اور میری بھی تنہائی مٹ جائیگی۔

میں نے بڑی کوششیں کیں مگر آرٹس کے بی اے کے لئے امریکہ کا ویزا ممکن نہیں تھا۔ ادھر میں خود ابھی عارضی ویزا یعنی گرین کارڈ پر تھا اور شہریت حاصل کئے بغیر بھائی بھاوج کو نہیں بلا سکتا تھا۔ ابھی میری شہریت میں ایک طویل عرصہ درکار تھا۔ ایسے میں کسی نے مجھے بتایا کہ ان دنوں اسٹوڈنٹ ویزا یا سیاحی کا ویزہ بہت آسان ہے اور ایک دفعہ وہ یہاں پہنچ جائیں تو پھر کوئی ترکیب کی جاسکتی ہے۔ سینکڑوں لوگ یہاں ایسے ویزہ پر آکر ''غائب'' ہو چکے ہیں اور سالوں سے آرام سے رہ رہے ہیں ''کوئی نہیں پوچھتا''۔

میں نے فوراً بھائی صاحب کے سیاحی کے ویزہ کے کاغذات تیار

کروائے اور کراچی بھیج دئے۔ بھائی صاحب کو ویزہ کی پیشکش تو فوراً ہوگئی مگر اس میں یہ مشکل تھی کہ ویزہ صرف تنہا انہیں ملنا تھا اور انہیں اپنے بیٹے اور بیوی کو چھوڑ کر امریکہ آنا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بھابی سے کس قدر پیار کرتے ہیں اور بھابی کیسے انکی زندگی میں ایک چھتنار درخت کی حیثیت رکھتی ہیں جو انہیں ہر دھوپ اور پریشانی سے بچائے رکھتا ہے۔ پھر اپنے بیٹے کو چھوڑنے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مگر ڈیٹرائٹ میں پاکستانی کمیونٹی نے مجھے ایسی کئی مثالیں دیں کہ ایسے کتنے ہی لوگ یہاں پہلے آئے تھے پھر ذرا سیٹل ہو کر انکے کنبے کے آنے کا بھی بندو بست ہو گیا تھا۔ سبھی نے مجھے بہت شرمندہ کیا کہ ''ارے صاحب آپ ہاتھ میں آئی سونے کی چڑیا کو جانے دے رہے ہیں۔۔ بھائی! اپنے بھائی صاحب سے کہیں مردبنیں۔ دیکھیں تو سہی کتنے لوگ مشرق وسطیٰ میں اکیلے ملازمتیں کرتے ہیں اور انکے بیوی بچے پاکستان میں ہوتے ہیں'' پھر ہر ایک نے یہی کہا کہ ایک دفعہ وہ یہاں آ تو جائیں پھر دیکھا جائیگا۔ میں نے بھی اس مسئلے پر سوچ بچار کے بعد یہی فیصلہ کیا کہ بھائی صاحب کو اسی بات پر راضی کروں کہ فی الحال بھابی اور ننھے ساجد کو چھوڑ کر ہی امریکہ آ جائیں۔ اس طرح بھائی صاحب بھی سیاحت کے ویزہ پر امریکہ آ گئے۔

شروع شروع میں تو امریکہ آنے اور نئی نئی جگہیں دیکھنے کی خوشی میں وہ کچھ دن پاکستان کو بھولے رہے۔ پھر انہیں بھی ایک مقامی کمپنی میں کوئی مشین چلانے کی رات کی نوکری مل گئی اور اسکے ساتھ ایک اچھی تنخواہ، جسے پاکستانی کرنسی میں تبدیل کرنے سے چودہ طبق روشن ہو جاتے تھے، اس وجہ سے کچھ انکا دل بہل گیا۔ مگر ایک آدھ مہینے کے بعد پاکستان، بھابی اور ننھے کی یاد ایسی ادبدا کر آئی کہ ایک دن جب میں واپس اپنے اپارٹمنٹ آیا تو وہ اپنا کمرہ بند کئے زار زار رو رہے تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے انہیں کھانا کھانے پر راضی کیا۔ انہیں ایک ہی رٹ تھی کہ ارشد مجھے اگلے ہفتے ہی واپس پاکستان بھیج دو۔ مجھے یہاں نہیں رہنا۔ بہت کوشش سے انکا دل بہلایا اور ان سے یہ وعدہ کر کے کہ اگلے ہفتے کچھ نہ کچھ کرنے کی کوشش کرونگا ان کو رات کی نوکری پر روانہ کیا۔ بھائی صاحب روتے پیٹتے تو رہے مگر رفتہ رفتہ انکے دل کو چین آتا گیا۔ یہ انسانی فطرت بھی ہے۔ کبھی جذبات کا چڑھا ہوا دریا اترتا تو خود ہی کہتے یہ بھی تو سوچو میں کتنی اچھی تنخواہ لے رہا ہوں۔ تمہاری بھابی کے کیسے ٹھاٹھ ہیں اور ننھا بھی کتنے اچھے اسکول میں پڑھ رہا ہے۔ اور ارشد اب تو میں نے انہیں ایک گاڑی بھی خرید دی ہے۔ بھلا سوچو تو سہی میں اپنی کلرکی کی نوکری میں یہ سب کر سکتا تھا۔ مگر ارشد اگر تمہاری بھابی ثریا اور ننھا ساجد بھی یہاں آ جائیں تو کیسا مزہ آئے۔ کتنا اچھا ملک ہے، صاف ستھرا، سرسبز پہاڑیاں، نیلی جھیلیں اونچے اونچے صنوبر کے درخت اور ہر چیز کی فراوانی۔ ہم دونوں سوچتے کہ کیسے بھابی اور ساجد کو یہاں لایا جائے۔ اب تو وہ خود بھی ''ال لیگل'' ہو چکے تھے۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

شام کے کچھ گھنٹے جب ہم دونوں بھائی جمع ہوتے تو ہم پاکستان کی، کراچی کے ان محلّوں کی جہاں کے چپے چپے پر ہماری یادوں کے نقوش ثبت تھے، اپنے گھر کی اور بھابی اور ننھے ساجد کی باتیں کرتے۔ دراصل میں بھی ان دونوں کو بہت ہی یاد کرتا تھا۔ بھابھی سے نہ صرف میری بہت ہی گہری دوستی تھی بلکہ میں ان سے ایک ایسی محبت کرتا تھا جسے کوئی نام دینا ممکن نہیں تھا اس میں انکے لئے پیار کے علاوہ ایک خاص قسم کا احترام بھی شامل تھا۔ اگرچہ ہماری عمروں میں زیادہ فرق نہ تھا مگر مجھے اسکا پورا احساس تھا کہ وہ میری بڑی بھابی ہیں۔ وہ ایک دراز قد، بادامی آنکھوں، زیتونی رنگت اور باغ و بہار فطرت کی حامل نہایت خوبصورت شخصیت تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ گھر کی ساری رونقیں صرف انکے دم قدم سے ہیں۔ یوں تو ہمارے درمیان دیور بھابی کی روایتی نوک جھونک چلتی تھی مگر ہندو دیو مالائی عقیدے کی طرح، کہ جب کرشن جی سے کسی نے پوچھا کہ تم اپنی بھابی سیتا کو کیسے پہنچانو گے تو انہوں نے کہا کہ انکے پاؤں دیکھ کر، کہ اس سے اوپر میری نظریں کبھی نہیں اٹھیں،

میں انکا بیحد ادب کرتا تھا اور مجھے ان سے ایک والہانہ عقیدت تھی۔ گذرے دنوں کی ان باتوں سے ایک عجب ملی جلی کیفیت طاری ہو جاتی ایک انجانی خوشی کے ساتھ ساتھ ایک میٹھی سی کسک بھی دل میں اٹھتی کہ کاش سب یہاں یکجا ہوتے پھر بھائی صاحب مَرے دل سے اپنی رات کی نوکری پر چلے جاتے۔

اب ہمارا حلقہ کچھ وسیع ہو گیا تھا۔ پاکستانی کمیونٹی کی تقریبات میں آنے جانے سے ہماری بہت سے لوگوں سے ملاقات ہو گئی تھی یوں تو کئی مشہور اور باعزت افراد تھے مگر شیخ ضیاء الاسلام صاحب کے بڑے چرچے تھے۔ شیخ صاحب یہاں کوئی پندرہ سال سے تھے اور کئی قسم کے کاروباری معاملات میں انکی حصہ داری تھی۔ آسودہ حال تھے اور اسلام کے نام اور کام سے خاص نسبت رکھتے تھے۔ جہاں مذہب کا نام ہوتا وہاں شیخ صاحب پیش پیش ہوتے۔ نماز کا بڑا سا گٹہ ماتھے پر نمایاں تھا جسے دیکھ کر میں سوچا کرتا تھا کہ میرے بزرگوں نے مجھے بتایا ہے کہ یہ قیامت کے دن ستارے کی طرح چمکے گا۔ اچھی خاصی دلچسپ محفل میں جہاں خوش گپیاں ہو رہی ہوتیں اگر مغرب کا وقت آ جاتا تو سلسلہ کلام منقطع کر کے سب کو فوراً نماز پڑھ نے کا حکم دے کر امامت کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ دوسروں کو دین کی پیروی کی تلقین کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ سنا تھا کہ ذبیحہ گوشت کھانے کے معاملے میں اس قدر پختہ تھے کہ چونکہ اس زمانے میں ایسی دکانیں ناپید تھیں جہاں ذبیحہ گوشت ملتا ہو تو خود کھیتوں میں جا کر جانور ذبح کرتے تھے۔ اس معاملے میں اس قدر سخت تھے کہ دوسروں پر اعتراض اور انہیں کڑوے انداز سے سخت سست کہنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انکے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ بہت ہمدرد ہیں اور

ہر شخص کے کام آتے ہیں اور کیسا ہی پیچیدہ مسئلہ کیوں نہ ہو وہ اسکا بہت ہی جائز، قابل عمل اور قانونی حل نکال لاتے ہیں۔ میں نے اپنے ایک دوست سے جو یہاں انہی کی طرح کئی سال سے رہائش پذیر تھا جب انکی تعریف کی تو وہ دبی زبان سے کہنے لگا بھئی ارشد میں کسی کی غیبت نہیں کرنا چاہتا مگر شیخ صاحب کے متعلق لوگ معلوم نہیں کیا کیا کچھ کہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ شیخ صاحب کی وجہ شہرت یہ بھی ہے کہ انکا ذہن ایسا زرخیز ہے کہ انکے حل ایسے ہوتے ہیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

آج رات جب بھائی صاحب کی ہفتے وار چھٹی تھی وہ شام ہی سے بہت دل برداشتہ تھے۔ رہ رہ کر ننھا ساجد بہت ہی یاد آ رہا تھا۔ ادھر رمضان شروع ہو چکے تھے اور مشی گن میں تو یہ بھی معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ ہماری روایات اور عقیدے کے لحاظ سے کتنا مبارک اور خوشیوں بھرا مہینہ آ پہنچا ہے۔ پھر شام کی ڈاک سے بھابی کا عید کارڈ اور اس کے ساتھ کچھ تصویریں بھی آئی تھیں۔ بھابی خط بہت ہی دلآویز لکھتی تھیں۔ وہ کبھی ایسے جملے نہیں لکھتی تھیں جس سے بھائی صاحب کو مزید تکلیف یا احساس پشیمانی ہو مگر پھر بھی انکی تحریر سے انکی تنہائی اور بھائی صاحب کی جدائی میں گزرنے والے اوقات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ شاید اسی خط اور عید کی قربت نے بھائی صاحب کے ضبط کے بندھن توڑ ڈالے تھے اور وہ رات کے اس سناٹے اور تنہائی میں بھابی کو خط لکھتے ہوئے انہیں اور ننھے ساجد کو یاد کر کے سسکیاں لے لے کر رو رہے تھے۔ مجھے ایسے میں شیخ ضیاء الاسلام یاد آئے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کل وقت ملتے ہی سب سے پہلے انہیں ہی فون کرونگا اور بھائی صاحب کے مسئلے کا حل ان سے طلب کرونگا۔ پوری رات نیند مشکل سے آئی کبھی سوتا کبھی جاگتا رہا۔

میں نے دوپہر کے کھانے کے وقفے میں انہیں فون کیا کیونکہ کمپنی میں اس وقت کے علاوہ ہمیں فون کی اجازت نہیں تھی۔ شیخ صاحب کو اپنا مسئلہ بتایا کہ بھائی صاحب تو غیر قانونی طور پر رہائش پذیر ہیں اور انکا سیاحت کا ویزہ ختم ہوئے بھی ایک سال ہونے کو آیا۔ وہ اپنی بیگم اور بچے کے بنا نہیں رہ سکتے مگر پاکستان جانا بھی نہیں چاہتے اگر کوئی ایسی قانونی صورت نکل آئے کہ انکا کنبہ یہاں آجائے۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ انہوں نے کئی پاکستانیوں کو جھوٹے سچّے ویزہ پر امریکہ بلوایا ہے۔ مجھ سے پوری صورتحال پوچھی کچھ سوال بھی کئے اور کہنے لگے میاں ارشد آپ مجھے شام پانچ بج کر بیالیس منٹ پر فون کر لیں۔ میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو ذرا سختی سے فرمایا کہہ تو دیا کہ پانچ بج کر بیالیس منٹ کے فوراً بعد فون کرنا۔ میں مزید کیا کر سکتا تھا؟ وقت کاٹنا مشکل ہو گیا۔

شام پانچ بج کر بیالیس منٹ کے تھوڑی ہی دیر بعد میں نے فون کیا کہنے لگے میں تمہارے فون کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ پھر کہنے لگے بالکل صاف اور قانونی حل ہے۔

''میاں تمہارے پاس تو گرین کارڈ ہے اور آج کل گرین کارڈ والے تو اپنے متعلقین کو دو ہفتے میں امریکہ لا سکتے ہیں۔ آپ کے بھائی صاحب ثریا کو طلاق دیں۔۔ آپ ان سے شادی کر کے انہیں اور بچے کو امریکہ لائیں۔ جب انہیں گرین کارڈ مل جائے تو آپ پھر ثریا کو طلاق دیں اور آپ کے بھائی صاحب ان سے شادی کریں۔ اب ثریا کے گرین کارڈ کی وجہ سے آپ کے بھائی صاحب کو بھی گرین کارڈ مل جائیگا۔ دیکھیں شرعی اور قانونی لحاظ سے یہ حل بالکل جائز ہے'' ''کیا۔۔ میں اپنی بھابی جنکے پیروں کے اوپر سے میری نظریں نہیں اٹھتیں ان سے جعلسازی کے ارادے سے شادی کروں'' میں تقریباً فون پر چیخ پڑا اور میں نے غم و غصے میں فون پٹخ دیا۔

مگر میرے ذہن میں یہ سوال گردش کرتا رہا ''پانچ بج کر بیالیس منٹ'' کیوں؟ انہوں نے فون کے لئے اتنا عجیب وقت اس قدر حتمی طور پر کیوں دیا تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد اپنا غصہ ٹھنڈا ہونے کے بعد انہیں دوبارہ فون کیا ''محترم ایک بات اور بتا دیجئے ورنہ قبر تک مجھے اس معاملے میں تجسس رہیگا، آپ نے پانچ بج کر بیالیس منٹ کے بعد فون کرنے کو کیوں کہا تھا'' کہنے لگے ''آپ کو کیسے معلوم ہوتا آپ دین کی پابندی کہاں کرتے ہیں۔۔ ارے بھئی آج روزہ پانچ بجکر بیالیس پر کھلنا تھا اور میں منہ میں روزہ رکھ کر آپکے مسئلے کا حل نہیں بتا سکتا تھا۔''

☆

یہ ہماری زبان کا کمال ہے کہ ہم لوگوں نے ان جیسے لوگ بھی پیدا کئے۔ اُستاد بالکل اُمّی تھے۔ آخر آخر میں دستخط کرنا سیکھ گئے تھے۔ گاندھی گارڈن میں ان کی سائیکلوں کی دکان تھی۔ لوگوں کی غزلوں اور سائیکلوں کی مرمت کرتے تھے۔ یہ بوڑھے ہی پیدا ہوئے ہوں گے۔ جگت استاد تھے۔ دکان میں بڑی اور تگڑی کیلوں کی مدد سے دیواروں پر سائیکل کے پہیے، ہینڈل اور زنجیریں لٹکی رہتی تھیں۔ ایک طرف ایک چھوٹی سی کیل کچھ اس طرح موڑ کر ٹھونکی گئی تھی کہ کھونٹی بن گئی تھی۔ کام کرتے رہتے اور غزلیں کہتے رہتے۔ جب کوئی پڑھا لکھا گاہک یا پرستار دکان میں داخل ہوتا تو اُستاد گُنگناتے ہوئے اپنے اشعار کاغذ پر لکھوا کر اُسی کھونٹی پر ٹانگ دیتے۔ میں نے بھی ان کی کئی غزلیں لکھ کر اُس کھونٹی پر ٹانگی تھیں۔

ساقی فاروقی

(لندن)

بخشش

ڈاکٹر احسان احمد شیخ (اسلام آباد)

توے پر روٹی پلٹتے ہوئے سُکھیا کی نظر اپنے ہاتھ پر پڑی انگلیوں کے بیچ لمبی خراش کے ایک سرے پر خون کی ننھی سی بوند خشک ہو کر کلیجی کے رنگ کی ہو گئی تھی۔ آٹے کی خشکی سے خراش میں جلن اور خارش بھی ہو رہی تھی اُس نے تکلیف سے دھیان بٹانے کیلئے مُنّے کو آواز دی کہ روٹی کھالے۔

رات روٹی اور برتن سے فارغ ہو کر اُس نے مُنّے کو چائے کا پیالہ پکڑایا۔ وہ کتابیں، کاپیاں سمیٹ کر باہر چھپّر کے نیچے اپنی چارپائی پر چلا گیا تو سُکھیا نے آہستہ سے دروازہ بھیڑ کر اپنے ہاتھ پر ہلدی کا لیپ کیا اور بتّی بند کر کے اپنی کھٹیا پر جا لیٹی۔ آنکھیں بند کرتے ہی دوڑتی بھاگتی زندگی کا ہر مسئلہ اُس کے سر پر آن کھڑا ہوا۔ پہلے مجھے حل کرو۔ پہلے مجھے۔ نہیں پہلے مجھے۔ سُکھیا نے اپنا آپ بچاتے ہوئے دیوار کی طرف منہ کر کے کروٹ لے لی جیسے کبوتر بلّی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر آنکھیں موند لے۔ مگر ہر مصیبت ہر مسئلہ اُس کے سر پر ہتھوڑے مار رہا تھا۔ کھولی کا کرایہ پانچ مہینے سے نہیں دیا تھا۔ کریانے والے کا حساب ساڑھے نو سو روپے تک جا پہنچا تھا۔ دودھ والے کو اب چاچا کہہ کر بلاؤ تو آگے سے گالی نکالتا تھا اور پھر سب سے بڑھ کر مُنّے کے امتحان میں بیٹھنے کی فیس۔ میٹرک کا امتحان تھا۔ سُکھیا گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ چارپائی سے پیر لٹکا کر اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ آنکھیں بند کیں تو زندگی کے پچھلے دن ایک ایک کر کے سامنے آنے اور ناچتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے چھپنے لگے۔

سُکھیا نے اپنی زندگی میں اگر کوئی خوشی دیکھی تھی تو اُس دن جب مُنّا پیدا ہوا تھا۔ اُسے لگتا تھا اُس دن سے پہلے اس کی زندگی کے جو دس برس گزرے تھے اُن کا نہ کوئی مقصد تھا نہ مطلب۔ بس صبح اماں کی آواز۔ ''اُٹھ۔ کواڑ بند کر لے'' ساتھ ہی اماں باوا ہاتھوں میں جھاڑو لئے کوٹھری سے باہر چلے جاتے۔ وہ ادھ کھلی آنکھیں لئے لڑکھڑاتے قدموں سے چارپائی سے اُٹھتی اور سوکھے بالوں سے بھرا سر کھجاتی دروازے تک پہنچتی اور زنجیر چڑھا کر واپس ڈھیلی ڈھالی چارپائی پر جا کر پھر سے لیٹ جاتی اور لیٹتے ہی سو جاتی۔ اُس کی آنکھ جب کھلتی جب سورج کوٹھری کی چھت پر چڑھ کر ٹین کی چھت کے سوراخ سے عین اس کے چہرے پر دھوپ کی لکیر ڈال رہا ہوتا اور اس کا بدن پسینے سے بھیگا ہوا ہوتا۔

کوٹھری کے ساتھ ہی ذرا سی جگہ میں چولہا لگا تھا جس کے آس پاس چند برتن بھانڈے بے ترتیب پڑے ہوتے۔ وہیں دوسری طرف کونے میں ذرا سی منڈیر بنا کر باوا نے غسل خانہ بنا لیا تھا جہاں گھی کے خالی کنستر سے پانی لے کر دو چھپاکے اپنے منہ پر مار لیتی۔ اماں رات کی روٹی اور دال ایک تام چینی کی پلیٹ میں چھوڑ جاتی وہی اس کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا ہوتا۔ سارا دن وہ کوٹھری کے باہر رہتی کبھی لڑکیوں کے ساتھ چھپن چھپائی کبھی لونڈوں کے ساتھ گلی ڈنڈا۔ سارے اپنے ہی جیسے تھے وہ کوٹھری میں اس وقت آتی جب چھت کے سوراخ سے آتی دھوپ کی لکیر کا چھوٹا سا گولا اُس کی چارپائی سے چلتے چلتے فرش پر آ جاتا اور پھر کوٹھری کے ایک کونے سے سفر کرتا کرتا سامنے کی دیوار پر جا چڑھتا اور پھر چھت کی طرف جاتے جاتے سفید سے نارنگی جیسا ہو کر غائب ہو جاتا۔ بس اُسی وقت سُکھیا اندر آتی اور دیکھتے ہی دیکھتے اماں باوا سر پر آن موجود ہوتے۔

''تو کہیں باہر تو نہیں گئی تھی؟''

اماں یہ سوال کوٹھری کا دروازہ کھولتے ہوئے روزانہ ایسے تواتر سے پوچھتی جیسے علی بابا والی کہانی میں چوروں کا سردار کھُل جا سم سم کہہ کر خزانے کا دروازہ کھول رہا ہو۔

''میں نے کہاں جانا تھا؟''

سُکھیا نچلا ہونٹ اور نیچے لٹکا کر آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے روٹھی روٹھی آواز میں جواب دیتی اور ساتھ ہی اماں کے ہاتھ میں پکڑا اخبار میں لپٹا گولا پکڑ لیتی اور بغیر کسی توقف کے چولہے کے آگے رکھے لکڑی کے پیڑے پر جا بیٹھتی۔ پرانا اخبار کھولتے کھولتے ہی اسے اندازہ ہو جاتا کہ نان میں لپٹی پلیٹ میں سوکھی دال ہے یا پتلی والی دال اور بھُجیا۔ کھانا ختم کرتے ہی باوا چلم بھر کر کوٹھری کے باہر چھپّر کے نیچے پڑی چارپائی پر دراز ہو جاتا اور سُکھیا اماں کے ساتھ اپنی چارپائی پر۔

پھر یہ سارا کچھ اُس دن بالکل بدل گیا جب وہ اور باوا باہر چھپّر کے نیچے بیٹھے تھے اور اندر کوٹھری سے اماں کی چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ باوا کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سُکھیا کچھ سمجھ بھی رہی تھی اور کچھ نہیں بھی۔ پھر ایک دم اماں کی چیخیں بند ہو گئیں اور اندر سے ان دو عورتوں کی آوازیں آنے لگیں جو اماں کے ساتھ تھیں اور بغیر ایک دوسرے کی بات سُنے ایک ہی وقت میں بولے جا رہی تھیں۔ اُسی وقت ایک چھوٹے سے بچے کی بہت زور زور سے رونے کی آوازیں آئیں تو باوا جیسے چھلانگ لگا کر کھڑا ہو گیا اور ایسی تیزی سے دروازے کی طرف چلا جیسے ابھی کواڑ کھول کر کوٹھری کے اندر چلا جائے گا۔ سُکھیا بھی گھبرا کر کھڑی ہو گئی اُسے پوری بات کی سمجھ تو نہ تھی مگر اس کا دل کہتا تھا کہ اس وقت باوا کو اندر نہیں جانا چاہیے۔ وہ باوا کو آواز دے کر روکنے ہی لگی تھی کہ باوا خود ہی رُک گیا۔ اُس نے گردن موڑ کر سُکھیا کو ایسے دیکھا جیسے اس کی بیٹی نے اس کی چوری پکڑ لی ہو پھر سر جھکا کہ اپنی چارپائی پر آن بیٹھا۔ اُسی وقت دروازے کی زنجیر کا چھنا کا ہوا اور دروازہ کھول کر دائی اماں ہاتھوں میں کپڑے کا گولا سا لپیٹے باہر آئی اور سیدھی باوا کے سرھانے جا کھڑی ہوئی۔

یہ لے بھیّا۔ سنبھال اپنے بیٹے کو مگر زنانی کو اسپتال لے جانا ہوگا۔ حالت ٹھیک نہیں۔

سُکھیا نے دیکھا باوا کا کھچڑی داڑھی والا چہرہ رنگ بدل کر کالے سے سفید ہو گیا اُس نے بغیر کچھ کہنے سُنے اپنے ہاتھ میں پکڑا کپڑے کا گولا ایسی لا

پرواہی سے سُکھیا کو پکڑایا کہ اگر وہ ایک قدم بڑھا کر اُسے دونوں ہاتھ پھیلا کر سنبھال نہ لیتی تو اُس کا بھائی شاید زمین پر گر کر مر ہی جاتا۔ باوا بھاگ کر کوٹھری میں چلا گیا اور کپڑے کے بنڈل سے چیخ سی بلند ہوئی۔ سُکھیا گھبرا کر وہیں زمین پر بیٹھ گئی اُس نے ہمت کر کے روتے ہوئے بچے کے منہ سے کپڑا ہٹایا۔

''ہائے! کتنا چھوٹا ہے!'' سُکھیا نے دل ہی دل میں سوچا۔ اماں کا پیٹ کتنا بڑا تھا اور بچہ کتنا چھوٹا سا نکلا مگر وہ اس مسئلے پر زیادہ سوچ نہ سکی کیونکہ اُس کے بھائی نے پھر چیخنا شروع کر دیا تھا۔ بالکل انجانے میں سُکھیا کے دونوں بازو اوپر نیچے حرکت کرنے لگے جیسے بچے کو جھولا دے رہے ہوں اور بچہ چُپ بھی ہو گیا۔

وہ دن سُکھیا کی زندگی میں ایسا چڑھا کہ آج پندرہ سال گزرنے پر بھی اس کے دن رات پہلے جیسے نہ رہے تھے۔ امّاں تو بچہ پیدا کر کے دنیا سے ہی فارغ ہو گئی۔ باوا جو پہلے ہی کم منہ کھولتا تھا اب بالکل ہی گم سم ہو گیا۔ اس کے دن رات کے معمولات میں بس یہ فرق آیا کہ اب شام کو کوٹھری میں گھُس کر اپنی بیوی کی جگہ اخبار میں لپٹا کھانے کا بنڈل وہ سُکھیا کو پکڑانے لگا۔ ہاں! اب کھانے کے ساتھ دودھ کا اضافہ ہو گیا تھا۔

دس سال کی سُکھیا جوان ہونے اور بیاہے جانے سے پہلے ہی جیسے ماں بن گئی۔ صبح اندھیرا چھٹنے سے پہلے ہی مُنّے کی چیخ اسے جھنجوڑ ڈالتی۔ ٹین کے ڈبّے میں تھوڑا دودھ تھوڑا پانی ملا کر ہلکا سا گرم کرتی اور بوتل منہ سے لگا کر مُنّے کو ہلکارے دیتی تو وہ اس کے سینے سے لگ کر بوتل ختم ہونے سے پہلے ہی سو جاتا۔ سارا دن دودھ کا حساب رکھنا ہوتا تھا کہ شام باوا کے آنے سے پہلے ہی نہ ختم ہو جائے۔ ساتھ پانی ملانے کا حساب کہ زیادہ مل جائے تو مُنّا وقت سے پہلے شور مچا دیتا اور کم مل جائے تو گُو موت کا کام جو پہلے ہی سُکھیا کو زہر لگتا تھا اور بڑھ جاتا تھا۔ مُنّا سارا سارا دن سوتا اور وہ اس کے سرہانے بیٹھی اس کے منہ سے مکھیاں اڑاتی اور پنکھا جھلتی رہتی۔

آہستہ آہستہ سارے سُکھی ساتھی دوست سہیلیاں چھوٹتے گئے کوٹھری سے نکلتی تو سہیلیاں ہوتیں۔ دوست چھوٹے تو سارے دن کا ہنسی ٹھٹّا بھی چھٹ گیا۔ سُکھیا تو جانو ایک ہی دن میں بچپن کی منڈیر پھلانگ کر اُس پار ہو گئی۔ بدن تو بچی کا ہی رہا۔ دماغ پکّا ہو گیا۔ اکثر جب باوا کے شام گھر پلٹنے میں دیر ہو جاتی اور دودھ ختم ہو جاتا تو مُنّا گلا پھاڑ پھاڑ کر ایسے روتا جیسے بچھوڑ گیا ہو۔ ایسے میں جب سُکھیا چھوٹی سی کوٹھری میں مُنّا کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹے چھاتی سے چمٹائے اِدھر سے اُدھر ٹہل رہی ہوتی تو جانے کیوں اسے لگتا مُنّا اس کا بھائی نہیں اُس کا بیٹا ہے۔ اُس کا دل کرتا کہ جیسے بھی ہو وہ اپنے ننھے سے بھائی کو کسی طرح کہیں سے دودھ لا کر چُپ کرا دے۔ کبھی کبھی تو اس کا دل کرتا کہ اُس کی چھاتیاں امّاں کی چھاتیوں کی جیسی ہو جائیں اور وہ اپنے ننّھے، منّے سے بھائی کو اپنا ہی دودھ پلا کر چپ کر ادے۔ پھر وہ خود ہی گردن جھٹک کر اس خیال کو دل سے نکال دیتی۔

دن رات اسی طرح ایک ہی ڈھرّے پر چلتے رہے۔ مُنّا سہارے سے بیٹھنے پھر کھڑا ہونے لگا۔ جس دن مُنّے نے سُکھیا کا ہاتھ پکڑ کر پہلا قدم اُٹھایا سُکھیا کو احساس ہوا کہ اُس کے بھائی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ خود اس کے بدن میں بھی تبدیلیاں آ رہی ہیں کچھ باتیں تو ایسی تھیں جنہیں وہ کسی سے پوچھنا چاہتی تھی مگر یہاں بتانے والا کون تھا؟ باوا کے رات دن جھاڑو، چلم اور کھٹیا تک سکڑ کر رہ گئے تھے۔ نہ جانے کیسے مگر آہستہ آہستہ سُکھیا کے بدن اور ذہن کی گتھیاں اُس نے خود ہی سلجھانا سیکھ لیں۔

ایک رات سُکھیا کھانا گرم کر رہی تھی تو مُنّا گھٹنے گھسیٹتے گھسیٹتے اس کے پاس آ گیا اور پھر زمین پر پڑے پرانے اخبار کو اٹھا کر منہ میں ڈالنے لگا۔ سُکھیا نے منع کیا تو وہ اخبار کا ٹکڑا منہ سے نکال کر اپنے منہ کے آگے ایسے کر کے بیٹھ گیا جیسے اخبار پڑھ رہا ہو۔ سُکھیا کو ہنسی آ گئی۔

''باوا۔ باوا۔ دیکھ مُنّا اخبار پڑھ رہا ہے۔''

نہ ہوں نہ ہاں۔ باوا نے تو شاید اس کی آواز سنی ہی نہیں مگر اُس رات جب سُکھیا اپنی چارپائی پر مُنّے کو لے کر سونے کے لئے لیٹی تو اس کے دل میں ایک عجیب سا خیال آیا۔ جب اُس کا بھائی تھوڑا بڑا ہو جائے تو کیوں نہ وہ اُسے اسکول میں بھرتی کرا دے۔ یہ خیال آتے ہی جیسے اسے بجلی کا جھٹکا سا لگا اور وہ چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ٹھیک تو ہے اس کا پیارا بھائی اپنے ماں باپ کی طرح کیوں ساری عمر جھاڑو پوچا کرے۔ وہ اسے پڑھائے گی، لکھائے گی بہت بڑا آدمی نہ بنا' میونسپلٹی کا بابو ہی بن جائے گا۔ اس رات اسے ٹھیک سے نیند بھی نہ آئی۔ صبح اٹھتے ہی اس نے باوا کو آن لیا۔

''مُنّے خراب ہے تیرا''

''کیوں باوا؟''

''پڑھائی لکھائی کے پیسے تیرا باپ دے گا؟''

''تو میں کون سا کہتی ہوں بڑے اسکول میں پڑھے۔ مدرسے میں پڑھ لے پھر گورنمنٹ کے اسکول میں پڑھ لے گا''

مُنّا اُدھر پانچ سال کا ہوا نہیں کہ سُکھیا نے اسے بستی کے مدرسے میں جا بٹھایا۔ پہلے تو خود سارا وقت باہر مدرسے کے دروازے پر بیٹھی رہتی چھٹی ہوتی تو مُنّے کا ہاتھ پکڑ کر گھر لاتی پھر اُس نے سڑک پر آنے جانے والوں کی نظریں اپنے بدن پر رینگتی محسوس کیں تو باہر بیٹھنا چھوڑ دیا۔ صبح مدرسے چھوڑ آتی چھٹی کے وقت لے آتی۔

مُنّا چھٹی کلاس پاس کر کے ساتویں میں پہنچا تو باوا نے کھٹیا پکڑ لی۔ پچیس برس سے چلم کا جو دھواں وہ سُوں سُوں کر کے اپنے اندر اتار رہا تھا اب بلغم اور خون بن کے منہ سے باہر آنے لگا۔ گھر میں پہلے ہی کون سا دھن دبا ہوا تھا۔ باوا کے پیر چارپائی سے لگتے ہی سُکھیا کے قدم گھر کی چوکھٹ سے باہر آ گئے۔ اُس نے امّاں باوا کے ہاتھ سے چھوٹی جھاڑو تو نہیں اٹھائی کہ اس طرح مُنّے کے بڑے ہونے اور بابو بننے کے بعد اُس کی بدنامی ہوتی۔ چھوٹی موٹی مزدوری شروع کر دی۔ اب مُنّا خود ہی اسکول چلا جاتا اور آ جاتا تھا۔ سُکھیا روز صبح اٹھ کر

کتنی ہی دور پیدل چل کر شہر کے اس حصے میں جاتی جہاں روز ہی کوئی نہ کوئی نئی بلڈنگ، نیا مکان، نئی کوٹھی بن رہی ہوتی۔ سارا دن مزدوری کر کے شام کو لوٹتے ہوئے ٹاٹ والے ہوٹل سے روٹی سالن لے لیتی۔ خدا بھلا کرے امّاں کا۔ گھر میں کھانا پکانے کی ریت ہی نہیں تھی ورنہ یہ مصیبت بھی اس کے پلّے پڑتی۔

باوا چارپائی سے ایسا لگا کہ سال بھر بعد ہی اٹھا وہ بھی ایسے کہ کچّی بستی والے اُسے چارپائی پر ہی اٹھا کر گھر سے باہر لے گئے۔ باوا کے مرنے کے بعد مُنّے نے کتنی ہی بار کہا کہ اب وہ بھی پڑھنا چھوڑ کر مزدوری کرے گا مگر سُکھیا ہر بار اُسے گلے سے لگا کر چپ کر دیتی۔

''اپنے ہاتھ دیکھے ہیں تُو نے؟ کیسے نرم نرم ہیں۔ ان سے مزدوری کرے گا؟''

مُنّا شرمندہ ہو کر بہن سے ہاتھ چھڑا لیتا۔

''تُو دسویں پاس کر لے۔ پھر بابو بن کر نوکری کرنا''

باوا کے جانے کے بعد اور کچھ بدلا نہ بدلا ہو خود سُکھیا کے اندر اتنا کچھ بدل گیا کہ اسے اپنے آپ سے گھبراہٹ ہونے لگی۔ اُس نے مُنّے کو ایک ایک پل بڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ پندرہ سال لگے تھے اُسے کپڑے میں لپٹے گوشت کے لوتھڑے سے جوانی میں قدم رکھتے ہوئے مگر اب پچھلے کچھ مہینوں سے سُکھیا کو لگتا تھا اُس کا اپنا بدن کپڑے پھاڑ کر باہر آ جائے گا۔ مزدوری کرنا روز بروز مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ جھک کر گارے کا تھال اٹھانے لگتی تو دوسرے مزدوروں کی آنکھیں اُس کی کمر میں تیر کی طرح لگتیں۔ آگ میں بجھے ہوئے تیر۔ تھال اٹھا کر سر پر رکھتی تو انگیا کے سامنے اٹکا ہوا کپڑا پھسل کر نیچے گر جاتا۔ تھال سر پر رکھ کر سیڑھی چڑھنے لگتی تو ٹھیکیدار بہانے بہانے سے سیڑھی کے ساتھ آ کھڑا ہوتا۔ ٹھیکیدار کتنی ہی بار اُسے باتوں باتوں میں امیر بنانے کی پیشکش کر چکا تھا۔ سُکھیا کے جھڑکنے کے باوجود اُس کی ہمت بڑھتی جا رہی تھی۔ آج جب وہ ٹھیکیدار کے کمرے میں دِھاڑی لینے گئی تو ٹھیکیدار نے اسے پکڑنے کی کوشش کی اور ٹھیکیدار سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے سُکھیا کو خراش آ گئی۔

کھڑ، کھڑ، کھڑ۔

کوئی دروازے کی زنجیر بجا رہا تھا۔ سُکھیا کے خیالات کا سلسلہ بھک سے اڑ گیا۔ وہ تیزی سے اپنی دنیا میں واپس آ گئی۔

''کون ہے؟''

''دیدی میں ہوں''

سُکھیا نے بھاگ کر کنڈی کھول دی۔

''مُنّے۔ کیا بات ہے، تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں، ہاں میری طبیعت ٹھیک ہے۔ میں تجھے یاد دلانا بھول گیا تھا۔ اب پڑھائی ختم کر کے سونے جا رہا تھا تو یاد آیا۔''

''کیا یاد آیا؟''

''دیدی! تجھے بھول گیا۔ میرے امتحان کی فیس نہیں گئی ہے اب تو لیٹ فیس کی آخری تاریخ میں بھی چار دن رہ گئے ہیں۔''

''ہاں، ہاں۔ مجھے یاد ہے تو فکر نہ کر۔''

سُکھیا نے مُنّے سے آنکھیں بچاتے ہوئے کہا۔ اسے شرمندگی ہو رہی تھی اگر مُنّا دسویں کے امتحان میں نہ بیٹھ سکا تو میں اُسے کیا منہ دکھاؤں گی؟

''اور ہاں!'' مُنّا پھر بولا۔ ''تو مزدوری کو گئی تھی تو کوٹھری کا مالک آیا تھا جگہ خالی کرانے کا کہہ گیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ سب ہو جائے گا۔ تُو بس اپنی پڑھائی کی فکر کر۔'' مُنّا سر جھکا کر پلٹ گیا اور جا کر چھپّر کے نیچے چارپائی پر لیٹ گیا۔ سُکھیا نے آہستہ سے کواڑ بند کئے اور پھر اپنی کھاٹ پر آ رہی۔ کوٹھری کا کرایہ، دودھ والے کا حساب، ٹاٹ والے ہوٹل کا اُدھار اور کریانے والے کے صابن تیل منجن کے پیسے اور سب سے بڑھ کر مُنّے کے امتحان کی فیس موٹا موٹا بھی حساب لگاؤ تو پانچ ہزار کا ادھار بنتا تھا۔ کوٹھری والا جگہ خالی کرنے کا کہہ گیا ہے۔ دکان دار نے گلی سے گزرنا مشکل کر رکھا تھا۔ ہَیر پھیر کے سُکھیا کو اس کا ایک ہی حل نظر آتا تھا وہ بات جس کو وہ ہر بار اپنے ذہن میں جھٹک کر نکال پھینکتی تھی مگر اب وہ شاید ایسا نہ کر سکے کہ مُنّے کی پوری زندگی کا سوال تھا اور خود سُکھیا کی پچھلے پندرہ سال کی محنت داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ کیا مُنّا دسویں کا امتحان نہ دے سکے گا؟ کیا مُنّے کی قسمت میں وہی جھاڑو یا پھر اینٹ گارے کی مزدوری لکھی ہے؟ مُنّا جو اس بھری پُری دنیا میں اُس نے اپنے ہاتھوں میں پَل پَل بڑا ہوتا دیکھا ہے، جس کو اپنی بانہوں میں لے کر اُس کی ممتا اس وقت جاگ پڑی تھی جب وہ خود ابھی محض دس سال کی بچّی تھی۔ سُکھیا ساری رات اپنی کھرّی چارپائی پر بن جل مچھلی کی طرح تڑپتی رہی۔ آنکھیں بند کرتی تو مُنّا، ٹھیکیدار، جھاڑو، پوچا، اینٹ، گارہ سب گڈمڈ ہو جاتے اور وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی۔ صبح پڑوس کے مرغے نے بانگ دی تو وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

اُس دن جب سارے دن کی محنت کے بعد مزدور ٹھیکیدار کے مُنشی کے کچّے کمرے میں جا جا کر مزدوری لینے لگے تو سُکھیا نئی کھڑی ہونے والی بلڈنگ کے زینوں کے نیچے جا بیٹھی اور وہاں سے مُنشی کے کمرے کی طرف دیکھتی رہی جب سارے مزدور جا چکے اور سورج لال پیلا ہوتا اپنی آخری چھب دکھا کر چھُپ گیا تو شام کے جھٹ پٹے میں وہ بلڈنگ سے نکلی اور مُنشی کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

''آؤ۔ آؤ سُکھیا۔ کہاں رہ گئی تھیں؟''

ٹھیکیدار نے اپنی بھدّی آواز میں پوچھا۔

سُکھیا چپ رہی اور چل کر مُنشی کی میز کے پاس آ کر رک گئی۔ یہ عارضی کمرہ بلڈنگ کے احاطے میں ٹھیکیدار کا مال رکھنے کے لئے بنایا گیا تھا جس کے ایک کونے میں مُنشی نے اپنی میز کرسی اور چارپائی لگا رکھی تھی۔ مُنشی نے دِھاڑی کے پیسے سُکھیا کو دینے چاہے تو ٹھیکیدار نے ہاتھ آگے بڑھا کر اُس سے لے لئے اور خود سُکھیا کی طرف بڑھائے سُکھیا نے نوٹ پکڑے تو ٹھیکیدار نے اس کا ہاتھ

آہستہ سے دبایا۔ سُکھیا نے نظریں نیچی کئے اپنا نچلا ہونٹ دبالیا۔ مُنشی خاموشی سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل کر آہستہ سے دروازہ بند کر دیا۔ سُکھیا اسی طرح سر جھکائے کھڑی رہی۔ ٹھیکیدار نے آہستہ سے کرسی پیچھے سرکائی اور اٹھ کر سُکھیا کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اس کے دونوں کاندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ سُکھیا ابھی بھی سر جھکائے زمین پر نظریں گاڑے کھڑی تھی۔ ٹھیکیدار نے آہستہ سے اُس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی۔

''پہلے۔۔۔۔پیسے دے''

سُکھیا نے کانپتی ہوئی آواز میں مشکل سے اپنا مطلب ادا کیا۔

سُکھیا کو اپنی ہمت پر خود بھی تعجب ہو رہا تھا۔

ٹھیکیدار نے مسکراتے ہوئے قمیض کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو کا نوٹ نکال کر سُکھیا کے چہرے کے سامنے ہلایا۔

سُکھیا جھٹکے سے ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''کیوں۔۔۔۔کیا ہوا؟''

ٹھیکیدار نے حیرت سے پوچھا۔

''تُو تُو۔۔۔۔تُو تو کہتا تھا بہت پیسے دے گا۔۔۔۔دو ہجار روپے دے گا۔''

''ہاں۔ ہاں تو دو ہزار روپے دے چکا ہوں۔ دماغ خراب ہے تیرا۔''

ٹھیکیدار۔ غصے سے چلّایا اور سُکھیا کا ہاتھ پکڑنے کیلئے اس نے ہاتھ بڑھایا۔ سُکھیا اور پیچھے ہٹ گئی اور اُس نے بھی اسی تیزی سے چلّا کر کہا۔

''کس کو دیئے ہیں دو ہجار روپے۔۔۔۔یہ۔۔۔۔یہ تو سو روپے ہیں''

اتنی بھولی نہ بن، حرام زادی!''تیرے بھڑوے کو دیئے ہیں پورے دو ہزار۔'' ٹھیکیدار پھر دھاڑا۔

''یہ سو روپے تو تیری بخشش ہے''

''کون بھڑوا؟ بکواس کرتا ہے تُو''۔ سُکھیا برابر کی اونچی آواز میں چیخی۔

''تیرا بھائی بُنّا اور کون؟ پورے دو ہزار لئے ہیں اُس نے۔''

ٹھیکیدار نے گرجدار آواز میں چلّا کر کہا۔

''تیرا کیا خیال ہے! میں مفت میں تیرے پیچھے لگا ہوا ہوں۔''

سُکھیا کے کانوں میں آوازیں آنا بند ہو گئیں اس کے کان شائیں شائیں کرنے لگے کمرے میں رکھی سیمنٹ کی بوریاں، لکڑی کے تختے، مُنشی کی میز کرسی اور چارپائی سب ایک دوسرے کے پیچھے گول گول چکر میں بھاگنے لگے۔ اُس نے اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کیلئے جھک کر چارپائی کی پٹّی اپنے ٹھنڈے ٹھار ہاتھوں میں پکڑی تو سو روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین آ رہا۔ ٹھیکیدار نے مسکراتے ہوئے جھک کر اپنی دی ہوئی بخشش کا نوٹ اٹھا کر جیب میں واپس رکھ لیا اور مڑ کر دروازے کی چٹخنی اوپر چڑھا دی۔

بقیہ
چھت سے گرنے والی

اپنا وقت بسر کر گئی۔۔۔۔آگے اس جھاڑ کے نیچے۔۔۔مٹی اوڑھے۔''

درویش کے الفاظ نے میرے پیروں کو متحرک کر دیا اور میرا بدن اپنے آپ ہی ادھر بڑھا جدھر درویش نے اشارہ کیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھ سے قدرے فاصلہ رکھ کر وہ سب میرے پیچھے آ رہے تھے۔

اس نئی بنی ہوئی لحد پر پھول بھی تھے۔''ہسپتال کی انتظامیہ کی ہدایات میں قبر پر پھول ڈالنا بھی شامل ہوگا۔''میں نے سوچا۔ میرے اندر سے یقین کی ایک لہر اٹھی اور میرے ذہن کے صفِ اوّل میں پہنچ کر رک گئی۔ میں اس نئی بنائی ہوئی، مٹی کی کچّی قبر کی پائنتی کھڑا ہو گیا اور بولا۔''تم ہی ہونا۔ تم نے مذہب کی بنیاد پر شادی کی درخواست (Proposal) ٹھکرا دی تھی۔ یاد ہے نا۔ میں نے تمہیں راضی کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ میں نے تم سے وعدہ بھی کیا تھا کہ تمہیں مذہب تبدیل کرنے کے لئے کبھی مجبور نہیں کروں گا لیکن تم نے ہر مرتبہ ہنسی میں ٹال دیا تھا۔ میں نے بچوں کو مذہب اختیار کرنے کی آزادی دینے کا بھی وعدہ کیا تھا لیکن تم نہیں مانیں اور ہنستی رہیں۔ دیکھو۔ اب تم میرے مذہب کے طریقے پر دفن ہوئی ہو۔ دیکھ رہی ہو۔''

''دیکھ رہی ہوں۔ لیکن میں میری ہوں اپنے مذہب پر اور اس سے بھی ہنس رہی ہوں۔'' وہ بولی۔ میں نے دیکھا اور میرے سامنے کھڑی ہنس رہی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میرے پیچھے آنے والوں کا کہیں بھی پتہ نہیں تھا۔ مجاور نما آدمی۔ اس کے دونوں لڑکے غائب ہو گئے تھے البتہ وقت شاہ فقیر کا پرچھاواں سا کھڑا تھا اور آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔

پیچھے بہت پیچھے ماورائی افق پر۔ وقت کی سُرنگ سے خلق برآمد ہوتی جا رہی تھی۔ وقت کی سُرنگ میں خلق داخل ہو کر نظروں سے غائب ہو جا رہی تھی۔ ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری تھا۔ برآمد ہونے کا اور غائب ہونے کا۔ وہ ہنسے جا رہی تھی اور اس کا انگ انگ، رُواں رُواں ہنس رہا تھا۔ یہ اس کے ہنسنے کا انداز تھا۔

میں اس کے ساتھ قدم بہ قدم چل رہا تھا۔ سُرنگ کے داخلی راستے کی جانب۔ آہستہ آہستہ۔۔آہستہ آہستہ۔۔۔!!

☆

''خواہشوں کا انبار''

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

پھول کا کھلنا بہت دشوار ہے — موسمِ گل ان دنوں بیمار ہے
بے وسیلہ بات بن سکتی نہیں — مل گئی کشتی تو دریا پار ہے
آنسوؤں کا اور مطلب کچھ نہیں — مختصر سی صورتِ اظہار ہے
لے گئی ہے دور کوئے یار سے — دشمنِ جان وقت کی رفتار ہے
دوستی کا راز افشا کر گئی — دشمنی بھی اِک بڑا کردار ہے
دل کا کچھ ہم کو پتا چلتا نہیں — خواہشوں کا اس قدر انبار ہے
ہم سفینے کے لیے ایک بوجھ ہیں — ہم اگر ڈوبے تو بیڑا پار ہے
زندگی کی رزم گاہوں میں زہیر — سرفروشی آخری تہوار ہے

ڈاکٹر جواز جعفری (لاہور)

ہمارے گھر میں کسی کو بھی یہ گمان نہیں تھا — کہ کٹ رہی تھی جہاں عمر میں وہاں نہیں تھا
مرے شریکِ سفر کو بھی یہ خبر نہ ہوئی — میں چل رہا تھا' مرا دل رواں دواں نہیں تھا
تمام عمر جو اندر کے رُخ پہ تازہ رہا — وہ ایک زخم کسی آنکھ پر عیاں نہیں تھا
لگا رہا تھا وہ جس خاکِ بے ثمر میں مجھے — وہ میری آب وہوا میرا خاکداں نہیں تھا
تمام عمر مری ہڈیاں جلاتی رہی — اک ایسی آگ کہ جس کا کوئی دھواں نہیں تھا
جو چلنا چاہا تو پیروں تلے زمیں نہیں تھی — جو اڑنا چاہا مرے سر پہ آسماں نہیں تھا
کب اس چمن میں ہوئی سرخرو بہار کی رُت — کب اس چمن میں گلِ موسمِ خزاں نہیں تھا
تمام ہوگئی جب عمر رائیگاں تو کھُلا — جواز جعفری یہ تو میرا جہاں نہیں تھا

رؤف خیر (حیدرآباد دکن)

بے عیب اب کسی کی غزل تو نہیں کوئی — میری غزل بھی تاج محل تو نہیں کوئی
نیت میں کھوٹ سر میں خلل تو نہیں کوئی — وہ حیلہ جوے جنگ وجدل تو نہیں کوئی
دنیا تمام یوں تو بڑی مہربان ہے — تیری عنایتوں کا بدل تو نہیں کوئی
میری گذر بسر ہے دلیل و جواز پر — اس رہ گزر میں لیت ولعل تو نہیں کوئی
اوروں کو مارنے کے لیے مر رہا ہے وہ — اس کے دماغ کا یہ خلل تو نہیں کوئی
تو نے تو زیر کرنے ہیں دریا پہاڑ دشت — اب چیونٹی غریب مسل تو نہیں کوئی
کیسی عمارتیں تھیں جو ڈھانچے میں ڈھل گئیں — کردار اس میں میں نذرِ اجل تو نہیں کوئی
مظلوم ہو رہے ہیں تو ہوتے رہیں شہید — یہ دیکھنا ہے ردعمل تو نہیں کوئی
اہلِ قلم ہیں خیر سے نایاب آج بھی — ہو گا رؤف خیر سا کل تو نہیں کوئی

صدیق شاہد (شیخوپورہ)

شعلہ دیکھوں تو شرر لگتا ہے — دیکھوں دیوار تو در لگتا ہے
جابسے سبز جزیروں میں طیور — کتنا ویران شجر لگتا ہے!
حرفِ ارمان تو بے کار گیا — کارگر دیدۂ تر لگتا ہے!
ایک مدت سے درختِ دل کو — نامرادی کا ثمر لگتا ہے!
ایک دو گام ہوس کی منزل — عشق صدیوں کا سفر لگتا ہے
سر جھکانے کی بھی حد ہے کوئی — اب تو دہلیز کو سر لگتا ہے
ہے ذرا سعیٔ تقرب درکار — اب بھی سرخاب کا پر لگتا ہے
دیکھنا ایک جھپک سے اس کا — مجھ کو تجدید نظر لگتا ہے
شعر تر ہے وہی شاہد جس میں — تول کر حرفِ ہنر لگتا ہے

○

سہیل اختر (بہاولپور)

تکلفات کے پردے ہٹائے گا کہ نہیں — وہ میری بزمِ محبت میں آئے گا کہ نہیں
طلب کی راہ کے واماندہ راہرو کے لیے — کبھی وہ دستِ محبت بڑھائے گا کہ نہیں
مری حیات کی تاریک رہگزاروں میں — زمانہ پیار کے دیپک جلائے گا کہ نہیں
ترے لبوں پہ چٹک کر کوئی حسیں غنچہ — نشاطِ قرب کا مژدہ سنائے گا کہ نہیں
مرے لیے تری ان خوابناک پلکوں پر — کوئی ستارہ کبھی جھلملائے گا کہ نہیں

○

شگفتہ نازلی (لاہور)

گھومے پھرے جہاں جہاں' آوارگی تو ہے — ہو ماورأ زماں مکاں ، آوارگی تو ہے
دل کو لبھانے والے ہر منظر کا تھا سحر — رکتے رہے یہاں وہاں' آوارگی تو ہے
اس کی تلاش میں کئی رستے بدل گئے — چلتے رہے کہاں کہاں' آوارگی تو ہے
یوں تو کبھی وہ بھولے سے بھی پوچھتے کہاں — ملتے رہے پہ مہرباں' آوارگی تو ہے
کوئی بچھڑ گیا تو کوئی ساتھ بھی رہا — چلتا رہا تھا کارواں' آوارگی تو ہے
ویران راستوں سے تھی آتی رہی صدا — مڑتے مگر بھلا کہاں' آوارگی تو ہے
گزرے ہوئے زمانے کی لگتے تھے یادگار — پیڑوں پہ نام تھے نہاں' آوارگی تو ہے
کتنے ہی رنگ معنی کے اُس میں نکھر گئے — گل ہو کے بھی جو گلستاں' آوارگی تو ہے
اُس کی رہی ہے سوچ اپنے عصر سے جُڑی — ہو کے مکاں میں لامکاں' آوارگی تو ہے
کوئی بھی اُس کے دور میں سمجھا نہیں اُسے — انساں تھا یا کہ چیتاں' آوارگی تو ہے!!

سہیل غازی پوری (کراچی)

جس غزل میں علامتیں ہیں بہت — اس میں شامل ریاضتیں ہیں بہت
خود کو روکا یہ بارہا کہہ کر!! — آئینے میں صداقتیں ہیں بہت
میرے مولا! تو ہی بچائے گا — آنے والی قیامتیں ہیں بہت
ہجر' اشک وانا' شکستہ دلی — شہرِ جاں کی روایتیں ہیں بہت
خاروگُل ہیں تو لازم وملزوم — ان میں لیکن رقابتیں ہیں بہت
جس کو لوگوں نے اعتبار دیا — اُس کے لب پر شکایتیں ہیں بہت
توڑ کر جوڑنا کوئی شیشہ!! — اس ہنر میں نزاکتیں ہیں بہت
تجھ سے کیا رابطہ رکھے کوئی — تیرے دل میں عداوتیں ہیں بہت
تیری غزلوں میں دیکھتا ہوں سہیلؔ — جھوٹی سچّی حکایتیں ہیں بہت

O

ڈاکٹر انیس الرحمٰن (سکھر)

اپنے وعدے سے وہ اک روز مکر جائے گا — حادثہ یہ بھی بہرحال گزر جائے گا
ہم کو خوابوں کے حسیں شہر میں رہ جانے دو — آنکھ کھولی تو یہ منظر بھی بکھر جائے گا
تیرا دیوانہ ترے شہر سے ناواقف ہے — تیرے کوچے سے جو نکلا تو کدھر جائے گا
داغ رہ جائے گا اس دل پہ شناسائی کا — زخم تو زخم ہے' کچھ روز میں بھر جائے گا
بزمِ رنگیں میں وہ اک سادہ ومعصوم سا شخص — کیا خبر تھی کہ مرے دل میں اتر جائے گا

O

عرش صہبائی (جموں' کشمیر)

جنون وعقل میں تکرار ہوتی رہتی ہے — یہ بات باعثِ آزار ہوتی رہتی ہے
میں ان سے برسَرِ پیکار ہوتا رہتا ہوں — مصیبتوں کی بھی یلغار ہوتی رہتی ہے
کوئی بھی آرزو ہو دل کی تجربہ ہے مرا — حدود ضبط سے وہ پار ہوتی رہتی ہے
نہیں ضروری میں ہر بات کو قبول کروں — خفا سی کس لئے سرکار ہوتی رہتی ہے
سکون دل کا بکھرتا ہے اک دھواں بن کر — نظر کس کی شرربار ہوتی رہتی ہے
ہزار مسئلے ہوں مسکراتا رہتا ہوں — کہ مجھ سے یہ خطا ہر بار ہوتی رہتی ہے
زباں کرے نہ کرے دل کے راز کو افشا — نگاہ مائلِ اظہار ہوتی رہتی ہے
جہاں ہوں مشکلیں آسانیاں بھی ہوتی ہیں — کوئی بھی راہ ہو ہموار ہوتی رہتی ہے
تری ادائیں بھی کچھ دل کو گدگداتی ہیں — مری نظر بھی گنہہ گار ہوتی رہتی ہے
حیات باطل وحق کا ہے معرکہ اے عرشؔ — کہ اس میں جیت کبھی ہار ہوتی رہتی ہے

حفیظ انجم کریم نگری (کریم نگر، بھارت)

نئی تہذیب کا یہ تنگ داماں کون دیکھے گا!
جہاں شہرہ ہو شیطانوں کا انسان کون دیکھے گا!

یہ دنیا گو سمندر کی تہوں کو بھی کھنگالی ہے
ہمارے زخم کے گوہر نمایاں کون دیکھے گا!!

محافظ بھی مخالف ہے، مخالف تو مخالف ہے
ہمیں آخر ستاروں میں درخشاں کون دیکھے گا

جہاں ہر فرد کی آنکھوں پہ عینک ہو تعصّب کی
ہمارے سرخ خوں کی بہتی ندیاں کون دیکھے گا!

ستم کے باندٹوٹے ہیں غموں کی باڑ آئی ہے
ہماری زندگی ہے کتنی ویراں کون دیکھے گا

گھروں میں سب مقفّل ہیں اندھیری رات ہے میں ہوں
کُہر آلود منظر ہے، بیاباں کون دیکھے گا

اگر جینا ہے دنیا میں تو جی لے چار دن ہنسکر!
ترا رونا یہاں اے چشمِ گریاں کون دیکھے گا

یہ اک ایسی حقیقت ہے جو سب تسلیم کرتے ہیں
یہ سب خوشیوں کے ساتھی ہیں غمِ جاں کون دیکھے گا

تم اپنی سوچ کا معیار انجم کچھ بدل ڈالو!!
مرے تخیل کی شمعِ فروزاں کون دیکھے گا

○

نوید سروش (میرپورخاص)

لوگ خاموش ہیں عالم ہے پریشانی کا
کس سے پوچھوں میں سبب گاؤں کی ویرانی کا

کس طرح جلتا رہا تیز ہواؤں میں چراغ
اہلِ دل کے لیے منظر نہیں حیرانی کا

اب نہ سنتے ہیں یہ بچّے یہ سمجھتے ہیں اسے
کیوں کہ قصّہ یہ پرانا ہے کسی رانی کا

اب نہ باتوں میں شرافت، نہ وہ تہذیب رہی
پاندان اب ہے ثقافت میں فقط نانی کا

بھرے گھر چھوڑ کے آئے تھے اک آواز پہ ہم
ایک عالم ہے عجب بے سروسامانی کا

لڑکی، سڑکوں پہ جو پھرتی نظر آتی ہے سروش
کوئی دیوانہ تھا اس شہر میں دیوانی کا

○

سمیع نوید (میانوالی)

کہتا ہے مجھ سے عشق میں پردہ کہیں نہیں
وہ جس کی پاک ذات کا چہرہ کہیں نہیں

مانو تو اس کے حسن کی خوشبو ہے ہر جگہ
دیکھو تو اس کے روپ کا جلوہ کہیں نہیں

سوچو تو ہر گلی میں ہیں عابد بسے ہوئے
سمجھو تو شہریار میں کعبہ کہیں نہیں

میرے ہر اک قیام میں سجدے کئی ہزار
سالک کی اک نماز کہ سجدہ کہیں نہیں

میری بساط فکر پہ مجھ کو ہی مات ہے
مجھ میں بھی میری چال کا حربہ کہیں نہیں

جانے میں اس کی قید میں بیٹھا ہوں کیوں نوید
اب تو کسی بھی راہ پہ پہرہ کہیں نہیں

○

''فلم باقی ہے ابھی''

گلزار جاوید (راولپنڈی)

یہ بات سمجھنے سے وہ ہمیشہ قاصر رہا کہ جب بھی اُس کی زبان سے مدِّ مقابل کے لیے الفاظِ ستائش ادا ہوتے ہیں تو احباب کی اکثریت' کاندھوں پر اٹھا کر اُس کے قد کو اونچا کرنے کی کوشش میں بے جا لفاظی کیوں کیا کرتے ہیں۔ شاید! اس میں قصور اُس کا اپنا ہے۔ وہ اپنی بات کو لوگوں تک پہنچانے کے فن سے آشنا ہوتا تو اُس کے اندر چھپے حسد اور بغض سے لوگ باگ ضرور آگاہ ہوتے جو وہ گاہے بگاہے تعریفی جملوں میں لپیٹ کر اپنے دل کی بھڑاس اکثر نکالا کرتا ہے۔ میرے خیال میں بغض کی جگہ حسد اور جلن کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ لفظ بغض کے باعث بات کا ایک بار پھر سے غلط رخ پر جانے کا اندیشہ ہے۔

قبل اس کے آپ دریافت کریں کہ بھئی اُس کے اوپر قدرت ہمیشہ سے جس قدر مہربان تھی اور ہے، بہت کم لوگوں پر اس قدر اُس کی توجہ اور عنایت ہوا کرتی ہے۔ پھر بھلا! اُسے کسی سے حسد اور جلن کی ضرورت کیوں آن پڑی؟ اس سے بھی اہم بات یہ کہ وہ خوش نصیب یا کم نصیب ہے کون جس سے اُسے جلن اور حسد محسوس ہوتا ہے۔ ایک بار نہیں بار بار محسوس ہوتا ہے اور اُس کے اظہار میں وہ اس قدر اضطراری کیفیت میں کیوں مبتلا ہو جاتا ہے؟

آپ کا سوال ہر طرح سے برحق اور بروقت ہے۔ وہ تو مدّت سے چاہتا تھا کوئی اُس سے اس طرح کا سوال کرے۔ آپ کو اپنے سوال کے جواب کے لیے اُس کی رام کتھا لازمی سننا ہوگی۔ اُس کی زندگی سے مکمل واقفیت اور جان کاری کے بغیر نہ آپ اُس کے جلنے کُڑھنے کا سبب جان سکتے ہیں نہ اُس شخصیت سے آگاہی حاصل کر سکتے ہیں جس سے بقول آپ کے' میرا مطلب ہے بقول میرے ایک خوش نصیب شخص حسد کرتا تھا' کرتا ہے اور ہمیشہ کرتا رہے گا۔

قصّہ کچھ یوں ہے! ذرا ٹھہریئے' آپ کی اجازت ہو تو میں سانس لے کر تھوڑا سُستا لوں تاکہ یادوں کے موتیوں کو دانا' دانا لڑی میں پرو کر بارش کے قطروں کی مانند ٹپ' ٹپ بیان کر کے آپ کی آتشِ شوق کو سرد کر سکوں۔

اصل میں وہ ایک اداکار تھا۔ ایسا اداکار جس کو فلم نگر کے سب سے مہان ہدایتکار کا نہ صرف قرب حاصل تھا بلکہ اس عظیم ہدایتکار کی نظرِ عنایت کے طفیل اس کی زندگی عزت' دولت' شہرت و ناموری سے مالا مال تھی۔ اُس کی ہدایت میں اب تک اس اداکار نے بے شمار کامیاب فلموں میں کام کیا تھا۔ عشق و محبت' لڑائی مار کٹائی اور سماجی اور معاشرتی فلموں کا ایک طویل سلسلہ اس کے نام کے ساتھ جڑا ہے۔

ہونا اصولی طور پر یہ چاہیے تھا کہ ہدایتکار کے اس جانبدرانہ رویے سے اداکار اور ہدایتکار کے درمیان خلیج حائل ہو جاتی۔ اداکار الگ سے اپنا صنم خانہ تلاش لیتا اور ہدایتکار' نیا بُت تراش کر اُسے نئے ڈھب' نئے انداز سے متعارف کرا کر فنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیتا۔

اداکار آج تک اس امر پر حیران ہے کہ اُس نے ہدایتکار کی پیشکش کو مسترد کیوں نہ کیا؟ شاید اس کا سبب اُس کے اندر چھپا خوف تھا۔ اُس کے سامنے ہدایتکار کے کارناموں کی شمار نہ ہونے والی ان گنت مثالیں موجود تھیں۔ بڑے بڑے گاؤدی اور نکمّے لوگوں کو زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا۔ کئی بار! بڑے کرّ و فر والوں کو ایک ہی وار میں زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔

آپ ہی بتلایئے! جس اداکار کی ایک ایک ادا' ایک ایک انداز اور ایک ایک جھلک پر سینکڑوں نہیں ہزاروں لوگ قربان ہونے کے لیے تیار ہوں؛ جس کی خوبصورتی اور دلکشی کے گھر گھر چرچے ہوں' جس کو بے شمار دلوں کے سپنوں کا راج کمار مانا جاتا ہو' جس کو پانے کے لیے منّتوں' مرادوں اور مزاروں کا طواف کیا جاتا ہو' اس کے مقابل ایک نئی' بالکل نئی' غیر معروف' واجبی شکل و صورت' کم گو اور کم فہم لڑکی کو مرکزی کردار کے لیے اداکار کی مرضی کی بنا منتخب کیا جانا کس قدر ناانصافی اور ناقدری کی دلیل ہے۔ کوئی شخص کتنا ہی مہذب' شریف اور دھیمے مزاج کا کیوں نہ ہو' اس قدر زیادتی پر خاموش رہنا اس کے لیے بھی ناممکن ہے! بات پھر وہی کہ اداکار کے دل میں چھپی ہدایتکار کی ہیبت اُسے یہاں بھی ہر طرح کے احتجاج اور اختلاف سے باز رکھتی ہے۔ اگر آپ اسے خوشامد نہ سمجھیں تو میں اس خاموشی کو اداکار کا اپنی شخصیت و فن پر اعتماد سے تشبیہہ دینا چاہوں گا۔

اداکار کی شخصیت' فن' اعتماد' ان اور سمّان اُس روز ریزہ ریزہ ہو گیا جس روز ہدایتکار نے کسی قسم کی تفصیل بتائے بغیر اداکار کے آگے فلم کا معاہدہ دستخط کے لیے پیش کر دیا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اداکار نے ہدایتکار سے کہانی کی تفصیل اور اپنے کردار کی نوعیت جاننا چاہی تو ہدایتکار نے سرسری انداز میں چند لفظوں کے اندر کہانی کا خلاصہ بیان کر کے بات نمٹا دی۔ ''خیریت! تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' اداکار کی خاموشی کے جواب میں ہدایتکار نے استفسار کیا تو اداکار نے خلاؤں میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا ''ایسی تو کوئی بات نہیں' البتہ ۔۔۔۔!''، ''البتہ' ہاں' ہاں' جملہ مکمل کرو۔۔۔۔!'' اداکار کی ساری شوخی اور حاضر جوابی خدا معلوم کہاں غائب ہو گئی تھی۔ ''میرے بارے میں یہ اندازہ کب لگایا تم نے۔۔۔۔؟'' کیمرہ' لائٹس اور اسٹاف پر اچٹتی نظر ڈالتے ہوئے ''کون سا اندازہ ۔۔۔۔؟'' ''یہی کہ میں ایک ابنارمل انسان ہوں' میرا مطلب ہے کہ میں اس طرح کا کردار' ادا کر سکتا ہوں۔۔۔۔؟'' ہدایتکار نے اداکار کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ''ابے گھامڑ۔۔۔۔! ایسا کردار' ویسا کردار کیا ہوتا ہے؟ تم ایک اداکار ہو' تمہارا کام اداکاری کرنا ہے۔ ہدایتکار' کب' کہاں' کس طرح کی اداکاری چاہتا ہے یہی تمہارا پیشہ اور یہی ذمہ داری ہے۔''

اداکار اس جواب بلکہ روّیے کے لیے قطعی تیار نہ تھا۔ ایک نئی اور

نا تجربہ کار اداکارہ وہ بھی واجبی شکل وصورت اور کم گو اتنے بڑے اداکار کے مقابل لیڈنگ رول یعنی اداکار کی بیوی کا کردار نبھائے گی۔ چلیے! یہاں تک تو گوارا کیا جا سکتا ہے۔ اداکار کا تجربہ مہارت' اور ہنرمندی چند منٹوں میں اس کی اداکاری کو بوکھلاہٹ میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ جس کے بعد اداکاری سے تائب ہونے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہ ہوتا۔ مگر ہدایتکار کو یہ کیا ہو گیا ہے؟ اتنے بڑے' میرا مطلب ہے کہ سب سے بڑے ہدایتکار کو اس طرح کی انوکھی' نرالی فلم بنانے کا خیال کیوں چَرایا ہے۔ ایک شوخ وشنگ اور ہر دلعزیز اداکار کے مقابل ایک نئی اور ناتجربہ کار لڑکی کو اتنے بڑے اور اہم کردار کے لیے کیوں کر منتخب کر لیا ہے۔ اگر فلم ناکام ہو گئی تو اس لڑکی کا کیا جائے گا؟ ہدایتکار کا بھی کچھ نہ بگڑے گا! البتہ اداکار کا کیریئر داؤ پر لگ جائے گا۔

اداکار نے بہت سوچا' بہت غور کیا۔ ایک بار نہیں بار بار سوچنے اور غور کرنے کے باوجود وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ کوئی غیر مرئی قوت یا طاقت ضرور تھی جو اداکار کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس فلم میں کام کرنے پر اُکسا' میرا مطلب ہے مجبور کر رہی تھی۔ فلم نگر کی تاریخ میں پہلی بار نہ سہی' مدّت بعد ایک رومانٹک اور ایکشن ہیرو پہلی بار ایسی فلم میں کام کر رہا تھا جسے بچپن میں اُس کی ماں چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ یہ کردار بڑا ہو کر بظاہر ذہین' عقلمند اور بُردبار دکھائی دیتا ہے مگر اُس کے اندر چھپا بچہ' قدم قدم پر اس کا احساس محرومی ظاہر کرتا رہتا ہے۔

ہدایتکار نے خاص طور پر اس بچّے اور اس کی نفسیات کو سامنے رکھ کر کہانی لکھوائی تھی یا پہلے سے لکھی کہانی کو فلمانے کا پروگرام بنایا تھا یہ معلوم کرنا اداکار کے لیے دشوار بھی تھا اور ایک طرح سے بے معنیٰ بھی۔ اداکار اس امر سے بھی قطعاً بے خبر تھا کہ اس طرح کی انمل اور بے جوڑ کہانی پر پہلے بھی کوئی فلم بنائی گئی ہے یا اس فلم کا ہدایتکار پہلی بار اس موضوع کو فلما رہا ہے۔ بات وہی اہم ہے جو اوپر بیان کی جا چکی ہے کہ اس قدر بڑا ہدایتکار' عام ڈگر سے ہٹ کر ایسی پیچیدہ اور انہونی فلم بنا کیوں رہا ہے؟ بنا رہا ہے تو اس میں اس قدر ناتجربہ کار اور فلمی تقاضوں سے نابلد لڑکی کو لے کر کیوں اپنا اور اداکار کیریئر داؤ پر لگانے کو تُلا بیٹھا ہے۔

آج اداکار بہت خوش ہے۔ اُس کے دل' دماغ میں پلنے والے خدشات موسمی کیڑوں کی مانند پٹ پٹ اپنی موت آپ مر رہے ہیں۔ بالآخر ''امر کہانی'' کا آغاز ہو گیا ہے۔ اداکار نے فلم کے پہلے منظر کے لیے خاص طور سے شوخ وشنگ شیروانی' آڑا پاجامہ اور خوبصورت سلیم شاہی جوتے کا انتخاب کیا ہے۔ سیٹ پر موجود سبھی لوگ اداکار کی جاذبیت اور مسحور کن اداکاری پر اُسے مبارکباد دے رہے ہیں۔ دلہن کا بھڑکیلا روایتی لباس' خوبصورت زیورات اور ڈھیروں بناؤ سنگھار اُس کی شخصیت کو سادگی کے پردوں سے باہر لانے میں کامیاب نہ ہو سکے ہیں۔ اُس کی دھیمی اور بے جان اداکاری نے بھی اداکار کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اداکار کے حوصلے جوان اور ارادے مضبوط ہو رہے ہیں۔ اُسے اپنی کامیابی کی اُمید' یقین میں بدلتی نظر آ رہی ہے۔ اداکار سرخوشی وسرمستی کے عالم میں سیٹ پر موجود حسینوں' مہ جبینوں کے جھرمٹ سے کچھ دیر کے لیے الگ ہو کر میک اپ روم کا رخ کرنا چاہتا ہے۔ اداکار کے ارادے کو بھانپ کر ہدایتکار اُسے بتلاتا ہے کہ اگلا منظر بھی اِسی لباس' میک اپ اور گیٹ اپ میں فلمایا جائے گا۔

پہلے منظر کی کامیابی کے بعد تمام تر خوشی اور خود اعتمادی کو چھپاتے ہوئے اداکار گھونگھٹ کے اندر سجی' سمٹی دلہن کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے' منہ دکھائی کا تحفہ بڑی ادا سے پیش کرتا ہے۔ اداکارہ تحفہ قبول کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیتی ہے کہ ''اُسے اس کا تحفہ مل چکا ہے۔'' اداکار کی حیرانی دیکھ کر وہ ازخود اپنا گھونٹ پلٹ دیتی ہے۔ چہرے کے تمام تر تاثرات کو بروئے کار لاتے ہوئے کچھ اس انداز میں ٹھہر ٹھہر کر پہلا مکالمہ دہراتی ہے کہ اداکار اُس کی جاندار اداکاری سے اپنے مکالمے بھول جاتا ہے۔ اداکار کے اندر سے خود اعتمادی اور بڑائی کا بھوت' پُھر سے اُڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ اداکار مکالمے یاد کرنے کے لیے ہدایتکار سے مدد کا طالب ہوتا ہے مگر ہدایتکار کی تمام تر توجہ نو دریافت اداکارہ پر مرکوز دیکھ کر اداکار خود کو سنبھالتے ہوئے اٹک اٹک کر اپنے حصے کا مکالمہ ادا کرتا ہے۔ ''کون سا تحفہ۔۔۔۔؟'' اداکار کو اپنی آواز کا کھوکھلا پن صاف سنائی دیتا ہے جسے بھانپ کر وہ نہایت خود اعتمادی سے اداکار کا ہاتھ تھام کر کہتی ہے ''یہ ہے میرا تحفہ' قدرت کی جانب سے میرا انعام'' ''ای' ای' انعام۔۔۔۔ کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔۔؟'' ''ارے واہ' آپ تو لڑکیوں کی طرح شرما رہے ہیں۔ شرمانا بھی چاہیے اس لیے کہ آج آپ بہت اسمارٹ لگ رہے ہیں۔ اس سے خوبصورت تحفہ کوئی ہو سکتا ہے بھلا۔۔۔۔!'' ''یہ' یہ' تم کس طرح کہہ سکتی ہو۔۔۔۔؟'' اداکارہ کی فنی صلاحیت اداکار پر آشکار ہونے لگی ہے۔ ''آنکھوں دیکھا جھٹلایا تو نہیں جا سکتا نا۔۔۔۔!''

ہدایتکار کی ہدایت کے مطابق اداکار پلنگ پر بیٹھ کر دریافت کرتا ہے! ''مثلاً کیا دیکھ لیا جناب کی آنکھوں نے۔۔۔۔؟'' شاید! وہ بھی ہدایتکار کے حکم کے مطابق اداکار کی شیروانی کے بٹن سے کھیلتے ہوئے بولی! ''آپ اتنے بڑے اور مشہور اداکار ہو کر بھی نہیں جانتے کہ سیٹ پر موجود سبھی لڑکیاں آپ کے گرد کیوں منڈلا رہی تھیں۔۔۔۔؟'' انجان بنتے ہوئے کندھے اچکا کر اداکار فخر سے کہتا ہے! ''اچھا تو یہ بات ہے۔۔۔۔!'' اداکار شیروانی کی قید سے جسم آزاد کرتے ہوئے بات جاری رکھتا ہے ''تمہیں جلن نہیں ہوئی۔۔۔۔؟'' ''جلتے وہ ہیں جنہیں تقدیر اور کاسبِ تقدیر پر اعتبار نہیں ہوتا۔۔۔۔!'' اس بار جس مہارت' سنجیدگی اور یقین سے اس نے مکالمے ادا کیے اُسے دیکھ کر اداکار کے دل میں اُسے داد دینے کی خواہش ابھری مگر اداکار کی انا نے اُسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔

غالباً یہ فلم کا تیسرا باقاعدہ منظر ہے جس میں شادی کے دوسرے دن یعنی ولیمے کا منظر فلمایا جا رہا ہے۔ سیٹ پر موجود تمام ساتھی اداکار اپنے وقت کے بڑے اداکار کے سامنے نوارد اداکارہ کی مضبوط اور سنجیدہ اداکاری پر اُسے داد دینا

چاہتے ہیں مگر اداکار کی ناراضگی کا خوف اُنھیں ایسا کرنے سے باز رکھے ہوئے ہے۔اس منظر کو ہدایتکار نے سادگی سے چھوٹے چھوٹے مناظر میں تقسیم کر کے کچھ اس طرح فلمبند کیا ہے کہ مہمانوں کا کردار ادا کرنے والے سبھی اداکار کھانے سے پہلے' کھانے کے دوران اور کھانے کے بعد اشاروں کنایوں میں اس بے جوڑ میلاپ پر مشتمل فلم کے انجام پر ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنے اپنے تحفظات کا اظہار کرتے دکھلائے گئے ہیں۔

یہ منظر کسی پہاڑی مقام پر فلمایا گیا تھا۔بہت سارے لوگ نئے دولہا دلہن کے ہمراہ پکنک پر گئے ہوئے تھے۔کچھ دیر اکا دُکا لوگ آپس میں گپ شپ کرتے کرتے آہستہ آہستہ دو گروپوں میں بٹ گئے۔ایک طرف کے لوگ اداکارہ کی سادگی' سچائی' ایمانداری و پرہیزگاری کو گنوا کر اداکار پر نمبر لے جانے کی کوشش میں تھے جبکہ دوسری طرف کے لوگ اداکار کی خوبصورتی' وجاہت اور ہر دلعزیزی پر ناز کرنے میں مگن تھے۔مقابلہ دونوں جانب زوروں پر تھا۔اداکار حسبِ سابق چرب زبانی اور اداکارہ چہرے کے اتار چڑھاؤ سے کام چلا رہی تھی۔اچانک ایک نسوانی کردار اداکارہ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ''تم بھی تو کچھ بولو بی بُو۔۔۔۔!'' مکالمے کی ادائیگی سے قبل اداکارہ نے اپنے وزنی دوپٹے سے سر' سینہ اور شانے اچھی طرح ڈھانپتے ہوئے اچٹتی نگاہ اداکار پر ڈالی ''عورت کی سب سے بڑی بڑائی اور تعریف اس کا باوفا ہونا ہے۔جس دن اُس کا مزاجی خدا اُس کی وفا کا اعتراف کر لے وہ دن عورت کی خوش نصیبی اور بڑائی کا دن ہوتا ہے اور وہی اُس کی سچی تعریف بھی ہوتی ہے۔۔۔۔'' فلم کا پورا یونٹ ہدایتکار کی جاندار ہدایت اور اس کے انتخاب کی بے ساختہ داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد بیڈروم' ڈرائنگ روم' لان' ہوٹل' پارک وغیرہ کے کئی طویل اور مختصر مناظر فلمائے گئے تھے۔ان مناظر میں اکثر اداکار و اداکارہ کو اداکاری کرتے' دیر سے گھر آنے' وقت پر کھانا نہ کھانے اور اپنی صحت سے لاپروائی برتنے کے علاوہ ہنسی مزاق' چھیڑ چھاڑ اور روٹھنے منانے کے مناظر فلمائے گئے تھے۔جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ان مناظر میں اداکارہ کی دھیمی مگر جاندار اداکاری کا پلڑا ہمیشہ بھاری رہا کیونکہ روٹھے ہوئے اداکار کو منانے میں' اداکارہ جس سادگی اور سچائی سے اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھرتی اُس سے فلم کا منظر حقیقی گھر کا منظر لگنے لگتا اور سیٹ پر موجود سبھی لوگ رشک سے اس فلمی جوڑے کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے۔

ایک اور منظر گھر کے اُسی سیٹ پر فلمایا گیا تھا جس کا ذکر تحفے کے لین دین میں آ چکا ہے۔اداکار تھکا ہارا کام سے گھر واپس آتا ہے۔اداکارہ ایک ہاتھ میں اُون سلائیاں پکڑے ہوئے اداکار کی پشت سے لگ کر شرماتے ہوئے کہتی ہے ''آپ کے لیے ایک خوشخبری ہے۔۔۔۔!'' اداکار حیران ہو کر سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتا ہے ''کیسی خوشخبری۔۔۔۔؟'' چند ساعتوں کے لیے اس کے چہرے پر شرم وحیا کی باریک لکیر نمودار ہوتی ہے اور وہ سر جھکا کر خود کو مجتمع کرنے لگتی ہے۔کچھ دیر بعد سر اٹھا کر اداکار کے کاندھے پر سر رکھتے ہوئے آہستہ آہستہ مکالمے ادا کرتی ہے۔''آپ' آپ' باپ بننے والے ہیں۔۔۔۔!'' اداکار کا منہ خوشی کے بجائے حیرت سے کھلے کا کھلا رہ جاتا ہے۔''باپ۔۔۔۔اتنی جلدی۔۔۔۔!'' ''لگتا ہے آپ کو خوشی نہیں ہوئی۔۔۔۔!'' اداکار گھبراہٹ اور جھوٹ پر پردہ ڈالتے ہوئے ''نہیں' نہیں۔۔۔۔ایسی تو کوئی بات نہیں۔۔۔۔!'' دونوں اداکاروں کے کلوزاپ پر یہ منظر ختم ہو جاتا ہے۔اداکار کے چہرے پر جھوٹ پکڑے جانے کی ندامت اور اداکارہ کے چہرے پر ادھوری خوشی کا کرب نمایاں ہوتا ہے۔

ہدایتکار کے ذہن کو کوشش کے باوجود اداکار پوری فلم کے دوران سمجھ نہیں پایا۔باوجود اس کے وہ ایک مشہور اداکار تھا پھر بھی اس نے اپنی اس انوکھی نرالی فلم میں اُسے ایسے نوجوان کا کردار دیا تھا جسے جنون کی حد تک فلم ایکٹر بننے کا شوق تھا۔

اگلا منظر بھی بچے کی خوشخبری والے سیٹ پر ہی فلمایا گیا تھا۔البتہ! سیٹ میں تھوڑی بہت ردوبدل کرتے ہوئے مکان کو گھر بنانے کی کوشش کی گئی تھی جس میں عورت کے سگھڑاپے کی بہت سی نشانیاں اجاگر کی گئی تھیں۔اداکارہ گھر کے صحن میں چارپائی پر بیٹھی بچے کو دودھ پلا رہی ہے۔اداکار خوشی خوشی دوڑتا ہوا گھر میں داخل ہوتا ہے۔''مبارک ہو آج میری زندگی کا دیرینہ خواب پورا ہو گیا۔'' دونوں ہاتھ اور چہرے کی مدد سے خوشی کو نمایاں کرتے ہوئے ''میں فلم ایکٹر بن گیا ہوں۔مجھے ملک کے مشہور ہدایتکار مبارک حسین نے اپنی فلم میں ہیرو کا رول آفر کیا ہے۔'' اداکارہ خوشی سے اچھلتے ہوئے چارپائی سے کھڑی ہو جاتی ہے۔''یہ تو بہت خوشی کی خبر ہے' جلدی سے منہ میٹھا کرائیے۔'' اداکار اِدھر سے اُدھر ٹہلتے ہوئے ایک ہاتھ کو مکّا بنا کر دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مارتے ہوئے ''مگر اس نے ایک شرط رکھی ہے۔'' ''کیسی شرط۔۔۔۔؟'' اداکار اُس کے چہرے کے تاثرات پڑھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہتا ہے ''فلم میں آدھا سرمایہ مجھے لگانا پڑے گا۔'' اداکارہ سادگی سے کہتی ہے ''اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔۔۔۔؟'' ''تم سمجھنے کی کوشش کرو' اس کے لیے ہمیں اپنا گھر' کاروبار اور گاڑی فروخت کرنا ہوگی۔۔۔۔!'' تھوڑے سے وقفے کے بعد آہستگی سے ''آپ کی خوشی کے لیے ان چیزوں کی کیا اہمیت ہے۔۔۔۔؟''

''امر کہانی'' جس تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کر رہی تھی اُسی تیزی سے فلم کا یونٹ اداکارہ کا گرویدہ ہو رہا تھا۔اب اس کی حیثیت نوارد یا نا آموز اداکارہ کی نہ رہی تھی۔یونٹ کے تمام لوگ اس کی عزت کرنے کے ساتھ سنجیدہ اور بُردبار اداکاری کے دل سے قائل ہو گئے تھے۔اداکار کو اپنی اہمیت کم ہونے کا احساس شدت سے ستانے لگا تھا۔اُسے آپ اداکار کا وہم کہہ لیجیے' شک کا نام دے دیجیے یا اداکار کے اندر چھپے احساس کمتری کو ذمہ دار ٹھہرائیے مگر حقیقت یہی ہے کہ ہدایتکار بڑی مہارت سے اُس کے کردار میں اداکاری کے مواقع کے ساتھ دیکھنے والوں کی محبت' ہمدردی اور چاہت اجاگر کرنے کی کوشش پوری طرح بروئے کار لا رہا تھا۔

فلم نگر کے ایک بارونق دفتر میں اداکار' دوستوں کے ہمراہ جن میں

اکثریت صفِ مخالف کی تھی' خوش گپیوں میں مصروف دکھایا گیا ہے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی پر سبھی لوگ چونک پڑتے ہیں۔ صاحبِ دفتر فون اٹھا کر بڑی روانی سے ہوں ہوں' ہاں ہاں کرنے لگتا ہے اور کچھ دیر بعد اداکار کو ''تمہارا فون'' کہہ کر چونگا تھما دیتا ہے۔ اداکار بھی کافی دیر تک وقفے وقفے سے ہاں ہوں کرنے کے بعد فون بند کر دیتا ہے۔ ساتھ بیٹھے لوگ اداکار سے فون کی بابت دریافت کرتے ہیں تو وہ گول مول بات بنانے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ اداکار کی اس کوشش کو صاحبِ دفتر یہ بتلا کر ناکام بنا دیتا ہے کہ اداکار کے گھر سے بیٹی کی پیدائش کی خوشخبری آئی ہے۔ ''ہیں۔۔۔۔!'' بیک وقت سب کے منہ سے ایک جیسی آواز برآمد ہوتی ہے۔ کچھ دیر قبل گفتگو میں چہکنے والی بلبلوں کے چہرے لٹک جاتے ہیں۔ اداکار کو اس بات کا رنج ہوتا ہے کہ فلم نگری پہلے ہی اسے اُس کی توقع کے مطابق اہمیت دے رہی ہے نہ عزت' شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ سن کر تو اُس کی رہی سہی ساکھ بھی مٹی میں مل جائے گی۔ اُس سے اگلے منظر میں اداکار کو غضبناک حالت میں ایک سفید پوش گھر میں داخل ہوتے دکھلایا گیا ہے۔ جہاں اداکارہ کے گھر والوں کا کردار نبھانے والوں کے ساتھ اداکار کی ماں' بہن کا کردار نبھانے والے اداکار بھی موجود ہیں۔ اداکار کو معلوم ہے کہ اس کی ماں اور بہن شروع سے اُس کی بیوی کا کردار ادا کرنے والی اداکارہ کو ناپسند کرتی ہیں لہٰذا وہ انہیں وہاں دیکھ کر شیر ہو جاتا ہے۔ غصے کے عالم میں جو اول فول منہ میں آتا ہے بکنے لگتا ہے۔ اصل غصّہ اداکار کو اپنے دوستوں کے سامنے اس کی شادی شدہ حیثیت اور دو بچوں کا باپ ظاہر ہونے پر ہے اس لیے وہ زیادہ اشتعال میں دکھایا جاتا ہے۔ مسئلہ اداکار کو یہاں بھی ہدایتکار کی جانبداری کا درپیش تھا۔ پچھلے سبھی مناظر میں تماشائیوں کی ہمدردی سمیٹنے کے تمام مواقع اداکارہ کو فراہم کیے گئے تھے۔ اداکار کے اشتعال انگیز مکالموں سے جہاں اداکارہ کے گھر والوں کو بدمزہ دکھایا گیا ہے وہیں اداکار کی ماں کا کردار نبھانے والی بزرگ خاتون اشتعال میں آ کر خود پر قابو نہیں رکھ پاتی۔ ''کیوں آتے ہی اس بے زبان کے پیچھے پڑ گئے' یہ طریقہ ہے کوئی گفتگو کا' خبردار۔۔۔۔! اگر آئندہ تم نے اس معصوم سے اسطرح کے لہجے میں گفتگو کی تو میں تمہیں ہرگز ہرگز اپنا دودھ نہیں بخشوں گی۔'' اداکار کے لیے ایک صدمہ والدہ اور بہن کا اس کے ہمنوا بن جانے کا کم تھا کہ دوسرا اداکارہ نے یہ مکالمہ بول کر پہنچا دیا۔ ''رہنے دیں امی' اتنی دور سے تھکے ہارے آئے ہیں' بھوکے پیاسے بھی ہیں' ایسے میں کسی بھی انسان کو غصّہ آ سکتا ہے' یہ تو میرا بہت خیال رکھتے ہیں' آج سے قبل انہوں نے مجھ سے اونچی آواز میں بات تک نہیں کی۔۔۔۔!'' منظر کے اختتام پر باری باری ہدایتکار دونوں کا کلوز لیتا ہے غصہ ضبط کرنے کے باعث اداکار بدشکل اور اداکارہ انگاروں پر پانی ڈالنے کے باعث لچکتی مہکتی ڈال کی مانند معصومیت سے سر جھکا لیتی ہے۔

اگلے منظر میں فلم والوں کی لوٹ کھسوٹ' بے وفائی و بے اعتنائی اور فلم کا' کام درمیان میں بند ہونے کے سبب اداکار کو بیمار ہوتے دکھلایا گیا ہے۔ چند چھوٹے چھوٹے مناظر حکیم' ڈاکٹر اور طرح طرح کے جسمانی و دماغی معالجوں کو اداکار کا علاج معالجہ کرتے فلمائے گئے ہیں۔ ایسے ہی ایک منظر میں ڈاکٹر اداکار کو آپریشن کا مشورہ دیتا دکھائی دیتا ہے۔ دوسرے منظر میں ایک اور ڈاکٹر پہلے ڈاکٹر کی نفی کرتا نظر آتا ہے۔ اُس سے اگلے منظر میں فرسٹ ٹریشن کا شکار اداکار خود ہی آپریشن کرانے کی غرض سے ہسپتال پہنچ جاتا ہے۔ ڈاکٹر تمام رپورٹس اور تجاویز دیکھ کر اداکار کو آپریشن سے منع کرتے ہوئے بتلاتا ہے کہ اگر اس تکلیف کی وجہ سے بیماری ہوتی تو آپ کو پیدائشی بیمار ہونا چاہیے تھا۔ مگر ہدایتکار نے ساری معاشرتی الجھنیں اور مسائل اسی فلم میں نمایاں کرنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ اداکار کے اصرار پر اُس کا آپریشن ہوتے دکھلایا جاتا ہے۔ چونکہ آپریشن جس بیماری کو ختم کرنے کے لیے کیا گیا تھا وہ بیماری اداکار کے جسم میں سرے سے موجود ہی نہ تھی۔ حفظ ماتقدم کے طور پر ڈاکٹر کئی گھنٹوں تک اداکار کو آپریشن تھیٹر میں رکھ کر سب کچھ دھیان سے دیکھنا اور پرکھنا چاہتا ہے۔ آپریشن کرنے والا ڈاکٹر دس سے پندرہ منٹ میں پیچیدہ سے پیچیدہ آپریشن کرنے کے لیے مشہور دکھلایا گیا ہے۔ اس قدر طویل وقت گزرنے کے باعث اداکار کے دوست احباب اور رشتہ دار اس کی زندگی سے مایوس ہو کر مغفرت کی دعائیں مانگنے لگتے ہیں مگر اداکار کی ماں' بہن اور بیوی کا کردار نبھانے والی اداکارائیں مایوسی کو نزدیک نہیں آنے دیتیں۔ وہ بدستور اپنے رب کے حضور مناجات کرتی نظر آتی ہیں۔ ہدایتکار بھی اپنے ناظرین کو شاید یہی بتلانا چاہتا تھا کہ انہیں اپنے رب سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اسی لیے اُس نے اداکار کو آپریشن تھیٹر سے زندہ سلامت برآمد کر کے دکھلا دیا۔

اداکارہ کے ساتھ ہدایتکار کی ہمدردی اور خصوصی توجہ یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ آپریشن کے بعد جو منظر فلمایا گیا اس میں اداکار کی والدہ اور بہن کی دعاؤں کے ثانوی مناظر کے ساتھ اداکار کی دوسری زندگی کا تمام تر کریڈٹ ان مکالموں کے ذریعے اداکارہ کا دلوایا جاتا ہے۔ ''خدا سے اس کی بے بسی' بے کسی دیکھی نہ گئی۔ قدرت نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے ایک بار پھر معجزہ کر دیا۔ یہ سب اس کی دعاؤں کا ثمر ہے۔'' لیجیے۔۔۔۔! اپنے وقت کا بڑا اور مشہور اداکار فلم کے اگلے تمام مناظر میں اداکارہ سے ادھار مانگی زندگی جینے پر مجبور دکھایا جاتا ہے۔

سنا ہے! فلم کا ایک منظر شہر سے دور کسی سنسان' ویران مقام پر بھی فلمایا گیا تھا۔ وہ کسی پیر فقیر یا نامی گرامی بزرگ کے ڈیرے کی مانند نظر آتا تھا جہاں اداکارہ اپنی والدہ اور بہنوں کے ہمراہ خصوصی دعا کے لیے جاتی ہے۔ فلم کی کامیابی کے بجائے بزرگ اداکارہ کو اچھے کاروبار' بڑے گھر اور خوشحال مستقبل کی نوید سناتا ہے۔ اداکارہ کے منہ سے بے ساختہ نکل جاتا ہے ''مگر اُن کی خواہش۔۔۔۔!'' بزرگ غصّے سے اداکارہ کو گھورتا ہے تو بزرگ کا ایک کارندہ آگے بڑھ کر اداکارہ اور اس کے گھر والوں کو باہر کا راستہ دکھا دیتا ہے۔

لمبے وقفے کے بعد دونوں اداکار نئے سیٹ پر پھر یکجا دکھائے گئے

ہیں۔ یہ پرانا اور بوسیدہ گھر کا سیٹ ہے جس میں اداکارہ کے گھر والے بھی ثانوی کردار میں نظر آتے ہیں۔ دریافت کرنے پر اداکار کو بتایا جاتا ہے کہ یہ اداکارہ کے گھر کا سیٹ ہے جس میں عارضی طور پر اُن کو رہائش فراہم کی گئی ہے۔

ہدایتکار کے حکم پر لائٹ، کیمرہ اور ساؤنڈ اسٹارٹ ہوتے ہی اداکارہ اپنے شوہر کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے اپنائیت سے دریافت کرتی ہے۔''کیا سوچ رہے ہیں۔۔۔۔؟'' اداکار گہری سوچ سے لوٹتے ہوئے ''ہوں۔۔۔۔ہاں ۔۔۔۔میں سوچ رہا تھا۔۔۔۔!'' اداکار لمبا سانس لے کر ٹھنڈی آہ بھرتا ہے۔''کیا سوچ رہے تھے۔۔۔۔؟'' اداکارہ کی اپنائیت میں پیار چھلکتا دکھایا گیا ہے جس کے ثبوت میں وہ سرک کر اداکار کے نزدیک مونڈھے سے مونڈھا ملا کر بیٹھ جاتی ہے۔ ''سوچنا کیا ہے۔۔۔۔سب کچھ میری حماقت کے سبب برباد ہوگیا۔۔۔۔!'' اداکارہ جواب پہلے کی نسبت زیادہ بااعتماد اور پختہ اداکاری کرنے لگی ہے اداکار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہتی ہے۔''آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں۔۔۔۔یہ تو سب قسمت کا کھیل ہے۔۔۔۔جس نے پہلے سب کچھ دیا تھا وہ آئندہ بھی دے گا۔۔۔۔!'' اداکار پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے ''یہ سب بہلاوے کی باتیں ہیں۔۔۔۔ ہاتھ پیر ہیں، دماغ ہے، مارکیٹ میں ساکھ ہے۔۔۔۔مگر۔۔۔۔سرمایہ کے بغیر سب بیکار ہے۔۔۔۔!'' اس مرتبہ اداکارہ آنکھوں کے سامنے آئی بالوں کی لٹ کو سر کی جنبش سے پیچھے کی جانب کرتے ہوئے اداکار کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں بھرتے ہوئے دریافت کرتی ہے ''کم از کم کتنے پیسے ہوں تو آپ کا' کام چل سکتا ہے۔۔۔۔!'' ہارے ہوئے جواری کی مانند ''جتنے بھی ہوں، اسی سے کام چلانے کی کوشش کروں گا۔۔۔۔!'' اداکارہ ''میں ابھی آئی'' کہتی ہوئی اندر کی طرف لپکتی ہے۔

اداکار شیشے کے سامنے اپنا میک اپ یعنی بڑھی ہوئی شیو اور اتری ہوئی صورت دیکھ کر ملال کی اداکاری کرتا ہے۔ ہدایتکار عکس بندی کا سلسلہ پھر سے شروع کر دیتا ہے۔ اسی فریم میں اداکار کو شیشے کے اندر اداکارہ کا عکس نظر آتا ہے جس نے دونوں ہاتھوں میں مختلف مالیت کے بہت سے تُوے مُڑے نوٹ تھامے ہوئے ہیں۔ اداکار پلٹ کر اُس کی جانب متوجہ ہوتا ہے جس کے باعث آئینے میں اداکار کی پیٹھ اور اداکارہ کی شکل گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔''یہ کیا۔۔۔۔! اتنے پیسے تمہارے پاس کہاں سے آئے۔۔۔۔؟'' ''آپ کو آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گننے سے۔۔۔۔؟'' یہ مکالمہ ادا کرتے ہوئے اداکارہ رومانوی انداز میں اداکار کی زلفیں سنوارنے لگتی ہے۔''یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔۔۔۔؟'' ''کیا۔۔۔۔کیا اچھا نہیں کیا میں نے۔۔۔۔؟'' اداکارہ اٹھلاتے ہوئے انجان بنتی ہے۔''اپنے والدین سے پیسے مانگ کر اور کیا۔۔۔۔؟'' ''تو آپ میرے بارے میں اس طرح کی رائے رکھتے ہیں۔۔۔۔جناب میں بھی اتنی ہی خوددار ہوں جتنے آپ۔۔۔۔سمجھے!'' ''تو پھر یہ پیسے۔۔۔۔؟'' اداکار کے گلے میں بانہیں ڈال کر ''حضور! جو پیسے ہر ماہ آپ اپنے بچوں کے دودھ کی خریداری کے لیے بھیجا کرتے تھے وہ امی نے مجھے خرچ کرنے کی اجازت نہیں دی۔۔۔۔بس اتنی سی بات ہے۔'' اس منظر کا اختتام اداکار کے کلوز پر ہوتا ہے جس میں وہ تشکر آمیز نظروں سے اداکارہ کی جانب دیکھتے ہوئے فکرمند دکھایا گیا ہے۔ اُس کا دل چاہتا ہے وہ ہدایتکار سے لڑے، احتجاج کرے کہ فلم کے ہر منظر میں تماشائی کی ساری ہمدردی اداکارہ سمیٹ کر کیوں لے جاتی ہے۔ مقصود اداکار کی مدد کرنا تھا تو اس کا ذریعہ اداکار کے ماں باپ، بھائی بہن، دوست احباب یا خود اداکار بھی ہوسکتا تھا۔ تمام تر غصّے اور پریشانی کے باوجود وہ ہدایتکار کی ناراضگی مول لینے کا متحمل پہلے تھا نہ اب ہوسکتا ہے۔

یہ منظر کئی چھوٹے چھوٹے مناظر جن میں اداکار کو کارخانے، بازار اور مختلف دکانوں پر دوڑ دھوپ کرتے فلمائے گئے ہیں۔ اس کے بعد ایک سین انڈور فلم بند ہو رہا ہے۔ اس منظر میں اداکار کی حالت پہلے منظر کی نسبت کچھ بہتر دکھائی گئی ہے۔ مایوسی کی جگہ تھکن کے آثار نمایاں کرنے کے لیے اُس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور بالوں کو بے ترتیب دکھایا گیا ہے۔ تماشائی باریک بیں ہے تو وہ اداکارہ کے چہرے میں بھی واضح تبدیلی محسوس کر سکتا ہے جسے میک اپ مین نے مختلف رنگوں کے غازے سے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اداکارہ گھریلو بیویوں کی مانند گرم جوشی سے شوہر کا استقبال کرتے ہوئے اُس کی تھکن پر تشویش کا اظہار کرتی ہے۔ فوری طور پر کھانا لانے کے لیے بڑھتی ہے، اداکار کے انکار پر چائے بنانے چلی جاتی ہے۔ اداکار چائے کی چھوٹی چھوٹی چسکیاں لیتے ہوئے گہری سوچوں میں گم دکھایا گیا ہے۔''امر کہانی'' جس رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے اُسی رفتار سے اداکارہ کا اعتماد اور اُس کی اداکاری میں نکھار نمایاں ہو رہا ہے۔ اب وہ اداکار کے ساتھ بے تکلفی اور رومانوی مناظر بڑے اعتماد اور اپنائیت سے فلم بند کرانے لگی ہے۔''کیا بات ہے! اتنے خاموش کیوں ہیں۔۔۔۔؟'' اداکار کے گلے میں بازو حمائل کرتے ہوئے ''کچھ نہیں۔۔۔۔بس کام کے متعلق سوچ رہا تھا۔'' ''مجھے نہیں بتلائیں گے۔۔۔۔؟'' اداکار کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے اپنائیت سے کہتی ہے۔''بات۔۔۔۔دراصل یہ ہے۔۔۔۔چھوڑو۔۔۔۔جانے دو۔۔۔۔خواہ مخواہ تمہیں پریشان کرنے سے کیا حاصل۔۔۔۔؟'' ''اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ مجھے اپنا نہیں سمجھتے۔۔۔۔!'' اپنے حصے کے مکالمے ادا کارہ نے اس قدر جذباتی انداز میں ادا کیے کہ اداکار نا معلوم ہدایتکار کی ہدایت کے مطابق یا فطری جذبے کے تحت اداکارہ کے شانے پر سر رکھ کے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔''یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔۔۔۔نہ میں جذبات میں بہہ کر غلط فیصلہ کرتا نہ آج یہ دن دیکھنا پڑتا۔۔۔۔!'' اداکارہ کی اداکاری میں اچانک ممتا چھلک آتی ہے اور وہ اداکار کو معصوم بچے کی مانند سینے سے لگا کر تسلی دینے لگتی ہے۔''اچھے بچوں کی طرح بتلائیے، مسئلہ کیا ہے۔۔۔۔؟'' ''جن لوگوں پر مجھے مان تھا، بھروسہ تھا انہوں نے ادھار دینے سے قطعی انکار کر دیا ہے۔۔۔۔مارکیٹ کا ردِعمل اچھا ہے مگر سرمایہ نہ

ہونے کے باعث میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔۔۔۔اتنے کم پیسوں میں روز کنواں کھودنا' روز پانی پینے والا محاورہ پورا کرنا بھی دشوار ہے۔۔۔۔!'' اداکارہ جس تیزی سے اُس کی اداکاری کو پس منظر میں دھکیل رہی تھی وہ اداکار کے لیے خاصا تکلیف دہ تھا۔''آپ کے خیال میں کس قدر سرمائے سے آپ صورتحال کو سنبھال سکتے ہیں۔۔۔۔؟'' ''دس۔۔۔۔پندرہ۔۔۔۔یا۔۔۔۔!'' اداکار نے ڈرتے ڈرتے ہندسوں میں وقفہ دینے کی کوشش کی۔

جیسے ہی اداکارہ ایک منٹ کہہ کر گھر کے اندر لپکی ویسے ہی سیٹ پر موجود لوگوں نے لائٹ' کیمرہ' ساؤنڈ بند کر کے ستانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ہدایتکار نے اداکارہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جو اندر کے کمرے سے دوبارہ فریم میں داخل ہو چکی تھی کام جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ اداکارہ نے آتے ہی دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے ڈبے اور پوٹلی کھول کر تمام زیورات اداکار کے سامنے ڈھیر کرتے ہوئے کہا''میرے خیال میں انہیں بیچ کر آپ کا کام چل جائے گا۔۔۔۔!'' ہدایتکار کے حسبِ منشا اداکار آنکھ' ناک' کان' ہونٹ' ٹھوڑی کے تمام تر اتار چڑھاؤ شامل کر کے بڑے جذباتی انداز میں اپنے حصے کے مکالمے ادا کرتا ہے۔''میری وجہ سے تم نے پہلے ہی بہت دکھ اٹھائے ہیں۔۔۔۔اب یہ ظلم مجھ سے نہ ہوگا۔۔۔۔!'' اداکار کی تمام تر جذباتی اداکاری کو اُس کی مدِ مقابل نے ایک مسکراہٹ سے زائل کرتے ہوئے اپنے حصے کے مکالمے سادگی سے ادا کیے۔ ''کس ظلم کی بات کر رہے ہیں آپ۔۔۔۔؟ دھات کے یہ چند زیورات میرے کس کام کے۔۔۔۔میری شکل' صورت' شخصیت اور مزاج ان سے میل نہیں کھاتا۔۔۔۔!'' اداکارہ کی بھرپور اداکاری کا کرشمہ تھا یا کوئی اور وجہ اداکار کے منہ سے آہستگی سے صرف یہ جملہ ادا ہو سکا''زیورات تو عورت کا۔۔۔۔!'' ''رہنے دیجیے۔۔۔۔!ان فرسودہ باتوں کو میرے سامنے مت دہرائیے'' اس بار اداکارہ نے اپنے مکالمے اس قدر ٹھوک بجا کر ادا کیے کہ اداکار گھگیانے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ اداکارہ کے مصنوعی غصے اور اداکار کی ممنونیت کے جذبات کو کیمرے کی آنکھ نے قریب سے محفوظ کر لیا۔

''اتنے ڈھیر سارے پیسے۔۔۔۔؟'' اگلے منظر میں اداکار کے ہاتھ سے نوٹوں کی گڈیاں تھامتے ہوئے خوشی کا اظہار کرتی ہے۔''زیورات میں لتاں والے کڑے شامل ہوتے تو یہ پیسے اس سے کہیں زیادہ ہوتے۔۔۔۔!'' ''لتاں والے کڑے۔۔۔۔؟'' اداکارہ کا اڑتا رنگ دیکھ کر تشویش سے دریافت کرتا ہے''کیا بات ہے۔۔۔۔تم لتاں والے کڑوں کا سن کر پریشان کیوں ہو گئیں۔۔۔۔؟'' اداکارہ لمبا سانس لے کر خود کو نارمل کرتے ہوئے''نہیں نہیں' گھبرانے والی کیا بات ہے۔۔۔۔لتاں والے کڑے۔۔۔۔بھول سکتی ہوں بھلا۔۔۔۔!'' ''بھولنا بھی نہیں چاہیے۔۔۔۔وہ لتاں کو ہماری دادی نے۔۔۔۔دادی کو۔۔۔۔'' ذہن پر زور دیتے ہوئے''خدا معلوم کس نے دیئے تھے۔۔۔۔پر ہیں وہ ہمارے خاندانی کڑے۔۔۔۔انہیں سنبھال کر رکھنا۔۔۔۔!'' ''سنبھال کر۔۔۔۔ہیں۔۔۔۔آں۔۔۔۔!'' اُس کے مشتبہ جواب پر اداکار گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اس فلم کے ہدایتکار سے اداکار کی کبھی نہیں بنی۔ یہ اداکار کو کٹھ پتلی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ جب جی چاہتا ہے جسے جی چاہتا ہے آسمان پر بٹھا دیتا ہے اور جب جی میں آتا ہے زمیں پر لا پٹکتا ہے۔ بھاگ دوڑ کے چند مناظر فلمانے کے بعد ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہوئے راتوں رات اداکار اور اداکارہ کو اپنے گھر میں خوشحال زندگی بسر کرتے دکھلا دیتا ہے۔ دونوں ساتھی اداکار نئے گھر کی سجاوٹ کے ساتھ مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے دکھائے گئے ہیں۔ پہلے سے موجود ایک بیٹا' ایک بیٹی کے بعد فل اسٹاپ پر دونوں کا مکمل اتفاق ہے۔ اسی منظر میں خلافِ توقع معاف کیجیے گا ہدایتکار کی ہدایت کے مطابق اداکارہ بیٹی کی سالگرہ منانے کی تجویز پیش کرتی ہے۔ اداکار خوشی خوشی ساتھی اداکارہ کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے اور یوں اس منظر کو ہدایتکار کیمرہ پین کر کے گھر میں سگھڑاپے کے منظر کو نزدیک سے فلم بند کر لیتا ہے۔

طرح طرح کی خریداری' سجاوٹ' دعوت کے مینو اور مہمانوں کی تعداد پر ہلکی پھلکی نوک جھونک اور چھیڑ چھاڑ کے کئی چھوٹے چھوٹے مناظر فلمانے کے بعد اسی سیٹ پر سالگرہ کا منظر فلمایا جاتا ہے۔ ہدایتکار کو پہلی بار فلم کے اندر رقص موسیقی ڈالنے کا خیال بھی آتا ہے۔ سالگرہ کے اختتام پر دُور پار کے دوست احباب اور رشتہ دار باری باری اجازت لے کر چلے جاتے ہیں۔ چند قریبی لوگ چائے کی دوسری نشست اور گپ شپ کے لیے ٹھہر جاتے ہیں۔ ہر کردار ہدایتکار کی ہدایت کے مطابق اداکارہ کے صبر اور خوش نصیبی کی داد دے رہا ہے۔ اداکار کی بے چینی سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اُس کے دوست بجائے اس کی تعریف کرنے کے اُس کی حماقت اور غیر ذمہ داری کو مزے لے لے کر بیان کر رہے ہیں۔ کوئی اُس کی محنت' لگن اور ہمت پر ذرا بھی توجہ نہیں دے رہا جو اُس نے فلم کے تجربے کی ناکامی کے بعد اپنا گھر بنانے کے لیے محنت اور جدوجہد سے ناتا جوڑ کر کی ہے۔ ایک کردار اللہ جانے بے ساختگی کے عالم میں یا ہدایتکار کے مطابق اداکار سے اس کی ناکامی کا سبب دریافت کرتا ہے۔ اداکار کافی دیر سے اس موقع کی تلاش میں تھا لہٰذا اس نے اداکارہ کے پیر فقیر والے سین کا حوالہ دے کر اپنی ناکامی کا سارا ملبہ اُس کے سر ڈال دیا۔ اداکار کے اس الزام کے جواب میں اداکارہ کے بجائے اداکار کے قریبی دوست نے اداکار کی تائید کرتے ہوئے خوبصورت جملہ کسا''بھائی۔۔۔۔! یہ تجھے ہیرو کیوں بننے دیتی۔۔۔۔؟ اسے تو خود ہیروئن بننے کا شوق تھا۔۔۔۔!''

برجستہ اور برمحل جملے پر محفل میں بڑی زور کا قہقہہ پڑتا ہے۔ اداکار اداکارہ کے چہرے پر سرسری نظر دوڑاتا ہے سانولی سلونی صورت مارے خوشی کے سرخ رنگ میں تبدیل ہو جاتی ہے جس سے اداکار یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ہدایتکار اُسے جھانسا دے کر نمائشی کردار ادا کرا رہا ہے۔ اصل کہانی اداکارہ کے گرد گھوم رہی

ہے جو ہیروئن بننے کے شوق میں ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے ہر وقت آمادہ و تیار رہتی ہے۔

اداکار کے خدشات کو ساتھی اداکار جو اُس کے دوست کا کردار نبھا رہے ہیں کے ایسے چند مناظر فلیش بیک کے ذریعے دکھایا گیا ہے جن میں جا بجا وہ اداکارہ کی تعریف کرتے دکھائے گئے ہیں ایسے مناظر اداکار کی غیر موجودگی میں فلمائے گے تھے۔ ہر واقعہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل اور کہانی کے اندر اداکارہ کے کردار کو اجاگر کر رہا ہے۔ ایک منظر میں اداکار کے دوست کا کردار نبھانے والے اُسی کردار نے جس نے اداکار کی طرف دلچسپ جملہ اچھالا تھا یہ انکشاف کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے کہ اداکار کے آپریشن کے وقت اُس نے ہسپتال کا بل ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ کوشش کے باوجود وہ پیسوں کا بندوبست کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اُس آڑے وقت میں اداکارہ نے اپنے قیمتی کڑے فروخت کر کے ہسپتال کا بل چکایا تھا۔ ذاتی طور پر اس انکشاف نے ایک طرف اداکار کے دل میں اداکارہ کی قدر و منزلت بڑھا دی تو دوسری طرف ہدایتکار کی نسبت کافی غم و غصہ اُس کے دل، دماغ میں بھر دیا۔ اگر اسی طرح اداکارہ فلم بینوں کی ہمدردیاں سمیٹتی رہی تو بہت جلد فلم نگری سے اداکار کا بستر بوریا گول ہو جائے گا۔

''امر کہانی'' کو یادگار بنانے کے لیے ہدایتکار ہر وہ جتن کرنے میں مصروف ہے جو فلم کو خوب سے خوب تر بنا سکے۔ اس غرض سے اُس نے فلم کے اندر فلم، تھیٹر، پارک، لائبریری، ریستوران اور پہاڑی مقام پر چند مناظر برف باری کے بھی فلمائے تھے۔ ایک منظر پھولوں کی نمائش کے اندر بھی فلمایا گیا تھا۔ اداکار، اداکارہ کے دونوں بچے کھیل کُود میں مصروف دکھائے گئے ہیں اور ماں باپ درخت کی چھاؤں میں بیٹھے پھولوں کے خالق و مالک کو خراجِ تحسین پیش کر رہے ہیں۔ اداکارہ اپنے ساتھی سے اچانک سوال کرتی ہے ''آپ نے اتنی ڈھیر ساری عشقیہ فلموں میں کام کیا ہے کبھی کسی اداکارہ نے آپ سے اپنے جُوڑے میں پھول لگانے کی فرمائش نہیں کی۔۔۔۔؟'' اداکار نے لاپرواہی سے شانے اچکاتے ہوئے کہا ''بارہا۔۔۔۔!'' اداکارہ نے غور سے اُس کے چہرے کو پڑھتے ہوئے دریافت کیا ''اور آپ کا ردِعمل کیا ہوتا تھا۔۔۔۔؟'' ''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔۔۔۔!'' خلاف توقع اداکارہ نے اُس کے گال پر چٹکی لیتے ہوئے کہا ''یعنی آپ اُن کی فرمائش پوری کر دیتے تھے۔۔۔۔!'' اداکار سر کی جنبش سے مسکرا کر ہاں میں جواب دیتا ہے۔ ''تو پھر میرے بالوں میں بھی لگائیے نا۔۔۔۔!'' پشت کے پیچھے چھپا دوسرے ہاتھ میں تازہ گلاب اداکار کی جانب بڑھاتے ہوئے اس قدر بے باکی اور اپنائیت سے پھول پیش کرتی ہے کہ اداکار کو اپنی زندگی کی تمام مشہور و معروف اداکارائیں پھیکی اور بے جان لگنے لگتی ہیں۔

ہدایتکار نے اداکارہ کے لیے اس قدر موزوں، مناسب اور بروقت مکالمے تحریر کرائے تھے کہ اُن پر حقیقت کا گمان گزرتا تھا۔ بالوں میں پھول لگنے کے بعد وہ اداکار کے اور نزدیک ہو کر بے تکلفی سے کہتی ہے ''آپ کو پتہ ہے۔۔۔۔! میں آج کل کس قدر پریشان ہوں۔۔۔۔؟'' ''خیریت۔۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔۔؟'' اداکار نے بے دلی سے دریافت کیا۔ ''دو ہفتے اوپر ہو گئے ہیں۔۔۔۔ خیریت کہاں ہیں۔۔۔۔!'' ''بڑی غلط بات ہے۔۔۔۔ یہ تو معاہدے کی خلاف ورزی ہے سراسر۔۔۔۔!'' ''آہاہاہا۔۔۔۔ کہہ تو ایسے رہے ہیں۔۔۔۔ جیسے سارا قصور میرا ہو۔۔۔۔!'' اداکار شوخی پر اتر آتا ہے۔ ''تو پھر کس کا ہے۔۔۔۔؟'' ہار مانتے ہوئے ''اچھا بابا۔۔۔۔ میں ہی قصوروار سہی۔۔۔۔ اس کا حل نکالیے نا۔۔۔۔!''

ایک منظر ڈاکٹر کے کلینک کا ہے جہاں اداکارہ سر لٹکائے کلینک سے باہر آ رہی ہے۔ اداکار کے اشارے سے دریافت کرنے پر سر کی جنبش سے انکار میں جواب دے رہی ہے۔ اس سے اگلا منظر اداکار کو ایک ڈاکٹر سے خاموش گفتگو کرتے دکھایا گیا ہے۔ گفتگو کے آخر میں ڈاکٹر دونوں ہاتھ اور شانوں کی مدد سے بے بسی کا اظہار کرتے دکھلایا گیا ہے۔ اُس سے اگلا منظر لمبے سفر کا ہے جس میں چند شارٹس گاڑی کے آگے پیچھے سے لئے گئے ہیں اور چند دونوں ساتھی اداکاروں کے کلوز کے جن میں دونوں اداکار سنجیدہ اور فکر مند نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد والے منظر میں ایک اور ڈاکٹر سے دونوں کے مکالمات دکھائے گئے ہیں۔ ''آپ پندرہ دن نہیں ایک ماہ پندرہ دن لیٹ ہیں۔ یہ بھی میں آپ کی مسز کے بیان کو سامنے رکھ کر کہہ رہا ہوں وگرنہ میرے حساب سے دو ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔'' اداکار کے مجبور کرنے پر ڈاکٹر ہدایتکار کی ہدایت کے مطابق سنجیدگی سے دونوں کو سمجھاتا دکھایا گیا ہے۔ ''آپ اس قدر پریشان کیوں ہوتے ہیں۔۔۔۔ جس روح نے اس دنیا میں آنا ہے۔۔۔۔ ہر حال میں آنا ہے۔۔۔۔ یہ تو ویسے بھی ایک طرح سے قتل ہے۔۔۔۔ میں یہ جرم ہرگز نہیں کروں گا۔۔۔۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ اسے قدرت کا انعام جان کر خوش دلی سے قبول کریں۔۔۔۔!''

''امر کہانی'' جس تیز رفتاری سے تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے اُسی تیز رفتاری سے اداکارہ کا اعتماد اور ہنرمندی ظاہر ہو رہی ہے۔ اس کا سبب وہ خصوصی مناظر بھی ہیں جو ہدایتکار نے اداکارہ کی شخصیت میں نکھار پیدا کرنے کے لیے دانستہ طور پر فلم میں ڈالے ہیں۔ مثال کے طور پر خوشحالی کی آمد کے ساتھ اداکار اپنی ساتھی اداکارہ کو اُس کے زیورات لوٹانے کی غرض سے صراف کی دکان پر لے جاتا ہے۔ اداکارہ اپنی پسند کے زیورات خریدنے کے بعد شوکیس میں لگے اُسی طرز کے کنگن کو غور سے دیکھنے لگتی ہے جیسے اداکار کی والدہ نے شادی کے موقع پر اداکارہ کو چڑھائے تھے۔ اداکار اپنے ساتھی کے دل کی بات سمجھ جاتا ہے اور صراف سے مذکورہ کڑے خریدنے کی بات کرتا ہے۔ اداکارہ چوری پکڑی جانے پر شرمندہ ہو کر کہتی ہے ''اگر میں ساری دکان کو غور سے دیکھوں گی تو آپ ساری دکان خرید لیں گے۔'' ''شاید۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔ تم ایسا کرو گی نہیں۔۔۔۔!''

اس کے بعد کے منظر میں دونوں کو اپنا گھر خریدتے دکھلایا گیا ہے جو

اداکارہ کو بتلائے بنا اس کے نام کر دیا جاتا ہے۔ پھر ایک منظر میں اداکارہ کی چھوٹی بہن کی شادی دکھلائی گئی ہے جس میں اداکارہ کی بہنیں' کزنز اداکار کو دولہا بھائی کہہ کر بلاتی ہیں تو اداکار اُن کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ کچھ اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے کئی دلچسپ مناظر شادی کے دوران فلمائے گئے ہیں۔ واپسی پر باری باری دونوں اداکار اُن مناظر کو یاد کرتے ہوئے ایک دوسرے کو چھیڑتے دکھلائے گئے ہیں۔ اچانک اداکارہ اپنی ایک کزن کا نام لے کر اُس کے طلائی سیٹ کی تعریف بڑی حسرت کے ساتھ کرتی دکھلائی گئی ہے۔ اگلے منظر میں اداکار مذکورہ کزن سے صراف کا پتہ دریافت کرتا ہے اور اُسی طرز کا سیٹ خرید کر اداکارہ کو پیش کرتا ہے تو مارے خوشی کے بے ساختہ وہ اداکار کے گلے میں جھول جاتی ہے۔

ہدایتکار کی مہارت کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ وہ مختلف زمانوں کو مختصر مناظر کے ذریعے ظاہر کرتا ہوا کہانی کو آگے بڑھا رہا ہے۔ ایک سیکونس ہدایتکار نے اس جوڑے اور تینوں بچوں کے ساتھ سیاحت کا بھی فلم میں شامل کیا ہے۔ اداکارہ پہلی بار اپنے سسرالی شہر کے دورے پر جاتی ہے جہاں وہ اپنے حسنِ سلوک سے سب لوگوں کے دل جیت لیتی ہے۔ اداکار کی پرانی ساتھی اداکارائیں اُس کے قُرب کی خاطر اداکارہ کو بھابھی' بھابھی کہتے ہوئے اُس کی ہمراہی کی خواہاں دکھائی گئیں ہیں۔ اداکار کے ساتھ اُس کی بیوی کا کردار نبھانے والی اداکارہ کو قیمتی تحائف پیش کرتے ہوئے بھی اِن اداکاراؤں کو دکھلایا گیا ہے۔ اداکارہ اس کیفیت میں کسی قسم کا حسد یا جلن محسوس کرنے کے بجائے صورتحال سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ موقع کی مناسبت سے اداکار کے چٹکیاں بھی لیتی رہتی ہے۔ اس طویل منظر کے آخر میں جب رخصت کا وقت آتا ہے تو فلم میں اداکار کے باپ کا کردار نبھانے والا سینئر اداکار نہایت جذباتی انداز میں بیٹے کو مخاطب کر کے کہتا ہے ''بیٹا۔۔۔۔! بہو قدرت کی طرف سے تمہارے لیے بڑا انعام ہے۔۔۔۔ اس کو ہمیشہ خوش رکھنا۔۔۔۔ کبھی کوئی غم۔۔۔۔ کوئی دکھ۔۔۔۔ اس کے نزدیک نہ آنے دینا۔۔۔۔'' بظاہر اداکار اپنے حصے کے مکالمے ادب سے ''جی اباجی'' کہہ کر خوش دلی سے ادا کرتا ہے مگر یہاں بھی اُسے اداکارہ کی ہر دلعزیزی پر کُڑھتے دکھایا گیا ہے۔

تیسری دنیا میں اکثر فلمیں چُوچُو کا مربہ ہوا کرتی ہیں۔ ہدایتکار ایک ہی فلم میں وہ تمام خوشی' غم' حادثات و واقعات دکھانا چاہتا ہے جو عام زندگی میں مختلف مواقعوں پر مختلف لوگوں کو مختلف جگہ پر درپیش ہوا کرتے ہیں۔ ''امر کہانی'' کا ہدایتکار بھی اس جانب گامزن دکھائی دیتا ہے۔ ہدایتکار کے اس عمل سے تماشائی کیا تاثر لیتے ہیں اس کا اندازہ فلم کے اختتام پر ہی لگایا جا سکے گا البتہ! اداکار پہلے کی نسبت کسی قدر مسرور و مطمئن دکھائی دینے لگا ہے۔ ہدایتکار نے اداکارہ کو خالص مشرقی چلن کی خاتون دکھا کر بچوں کی پرورش اور نگہداشت کے ساتھ گھر کے کام کاج میں مصروف دکھایا ہے۔ وہ ہر وقت' ہر طرح سے اپنے گھر کو خوب سے خوب تر بنانے میں مگن دکھائی گئی ہے۔ وہ کھانا پکاتی ہے تو دو طرح کا کہ اگر ایک سالن بدمزہ ہو گیا تو دوسرے سے کام چلا لے گی۔ کسی سبب سالن ایک پکانا پڑے تو ساتھ میں میٹھا ضرور بنائے گی۔ گھر میں میٹھا دستیاب نہ ہو تو بازار سے مانگا کر دسترخوان پر میٹھائی یا پھل ضرور رکھے گی۔ یہ تمام جتن وہ اس لئے کرتی دکھائی گئی ہے کہ اُس کے مزاجی خدا کا کھانا میٹھے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اُس کے بچے بھی میٹھا کھانے کے عادی ہو گئے ہیں۔ بچوں کو گلہ ہے کہ ماں ہم سے زیادہ باپ پر توجہ دے رہی ہے۔ باپ کو گلہ ہے کہ اُس کی بیوی اُس کے بجائے بچوں کو اہمیت دینے لگی ہے۔ وہ سب کی سنتی ہے۔ وہ سب کی مانتی ہے۔ وہ سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ بولنے سے زیادہ عمل کی قائل ہے مگر جب بھی بولتی ہے تو اس کا زیادہ تخاطب شوہر ہوا کرتا ہے۔ وہ ہر کام کرنے سے پہلے دانستہ یا نادانستہ شوہر کا ذکر کسی نہ کسی طرح ضرور کرتی ہے۔ ''ڈیڈی کہہ رہے تھے۔۔۔۔ ڈیڈی سے یہ کہنا۔۔۔۔ ڈیڈی سے یہ مت کہنا۔۔۔۔!'' اکلوتی بیٹی جس تیزی سے سیانی ہو رہی تھی اُسی تیزی سے دونوں بیٹے بڑے ہو رہے تھے۔ وہ جب اپنی ماں کو ڈیڈی کی گردان کرتے سنتے ہیں تو شرارت سے کہتے دکھائی دیتے ہیں ''کس کے ڈیڈی۔۔۔۔؟'' وہ ہنس کر اپنے اس عمل پر جھینپ جاتی ہے۔ ''اچھا۔۔۔۔!'' کہہ کر خود بھی ہنسنے لگتی ہے۔

اگلا منظر تماشائی کی توقع کے عین مطابق فلم بند کیا جا رہا ہے۔ اداکارہ پریشانی کے عالم میں لیڈی ڈاکٹر سے دریافت کرتی ہے۔ ''آپریشن کے علاوہ کوئی طریقہ۔۔۔۔؟'' ڈاکٹر صاف صاف لفظوں میں بتاتی ہے ''تمہارے پیٹ میں رسولی ہے جو صرف آپریشن کے ذریعے نکالی جا سکتی ہے۔'' اس منظر کے دوسرے شاٹ میں اداکارہ کو آپریشن تھیٹر میں لیٹے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اگلے شاٹ میں اداکار ہسپتال کے نچلے حصے میں ضروری کارروائی میں مصروف نظر آتا ہے۔ اس سے اگلے شاٹ میں ڈاکٹر کو آپریشن تھیٹر سے باہر آ کر اداکار کی بہن سے دریافت کرتے دکھایا گیا ہے ''ان کے کتنے بچے ہیں۔۔۔۔؟'' اداکار کی بہن بچوں کی تعداد بتلاتی ہے۔ ''تین کافی نہیں ہوتے۔۔۔۔!'' لیڈی ڈاکٹر یہ کہتی ہوئی آپریشن تھیٹر میں داخل ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد اداکار واپس آتا ہے تو بہن اُسے ڈاکٹر کے استفسار کی بابت بتلاتی ہے۔ دونوں بھائی بہن اپنے اپنے انداز میں رائے زنی کرنے لگتے ہیں جس میں وہاں موجود عزیز اقارب بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر آپریشن تھیٹر سے برآمد ہو کر اداکارہ کے کامیاب آپریشن کی خوشخبری کے ساتھ اداکارہ کے آئندہ کے لیے ماں نہ بننے کی خبر بھی دیتی ہے اور یہ بھی بتلاتی ہے کہ یہ سلسلہ اُس نے دانستہ طور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے۔ یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ مذکورہ ڈاکٹر شہر کی سب سے بڑی اور نامور گائنا کالوجسٹ دکھلائی گئی ہے۔

اگلے مناظر میں ہدایتکار نے لوگوں کو اکتاہٹ سے بچانے کے لیے طرح طرح کی دلچسپیاں مثلاً بچوں کے تعلیمی مراحل' کھیل کود' لڑائی جھگڑے اور

شرارتیں دکھلائی ہیں۔اسی منظر میں رشتے داروں اور پڑوسیوں کی آرجار،لین دین اوراداکارواداکارہ کے مالی حالات میں تبدیلی کے ساتھ نئے اور بڑے گھر میں منتقل ہوتے دکھلایا گیا ہے۔اس گھر میں کشادہ لان، پھل دار درخت اور رنگ برنگے پھولوں کی بے شمار کیاریاں ہیں۔اداکارہ گھر دیکھ کراپنے شوہر سے خوشی کے عالم میں کہتی ہے''جب میں بزرگ بابا کے پاس گئی تھی تو انہوں نے جس طرح کے گھر کا ذکر کیا تھا یہ گھر بالکل ویسا ہی ہے۔ میں اسے اکثر خواب میں دیکھا کرتی تھی۔۔۔!'' اداکار بزرگ بابا کے نام پر زیرِلب مسکراتا ہے۔نئے گھر میں آنے والے اپنے، پرائے ایک بار پھر سے اس گھر کو اداکار کے تدبر، محنت اور جفاکشی سے تشبیہہ دینے کے بجائے اداکارہ کی خوش قسمتی سے تعبیر کرتے ہیں۔اداکارہ یہاں بھی اپنے حسنِ سلوک سے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔''امر کہانی'' کے آغاز میں اداکار اُس کی تعریف پر پہلے کی طرح کُڑھتا ہے نہ حسد محسوس کرتا ہے۔شاید وہ خود بھی اداکارہ کی صلاحیتوں اور اُس کی خوش قسمتی کا دل سے قائل ہو چکا ہے یا اپنی صدا بہار شخصیت کے سحر میں گرفتار ہونے کے باعث اداکارہ کو اپنے لیے اُس طرح خطرہ نہیں سمجھتا جس طرح پہلے سمجھا کرتا تھا۔

بڑے گھر اور بڑے مسائل میں گھر کر اداکارہ کی فگر تیزی سے خلط ملط ہو رہی تھی۔ بڑھتے ہوئے وزن کے ساتھ جسمانی خطوط مدھم ہوتے جا رہے تھے۔ابتداء میں اداکار نے یہ خیال کیا کہ بیٹی کے بڑا ہونے اور کام کاج میں ماں کا ہاتھ بٹانے کے سبب اداکارہ پوری کلریز، برن نہیں کر پاتی۔ وہ اکثر اداکارہ کا مذاق اڑاتے ہوئے اُسے ورزش کی تلقین کیا کرتا کیونکہ اُس کے روزمرہ کے معمولات میں ورزش کو خاص اہمیت حاصل تھی۔اداکارہ اپنی افتادِ طبع یا ہدایتکار کی ہدایت کے مطابق اپنے شوہر کی بات پر عمل کر لیتی اور کبھی تساہل کا شکار ہو جاتی جس کے باعث اسے اداکار کے ہنسی مذاق کا سامنا کرنا پڑتا۔

کچھ دنوں سے اداکارہ کو پھر سے پیٹ میں ''گولے'' کی شکایت ہو رہی تھی۔سلسلہ پھر سے ڈاکٹر، ایکسرے اور ٹیسٹ وغیرہ سے شروع ہو کر ہدایتکار کی فن کاری پر منتج ہوا۔ کچھ لوگوں کے خیال میں یہ ہدایتکار کبھی کبھی اس طرح کے عجوبے اپنی فلم میں دکھا بیٹھتا ہے کہ تماشائی حیران و پریشان ہو کر کبھی کبھی اسے نوسر باز کے لقب سے یاد کرنے لگتا ہے۔اب کوئی اُس سے پوچھے، دریافت کرے کہ بھئی اداکارہ کے پیٹ میں گولے کی جگہ تم نے بچہ دکھانا ہے تو آپریشن والے منظر میں شہر کی مایہ ناز گائنا کالوجسٹ سے یہ سلسلہ ختم کرانے کا مکالمہ کیوں کرایا تھا۔کیا آپ میں ہدایتکار سے پوچھنے یا دریافت کرنے کی ہمت ہے۔۔۔؟ اگر آپ ایسا کریں گے تو منہ کی کھائیں گے۔ کیونکہ ہدایتکار کچی گولیاں ہرگز نہیں کھیلا۔۔۔!اُس نے مذکورہ گائنا کالوجسٹ کی موت پہلے ہی کرا دی ہے۔آپ کو اختیار ہے کہ آپ ہدایتکار کے اس چمتکار پر اُسے خراجِ تحسین پیش کیجیے یا تنقید کی سان پر چڑھائیے۔

اوپر کے منظر میں ہم ہدایتکار کو غلطی سے نوسر باز کہنے کے مرتکب ہوئے ہیں۔وہ ہدایتکار ہونے کے ساتھ اور بھی بہت کچھ ہے۔انسانی نفسیات پر اُس کی گرفت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جو لوگ دو بچوں کے اکتفا کی قسمیں کھایا کرتے تھے وہ چوتھے بچے کی پیدائش پر نہ صرف خوش بلکہ مسرور دکھائے گئے ہیں۔ اداکار موقع بہ موقع اداکارہ کے کمرے میں جا کر بچے کے منہ سے کپڑا ہٹاتا اور چوری پکڑے جانے پر دریافت کرتا ہے''سو رہا ہے کہ جاگ رہا ہے۔۔۔؟'' اداکارہ جتنی سادہ نظر آتی ہے اتنی ہے نہیں۔صورتحال کو وہ انجوائے بھی کرتی ہے اور گھر آئے مہمانوں کے سامنے نومولود کو اداکار کی گود میں ڈال کر یہ کہتے ہوئے کیش کراتی ہے'' آپ اسے سنبھالیے میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔۔۔!'' جس شخص نے پہلے تین بچوں میں سے کسی ایک کو بھی گود میں اٹھانے کی زحمت گوارا نہ کی ہو، مہمانوں کی روبرو بچہ کھلانے پر اُس کی کیا حالت ہوگی اس کا اندازہ آپ فلم دیکھ کر ہی لگا سکتے ہیں۔

ہدایتکار کو فلم کی طوالت کا شدت سے احساس ہونے لگا ہے۔اسی لیے وہ بچوں کو تیزی سے بڑا ہوتا اور تعلیمی مراحل طے کرتا دکھانے لگا ہے۔ایک منظر میں گھر کے سیٹ پر دُور دراز سے آیا ہوا ایک نوجوان مہمان دکھلایا گیا ہے۔مہمان کو فوٹو گرافی کا شوقین بتلاتے ہوئے اُس کے پاس قیمتی کیمرہ بھی دکھلایا گیا ہے۔ مہمان چونکہ اُن کے شہر کی سیاحت کا خواہش مند ہے اس لیے وہ اداکار میاں بیوی سے ساتھ چلنے کا اصرار کرتا ہے۔ باری باری دونوں میاں بیوی کام کاج اور بچوں کی پڑھائی کا عذر پیش کر کے معذرت کرنا چاہتے ہیں۔چھٹی کا دن اور بچوں کی ضد سے مجبور ہو کر مہمان کی خواہش کے احترام میں پکنک کا پروگرام فائنل ہو جاتا ہے۔ اداکارہ بہت تھوڑے وقت میں بھاری بھرکم لنچ تیار کر کے پکنک کے پروگرام کو دو آتشہ کر دیتی ہے۔

اگلا منظر ہدایتکار نے کچھ اس مہارت سے کیمرے میں محفوظ کیا ہے کہ ایک ہی منظر میں بہت سے مناظر سما گئے ہیں۔شہر کا بڑا ڈیم، مشہور پارک، چڑیا گھر اور میوزیم وغیرہ کی سیر کے بعد پھولوں کی نمائش کے مقام پر لنچ اور فوٹو گرافی کے منظر کو تفصیل سے فلم بند کیا گیا ہے۔کیسٹ ریکاڈر کی مدد سے ہلکی پھلکی موسیقی پر بچوں کا رقص بھی دکھلایا گیا ہے۔کھانے کے بعد بچے پکڑم پکڑائی اور دیگر کھیل کُود میں مصروف ہو جاتے ہیں۔بچوں کی خواہش ہے کہ مہمان بھی اُن کے ساتھ کھیلے۔ شرمیلی طبیعت کے باعث مہمان اُس کے لیے خود کو تیار نہیں پاتا۔ ہمیشہ کی مانند بچے باپ کے ساتھ کھیلنے کی ضد کرتے ہیں۔جس کے اندر چھپا بچہ ہمیشہ کی مانند آمادہ ہو جاتا ہے۔بڑے بچوں کے ساتھ چوتھا اور سب سے چھوٹا بچہ آڑا ترچھا ہو کر اُن کے درمیان بھاگ دوڑ کرتا نظر آتا ہے۔ایک مرتبہ جب وہ ٹھوکر کھا کر گرتا ہے تو باپ اُسے اپنی پیٹھ پر لاد کر پھر سے کھیل کُود میں حصہ لینے لگتا ہے۔قریب بیٹھے لوگ اِس کھیل کود سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ انہی میں سے ایک خاندان کی بزرگ

خاتون اداکارہ سے رسمی گپ شپ کے بعد اُس کے بچوں کی تعداد دریافت کرتی ہے۔ اداکارہ کھیل سے محظوظ ہوتے ہوئے ''بچے تو چار ہیں۔۔۔۔ پالنے پانچ پڑتے ہیں۔۔۔۔!'' اداکار کھیل گُو دسے توجہ ہٹاتے ہوئے اداکارہ کے اس جملے پر سوالیہ نگاہوں سے اُس کی جانب دیکھتا ہے اور سوال دریافت کرنے والی خاتون نظر بھر کر کھیل گُو دمیں مصروف بچوں کے علاوہ متجسس نظروں سے مہمان پر نظر مرکوز کر دیتی ہے۔

اُس کے بعد کا منظر بیڈروم میں فلمایا گیا ہے۔ اداکارہ شب خوابی کے لباس میں ہاتھ منہ پر چکنی چیز ملتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ ''آج بہت تھکن ہوگئی۔۔۔۔!'' ''اتنے ڈھیر سارے کھانے پکانے کو کس نے کہا تھا تم سے۔۔۔۔؟'' قبل اس کے اداکارہ جواب میں کچھ کہے اداکار پھر بولنا شروع کر دیتا ہے ''اچھا یہ بتلاؤ۔۔۔۔ یہ پانچواں بچہ۔۔۔۔ کب۔۔۔۔ کہاں۔۔۔۔ کیسے وارد ہوگیا۔۔۔۔ اور ہمیں پتہ تک نہ چلا۔۔۔۔؟'' ''اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا۔۔۔۔!'' ٹھوڑی پکڑ کر اداکار کا چہرہ ہلاتے ہوئے ''کیا مطلب۔۔۔۔؟'' اداکارہ بیڈ پر اداکار کے قریب بیٹھتے ہوئے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو جوڑ کر اداکار کے ہونٹوں سے کھیلتے ہوئے ''میں اتنے عرصے سے کس قدر ناز ونعم سے اپنا پانچواں بچہ پال رہی ہوں اور میرے بچے کو پتہ تک نہیں۔۔۔۔؟'' اداکار کے اندر کا بچہ اس جملے سے جس قدر خوش ہوتا ہے اُس کا اندازہ اُس کے چہرے کی سرخی سے بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ''کچھ تو خیال کرو۔۔۔۔ چار بچے کم ہیں جو اُن کے باپ کو بچہ بنانے چلی ہو۔۔۔۔ کوئی سنے گا تو کیا کہے گا۔۔۔۔؟'' اداکارہ کولہوں کے بل دونوں گھٹنے جوڑ کر بیٹھتے ہوئے کہنی سے ٹوہکا دے کر ''جی جناب۔۔۔۔ بچہ۔۔۔۔ ایک بار نہیں جتنی بار کہیں گے۔۔۔۔ جس کے سامنے بھی کہیں گے۔۔۔۔ میں آپ کو بچہ کہنے پر تیار ہوں۔۔۔۔ وہ بھی سب سے چھوٹا۔۔۔۔!'' جھوٹ موٹ کے احتجاج کے انداز میں اداکار کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہتا ہے۔ اداکارہ بایاں ہاتھ اس کے منہ پہ رکھ کر ''فریب کھانے کو ہر گھڑی جو تیار ہو۔۔۔۔ محبت کا ہر وقت طلب گار ہو۔۔۔۔ جس کے آگے کبھی باغ سارا ہیچ۔۔۔۔ کبھی ننھی کلی پہ مرمٹنے کو تیار ہو۔۔۔۔ جس کے لیے پلاؤ پکاؤ تو چٹنی کی تمنا کرے۔۔۔۔ قورمہ بناؤ تو دال کی آرزو ستائے۔۔۔۔ کھیر دستیاب ہو تو مٹھائی کو آواز دے۔۔۔۔ مٹھائی مل جائے تو گڑ کی تلاش میں مارا مارا پھرے۔۔۔۔ سب کچھ ایک ساتھ مل جائے تو اُن سے محروم لوگوں کا نوحہ شروع کر دے۔۔۔۔ بھیڑ میں ہو تو تنہائی کو پکارے۔۔۔۔ تنہائی میسر ہو تو یادوں کے زخم کھرچ کر ناسور بنالے۔۔۔۔ ایسے شخص کو آپ بڑوں میں شمار کرتے ہیں۔۔۔۔؟'' اس بار ہدایتکار نے اداکارہ کی بجائے اسے خاموش اداکاری کا موقع فراہم کیا تھا جسے اُس نے نہایت جذباتی انداز میں نبھا کر ایک بار پھر سے اداکارہ کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔

''امر کہانی'' کی تکمیل کے دوران یوں لگتا تھا کہ ہدایتکار یہ خاص فلم اداکارہ کی شخصیت کو بامِ عروج پر پہنچانے کے لیے بنا رہا ہے۔ اداکار جس کو نوجوانی میں ایکٹنگ کرنے کا شوق جنون کی حد تک تھا اوائل عمر میں ہدایتکار نے فلش بیک کے ذریعے اُس کی قلم اور کتاب میں دلچسپی دکھائی ہے۔ وہ فلم دیکھنے والوں کو یہ سبق دینا چاہتا ہے کہ تم جس چیز کی طلب کرتے ہو اُسے ہی زندگی کا مقصد بنا لیتے ہو۔ حالانکہ آنے والے وقت میں اُس سے بھی اچھے مواقع تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائے تمہارے منتظر ہوتے ہیں۔ آگے چل کر ہدایتکار نے فلم میں اداکار کی شہرت وشناخت قلم وکتاب کے ذریعے دکھائی ہے۔ اس سیکونس میں پلڑا اداکارہ کا اس طرح بھاری رکھا گیا ہے کہ گھر آنے والے ادبی مہمان اور مختلف اوقات میں اُن کے اعزاز میں برپا محفل مشاعروں میں اداکارہ کے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانے اور پکوان اداکار کے قلمی کمالات سے زیادہ داد سمیٹ لیتے ہیں۔ اداکار اکثر یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ حاصل کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے اُس میں اُس کی کوشش کو ثانوی حیثیت دے کر ہدایتکار اُس کے ساتھ زیادتی پر کیوں تُل جاتا ہے۔

ہدایتکار نے چونکہ ''امر کہانی'' کی بنیاد معاشرتی مسائل پر استوار کی ہے اس لیے اب وہ دونوں ساتھی اداکاروں کے بڑھتے ہوئے بچوں کے مناظر فلمانا چاہتا ہے۔ ایک منظر میں بڑا بیٹا جس کی مسیں بھیگ چکی ہیں باپ سے بائیک خریدنے کی فرمائش کرتا ہے۔ جواب میں باپ فضول خرچی پر لیکچر دیتے ہوئے بیٹے کو اس خواہش سے باز رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ بیٹے کے منظر سے آوٹ ہوتے ہی اداکارہ گلہ مند ہوتی ہے ''ایسی بھی کیا بچت کہ انسان چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر دل مسوس کے رہ جائے۔۔۔۔!'' ہدایتکار کی ہدایت کے مطابق اداکار خوشگمیں نظروں سے اداکارہ کی جانب دیکھتے ہوئے ''بائیک تم نے چلانا ہے کیا۔۔۔۔؟'' ''میں چلاؤں یا میرا بیٹا چلائے بات تو ایک ہی ہے۔۔۔۔!'' اداکار زچ ہوکر ''تم تو اس طرح اُس کی طرف داری کر رہی ہو جیسے میں اُس کا کچھ نہیں لگتا۔۔۔۔ بیٹا جہیز میں لے کر آئی ہو کیا۔۔۔۔؟'' اداکار اپنے حصے کے مکالمے ادا کر کے فریم سے آوٹ ہونے لگتا ہے۔ اداکارہ پیچھے سے اُس کا ہاتھ تھام کر کہتی ہے ''جہیز میں تو میں صرف اپنا چھوٹا اور لاڈلا بچہ لے کر آئی ہوں۔۔۔۔!''

ایک اور منظر میں منجھلے بیٹے کو باپ سے سمندر پار پڑھائی کی غرض سے جانے کی ضد کرتے دکھایا گیا ہے۔ اداکارہ اُمید وبیم کی کیفیت میں اداکار کے چہرے کی جانب دیکھتی ہے۔ اداکار کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگتا ہے۔ وہ کسی قسم کا اختلافی ردِعمل ظاہر کیے بغیر بیٹے سے باہر جانے کی تفصیل اور اخراجات کی بابت دریافت کر کے فوری اجازت دے دیتا ہے۔ اداکارہ خوشی کو چھپاتے ہوئے بائیک والا قصہ یاد کرا کے اداکار کے فضول خرچی کے فلسفے کو دہرانے لگتی ہے۔ اداکار اُسے سمجھاتا ہے کہ فضول خرچی ایک بہانہ تھا۔ اصل میں نوجوان لڑکے کبھی کبھی بائیک کا غلط استعمال کرتے ہیں اس لیے اُس نے بیٹے سے خرچ کا بہانا کیا تھا۔

مشرقی گھرانوں میں تعلیم کی کمی کے سبب اکثر میاں بیوی کے

درمیان گھریلو معاملات پر ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے چپقلش رہا کرتی ہے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرا کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ نوبت کبھی تکرار' ہاتھا پائی اور کبھی علیحدگی تک جا پہنچتی ہے۔ ''امر کہانی'' کے ہدایتکار نے فلم کے اس پہلو پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے ایک منظر میں اداکارہ کو تعلیم کے لیے باہر گئے بیٹے کی یاد میں افسردہ دکھایا ہے۔ اداکار بیٹے کے روشن مستقبل کی طرف توجہ دلا کر بیوی کی دلجوئی کرتا ہے۔ دوسرے منظر میں اداکارہ کو اپنے شوہر کی خاطر مدارات اور خوش گفتاری کا مظاہرہ کرتے دکھایا گیا ہے۔ اداکار سبب دریافت کرتا ہے تو اداکارہ اس کی قمیص کے بٹن سے کھیلتے ہوئے بڑے بیٹے کا رشتہ کرنے اور چھوٹے بیٹے کی کمی کو بہو سے پورا کرنے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے۔ اداکار سیانی بیٹی کی موجودگی میں بیٹے کے رشتے کی بات سن کر چونکتا ہے۔ وہ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہتا ہے کہ بیگم کے ذریعے اُس کے علم میں یہ بات لائی جاتی ہے کہ اداکار کا بیٹا ایک لڑکی کو پسند کرتا ہے۔ لڑکی بھی اُن کے بیٹے میں دلچسپی لے رہی ہے۔ اس طرح لڑکے کی ماں کا کردار نبھانے والی اداکارہ اُس کے باپ کو آمادہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

اگلے کئی مناظر میں ہلکی پھلکی بحث و تمحیص میں گزار کر ہدایتکار لڑکی والوں کے گھر کا منظر دکھاتا ہے۔ اس طرح وہ اداکارہ کی مہارت کو نمایاں کر کے مشرقی بیوی کی معاملہ فہمی کو اجاگر کرنا چاہتا ہے۔ جب منگنی کے منظر کی تیاری ہونے لگتی ہے تو ہدایتکار کو پھر سے اداکارہ کی عظمت و بڑائی یاد آ جاتی ہے۔ ایک منظر میں اداکارہ اپنی مرحومہ ساس کو یاد کر کے کہتی ہے ''اگر امی حیات ہوتیں تو بڑے پوتے کی دلہن کو اپنے ہاتھوں سے انگوٹھی پہنا کر کس قدر خوش ہوتیں۔۔۔۔!'' اداکار چونکہ اپنی والدہ کی شفقت و محبت سے والدین میں علیحدگی کے باعث محروم رہا ہے اس لیے بیگم کی بات پر خاموشی کے ذریعے اپنا ردِعمل ظاہر کرتا ہے۔ اداکارہ صورت حال بھانپ کر فوری طور پر اداکار کی بڑی بہن جنہیں اداکار بہن سے زیادہ ماں کا احترام دیتا ہے ہونے والی بہو کو اُن کے ہاتھ سے انگوٹھی پہنانے کی بات کر کے ماحول کو خوشگوار کر لیتی ہے۔ اس طرح اس سماجی اور معاشرتی فلم میں رقص و موسیقی کی ایک بار پھر گنجائش نکل آتی ہے۔

اس کے بعد کے منظر میں اداکارہ بیٹے کی منگنی کی خوشی فراموش کر کے بیٹی کے رشتے کی فکر میں ہلکان دکھائی گئی ہے۔ اسی منظر کے اگلے حصے جسے فلمی زبان میں شاٹ کہا جاتا ہے اداکار کے ایک رشتے دار نمایاں ہوتے ہیں۔ اِدھر اُدھر کی رسمی باتوں کے بعد وہ اداکار سے بیٹی کے رشتے کی بابت دریافت کرتے ہیں۔ جواب میں باری باری دونوں میاں بیوی بیٹی کی اعلیٰ تعلیم کو موزوں و مناسب رشتہ نہ ملنے کا سبب گردانتے ہیں۔ اسی منظر کے اگلے شاٹ میں رشتے دار کے حوالے سے کچھ لوگ لڑکی کو دیکھنے آتے ہیں۔ ان لوگوں کو رشتے دار کی کوشش کے ردِعمل میں لڑکے والوں نے ابتدائی معلومات کے لیے بھیجا ہے۔ آپ چاہیں تو اسے اتفاق کا نام دے سکتے ہیں مگر اداکار کے خیال میں ہدایتکار کی چال یا کم از کم پلاننگ کے تحت آنے والا خاندان اداکارہ کا پرانا شناسا اور محلے دار نکل آتا ہے۔ اسی منظر کے اگلے حصے میں مذکورہ خاندان کو لڑکے والوں کے گھر میں اداکارہ کی خوبیاں گنوا کر یہ کہتے ہوئے دکھلایا گیا ہے ''اس سے اچھا رشتہ تمہیں چراغ لے کر بھی ڈھونڈو تو نہیں مل سکتا۔۔۔۔!'' ایک منظر قبل ماں' باپ' بیٹا مل کر بیٹے اور بھائی کی شادی کی تیاری میں مصروف دکھائے گئے ہیں۔ جس کے لیے شادی کے مقام کی بکنگ بھی ہو چکی ہے۔ اچانک لڑکے والوں کے آ دھمکنے سے گھر کے اندر ایک کے بجائے دو شادیوں کی گہما گہمی شروع ہو گئی ہے۔ اسی منظر سے جڑے اگلے منظر میں تعلیم کے لیے باہر گئے بیٹے کو واپس آ کر بھائی بہنوں کی شادی میں مصروف دکھایا گیا ہے۔ ہدایتکار چونکہ طوالت کے خوف کا شکار ہے اس لیے شادی بیاہ کے مناظر کو اختصار سے فلمایا گیا ہے۔ فلم کے تقاضوں اور تماشائی کی دلچسپی کے پیشِ نظر تھوڑا بہت گانا بجانا اور ہلڑ بازی خوش اسلوبی سے فلم بند کی گئی ہے۔ ہدایتکار کی مہربانی سے دونوں شادیوں کا سارا کریڈٹ فلم کے ساتھی اداکار' اداکارہ کی خوش نصیبی' خوش اخلاقی اور گھڑا پے کو دیتے دکھائے گئے ہیں۔ ہدایتکار کے اشارے پر چند لفظی خراجِ تحسین کے ٹکڑے بھی اس منظر کے اختتام میں شامل کیے گئے ہیں۔

لڑکی والوں کے گھر سے رخصتی کے فوری بعد جسے فلم والے کٹ ٹو کٹ کہتے ہیں لڑکے والوں کا گھر دکھایا گیا ہے جہاں نوجوان لڑکے لڑکیاں دولہا' دلہن کا راستہ روکے کھڑے ہیں۔ دونوں طرف سے لین دین پر تکرار جاری ہے۔ دلہا جیب میں ہاتھ ڈال کر بے بسی سے ماں کی طرف دیکھتا ہے تو وہ فوری طور پر آگے بڑھ کر شوہر کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے مطلوبہ رقم ادا کرنے کا حکم دیتی ہے۔ ایک لمحے کو شوہر' بیوی کے اس انداز پر حیران ہوتا ہے۔ موقعہ کی نزاکت کے زیرِ اثر جیب سے پرس نکال کر دلہا' دلہن کو رہائی دلواتا ہے۔ اس منظر سے جڑے منہ دکھائی کے منظر میں اداکارہ اپنے زیورات سے ایک سیٹ نکال کر دلہن کو منہ دکھائی میں دیتی دکھلائی گئی ہے۔ یہاں بھی اداکار بیوی کے اسرار پر بہو کو بڑی رقم منہ دکھلائی میں دیتا نظر آتا ہے۔

آپ نے اس سے قبل بہت سی سماجی اور معاشرتی کہانیوں پر مبنی فلمیں دیکھی ہوں گی ان فلموں کے فلم ساز و ہدایتکار قدم قدم پر تماشائی کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔ ''امر کہانی'' کا ہدایتکار فلم نگر کا سب سے بڑا اور مشاق ہدایتکار ہے۔ اُس کے کریڈٹ پر ان گنت اور لاتعداد کامیاب فلموں کے نام جگمگا رہے ہیں۔ وہ بھلا کیوں۔۔۔۔؟ اپنی اس انوکھی' نرالی فلم میں تماشائیوں کے جذبات سے نہ کھیلتا۔۔۔۔!

شادی' ولیمہ' چوتھی' چالے' دعوتوں اور ملاقاتوں کے کئی مناظر کے بعد اداکار و اداکارہ کو مضمحل دکھانا فطری امر تھا۔ ہدایتکار نے خدا معلوم کہانی کے اندر کیا کیا ٹرننگ پوائنٹ رکھے ہوئے تھے کہ خوشی کے مناظر کے فوری بعد اداکارہ کو آہستہ

آہستہ بیمار اور کمزور دکھایا جانے لگا۔ میک اپ مین خصوصی طور پر اُس کی آنکھوں' گالوں' گردن میں نقاہت اور کمزوری کے گڑھے ہر منظر میں پہلے سے زیادہ گہرے اور نمایاں کرنے میں مصروف تھا۔ فلم کے اندر دونوں اداکاروں کے عزیزوں' رشتہ داروں' پڑوسیوں اور دوستوں میں اکثر کو اداکارہ کی گرتی ہوئی صحت پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے دکھلایا گیا ہے۔ کوئی اسے بیٹی کی جدائی سے تشبیہہ دیتا ہے۔ کوئی بیٹے کی دُوری کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ اتنی ہمت کسی میں نہیں کہ آگے بڑھ کر ہدایتکار سے دریافت کرے کہ فلم کے اگلے منظر کے لیے اُس کے ذہن میں کیا پلاننگ ہے یا یہ کہ اُس نے کہانی میں آگے کیا کچھ لکھوایا ہوا ہے۔ اوروں کو چھوڑیئے۔۔۔۔! کم از کم اداکارہ کا یہ حق بنتا تھا کہ ہدایتکار سے اپنے مستقبل کی بابت دریافت کرے۔۔۔۔! وہ بھلی مانس روبوٹ کی مانند ہدایتکار کے اشاروں پر اس طرح ناچ رہی تھی جیسے وہ جیتی جاگتی' چلتی پھرتی جاندار چیز کے بجائے بے جان کٹھ پتلی ہو۔

ہدایتکار نے ''امر کہانی'' کے اندر اداکار کو تلخ تجربات سے گذار کر حقیقت پسند انسان دکھلانے کی کوشش کی ہے جو بظاہر اپنے فیصلوں میں مضبوط اور اٹل دکھائی دیتا ہے مگر اندر سے موم کی مانند نرم اور ربر کی طرح لچکیلا ہے۔ یوں جان لیجیے! اُس کی حیثیت اڑیل ٹٹوں کی سی ہے جو مالک کی ڈانٹ' پھٹکار کے بجائے ہلکی سی پچکار سے دُلکی چلنے پر آمادہ رہتا ہے۔ فلم کے اس منظر میں اداکار کو بیوی کا کردار نبھانے والی اداکارہ کو اس کا وعدہ یاد دلاتے ہوئے دکھایا گیا ہے جو اُس نے شادی سے قبل اپنی بیوی سے لیا تھا۔ اداکار کے خیال میں خاندان کا تصور میاں بیوی اور اُن پر انحصار کرنے والے بچوں پر مشتمل ہے۔ بڑے اور شادی شدہ بچوں کا اپنا الگ خاندان جسے آج کے دور میں نیوکلیئر فیملی کہا جاتا ہے ہونا ضروری ہے۔ وہ بیٹے کی شادی پر اسی شرط کے ساتھ آمادہ ہوا تھا۔ اداکارہ خاوند کی بات سن کر اس طرح سہم جاتی ہے جیسے اُس نے زہریلا سانپ دیکھ لیا ہو جو اُس کی جانب پھن پھلائے ڈسنے کے لیے آمادہ ہو۔ ایسے بہت سے مواقعوں پر وہ شوہر سے ہنسی' مذاق کر لیا کرتی تھی مگر اس بار وہ دیر تک شوہر کے چہرے کو خاموشی سے تکنے کے بعد آہستہ سے گویا ہوئی۔ ''بہت دنوں کے بعد بہو کی آمد سے گھر کا سُونا پن دُور ہوا ہے' ابھی سے۔۔۔۔!'' اس منظر میں اداکار کے ذمے اداکارہ کی گرتی صحت کے پیشِ نظر اُسے خوش رکھنا مقصود ہے لہٰذا بیٹا اور بہو کے دو سے تین ہونے تک علیحدگی کا پروگرام ملتوی کر دیا جاتا ہے۔

ہر چند اگلے مناظر میں بہو کا پیر بھاری ہونے کی خوشی میں بیٹی داماد کی آمد کھانا پینا اور ہلّہ گلّہ کے کئی چھوٹے چھوٹے مناظر دکھائے گئے ہیں مگر اداکارہ پہلے کی طرح خوش دکھائی دیتی ہے نہ کھانے پینے کو اُس کا جی چاہتا ہے۔ جب بھی اداکار یا دوسرے ساتھی اداکار اُس کی اس کیفیت کا سبب دریافت کرتے ہیں تو وہ بے دلی سے لاعلمی کا اظہار کرتی ہے۔ ایک تبدیلی اداکار کو ساتھی اداکارہ کے اندر یہ محسوس ہوئی کہ وہ پہلے کی نسبت زیادہ وقت اُس کے ساتھ گزارنے کو ترجیح دینے لگی ہے۔ کام کے علاوہ وہ جب بھی گھر سے باہر جاتا ہے تو خلافِ توقع اُس کے ساتھ جانے پر اصرار کرتی ہے۔ اداکار کا خیال بھی پہلے کی نسبت زیادہ رکھنے لگی ہے۔ سیٹ پر موجود ساتھی اداکاروں کو بھی ہر وقت اداکار کے حوالے سے ہدایت دیتی نظر آتی ہے۔ ساس کی خواہش کے احترام میں بہو کا کردار نبھانے والی اداکارہ ہمیشہ ایک پیر پر کھڑی دکھائی گئی ہے جو ساس' سسر کی ہر آواز پر خوش دلی سے لبیک کہنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ بہت دنوں سے اداکارہ نے یہ وطیرہ اپنا لیا تھا کہ وہ اداکار کو سیٹ کے اندر موجود اُس کے کمرے تک باقاعدگی سے چھوڑنے جاتی اور موسم کے لحاظ سے چادر' کمبل یا رضائی اُڑھانے کے بعد ہاتھ ملا کر شب بخیر ضرور کرتی۔ اداکار اکثر اُس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتا ''ایک زمانے سے تم بچوں اور میں کتابوں کے ساتھ سو رہے ہیں۔ اب بڑھاپے میں یہ چونچلے اچھے لگتے ہیں کیا۔۔۔۔؟'' اداکارہ جواب میں پہلے کی طرح اٹھلاتی' شرماتی' مسکراتی نا ہمیشہ کی مانند اداکار کے گال پر چٹکی لیتی' خوابیدہ آواز میں دھیرے سے اتنا کہنے پر اکتفا کرتی ''جب تک ہیں تب تک کرنے دیں۔۔۔۔!''

خوشی کا یہ منظر پہلے پوتے کی پیدائش پر فلمایا جا رہا ہے۔ بیٹا بہو کو لے کر کمرے میں داخل ہوتا ہے جس کی گود میں نومولود بچہ آنکھیں موندے دنیا مافیہا سے بے خبر پڑا ہے۔ اداکارہ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی۔ بچے کی آنکھ' ناک' کان سرسری نظر سے دیکھ کر ہو بہو اُسے اداکار کا ہم شکل ٹھہرا رہی ہے۔ آج اُس کی آواز اور انداز گئے دنوں کی مانند شوخ نظر آ رہے ہیں۔ خوشی کے ان لمحات میں اداکارہ چونک کر پلٹتی ہے جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی ہو۔ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی بیڈ سے ملحقہ اسٹور میں جاتی ہے۔ واپسی پر ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ڈبہ لے کر نمودار ہوتی ہے۔ اُس ڈبے سے سونے کی ننھی مُنی انگوٹھی نکال کر اپنے ہاتھ سے بچے کو پہنانے لگتی ہے۔ پھر کچھ سوچ کر رُک جاتی ہے۔ اداکار کا ہاتھ پکڑ کے اپنے قریب کرتے ہوئے ''آپ پہنایئے نا۔۔۔۔!'' اداکار کے انگوٹھی پہنانے کے بعد اُسی جوش جذبے سے ''آپ بھی تو جیب ڈھیلی کیجیے۔۔۔۔!'' اداکار جیب میں ہاتھ مارنے کے بعد پیسے نہ ہونے کا عذر کر کے جان چھڑانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اداکار کو گھر میں رکھے مالی سرٹیفکیٹ یاد دلاتی ہے۔ اداکار سرٹیفکیٹ کی بڑی مالیت کا ذکر کر کے اپنے تحفظات کا اظہار کرتا ہے تو شوخی پر اتر آتی ہے۔ ''آپ تو بڑے دل والے ہیں' پہلے پوتے کی پیدائش پر تحفہ بھی بڑا ہونا چاہیے۔۔۔۔!'' اداکار اُس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے سرٹیفکیٹ لانے کا کہتا ہے اور دعاؤں کے ساتھ بہو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بچے کی گود میں سرٹیفکیٹ رکھ دیتا ہے۔ اداکارہ خوشی سے ایک بار پھر چونکتی ہے۔ اس بار اپنے کمرے کی الماری سے کیش کا ڈبہ نکال کر چند بڑی مالیت کے کرنسی نوٹ بیٹے کی جانب یہ کہہ کر بڑھاتی ہے کہ شہر کی سب سے بڑی اور مشہور دکان پر جائے اور ڈھیر ساری مٹھائی کا آرڈر دے کر آئے۔ بیٹے کے قدم بڑھانے سے قبل اُسے مٹھائی کی قسم' مقدار اور ڈبوں کی تعداد کی بابت بھی تاکید کرتی ہے

جنہیں عزیزوں اور دوستوں میں تقسیم کرنا مقصود ہے۔

فلم بینوں کو یکسانیت سے بچانے کے لیے ہدایتکار نے اگلا منظر شہر کی مشہور شاہراہ پر فلم بند کیا ہے۔ اداکارہ فرنٹ سیٹ پر اداکار کے ساتھ چلتی ہوئی گاڑی میں بیٹھی ہے جبکہ سب سے چھوٹا بیٹا بیک سیٹ پر ویڈیو گیم کھیلنے میں مگن ہے ''ہاں جی بیگم صاحبہ! اب تو وعدہ وفا کرنے میں کوئی اڑچن باقی نہیں رہی۔۔۔۔؟'' اداکارہ گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے ''کون سا وعدہ۔۔۔۔؟'' ''وہی نیوکلیئر فیملی والا۔۔۔۔ پھر ہم تم ہونگے بادل ہوگا۔۔۔۔!'' شوخی سے اداکارہ کا ہاتھ دبا کر جملہ مکمل کرتا ہے۔ ''مجھے کوئی وعدہ یاد نہیں۔۔۔۔!'' بیگانگی سے جملہ ادا کرتی ہے۔ ''یہ تو سراسر زیادتی کر رہی ہو تم۔۔۔۔!'' ''اور آپ کیا کر رہے ہیں' کیا اس گھر پر میرا کوئی حق نہیں۔۔۔۔؟'' اداکار نیا استدلال پیش کرنے کے بجائے اداکارہ کی ہاں میں ہاں ملا کر کہتا ہے ''کیوں نہیں' گھر ہوتا ہی گھر والی کا ہے۔۔۔۔!'' ''بس تو فیصلہ ہوگیا۔۔۔۔!'' ''نہ کوئی الگ ہوگا نہ آئندہ اس موضوع پر کوئی بات ہوگی۔۔۔۔!'' اداکار نے زندگی میں پہلی بار اس طرح کا دوٹوک انداز اختیار کیا تھا جس پر اُسے ندامت کا احساس ہوتا ہے۔ اداکار کے گال پر چٹکی لیتے ہوئے وہ اُس کے دل کی بات جاننا چاہتی ہے ''ہیں۔۔۔۔ ٹھیک ہے نا۔۔۔۔ آپ ناراض تو نہیں۔۔۔۔؟''

چونکہ ہدایتکار کہانی کے پھیلاؤ سے کافی پریشان دکھائی دیتا ہے اس لیے اگلے منظر کی ابتداء بیٹی کے گھر بیٹے کی پیدائش کی اطلاع سے کرتا ہے۔ ہر چند اداکارہ اس خبر پر خوشی کا اظہار کرتی ہے۔ بیٹی کے گھر جانے کے لیے خریداری کی تفصیل بھی گنواتی ہے مگر پوتے کی پیدائش والی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کرتی۔ بیٹی چونکہ اداکار کی لاڈلی اور دوست دکھائی گئی ہے اس لیے وہ اداکارہ کو ٹہوکا دیتے ہوئے کہتا ہے ''اب اٹھو بھی' مٹھائی وغیرہ کا بندوبست کرو' کوئی ہلّہ گُلّہ' شور شرابا' کوئی پارٹی وغیرہ کا انتظام کرو۔۔۔۔!'' حیرانی سے اداکار کا منہ دیکھتے ہوئے ''کبھی کبھی آپ بچوں کی طرح باتیں کرتے ہیں اور جب میں آپ کو بچہ کہتی ہوں تو بُرا مان جاتے ہیں۔۔۔۔ بندہ خدا۔۔۔۔! کبھی لڑکی والے بھی اس طرح کرتے ہیں۔۔۔۔؟ جن کے گھر پوتا ہوا ہے وہ جانیں' اُن کی مرضی وہ جو چاہیں کریں۔۔۔۔ ہمارا جو فرض ہے وہ ہم پورا کریں گے۔۔۔۔!''

اس منظر اور اس سے قبل کے مناظر میں ہدایتکار نے اداکارہ اور اُس کی بہو کے درمیان عمدہ تعلقات دکھا کر فلم کو سبق آموز بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ ہمیشہ ساس' بہو ایک دوسرے سے کام کہنے کے بجائے ہر منظر میں یہ کہتے دکھائی گئی ہیں ''تم رہنے دو میں کرلوں گی' آپ رہنے دیں میں کرلوں گی۔'' ان مناظر کے درمیان پوتے کا کردار نبھانے والے ننھے اداکار کو کھیلتے کُودتے اور توتلی زبان میں گھر کی ہر چیز پر حق جتاتے ہوئے دکھلایا گیا ہے۔ اداکارہ ان مناظر میں بچے کی شوخی اور شرارت دیکھ کر اداکار کو اکثر چھیڑتی ہے ''لیں کرلیں الگ۔۔۔۔ بنا لیں نیوکلیئر فیملی۔۔۔۔ قدرت نے اصل حقدار بھیج کر اپنا فیصلہ سُنا دیا ہے۔۔۔۔!''

اگلے مناظر میں چھوٹے موٹے گھریلو مسائل کے ساتھ اداکارہ کی بیماری' ڈاکٹرز اور لیبارٹریز میں آرجاز بیٹی داماد اور باہر والے بیٹے کی آمدورفت کے درمیان دوسرے پوتے کی پیدائش بھی دکھلائی گئی ہے جس کی خوشی پہلے پوتے کی نسبت چھوٹے پیمانے پر مناتے دکھایا گیا ہے۔ اسی منظر کو آگے بڑھاتے ہوئے مختلف شاٹس میں ہدایتکار نے دوسرے پوتے کو بڑا ہوتے اور جگہ جگہ شرارتیں کرتے بھی دکھلایا ہے۔ بڑا پوتا گھر اور اُس کی چیزوں پر حق جماتا تھا جبکہ چھوٹے نے دادی کو ماما اور دادا کو ڈیڈی کہہ کر اُن پر قبضہ کرلیا ہے۔ اکثر اُس کی اپنے باپ سے توتلی زبان میں تکرار دکھائی گئی ہے جس میں باپ کہتا ہے ''یہ میرے ڈیڈی ہیں۔۔۔۔ یہ میری ماما ہیں'' جواب میں بچہ یہی الفاظ دہرا کر باپ سے لڑتا دکھایا گیا ہے۔ بڑے کی نسبت چھوٹا زیادہ کیوٹ' شرارتی بلکہ لڑاک بھی ہے۔ بات بات پر ہر کسی سے لڑنے کو تیار رہتا ہے۔ دادی اکثر اداکار کو مخاطب کر کے کہتی ہے ''اس ٹنڈے کو باز کرالیں ورنہ میں اسے ایک ٹکا دوں گی۔۔۔۔'' چھوٹا پوتا توتلی زبان میں وہی الفاظ دادی پر دہراتا ہے۔ اداکار جواب میں کہتا ہے ''یہ میرا نہیں تمہارا ٹنڈا ہے۔۔۔۔ تم جانو یہ جانے۔۔۔۔!'' اداکارہ کے چہرے پر نامعلوم کہاں سے پرانی شوخی اور شرارت اُمڈ آتی ہے ''رہنے دیں۔۔۔۔ رہنے دیں۔۔۔۔ آپ جتنے بھی بڑے اداکار ہوں۔۔۔۔ اس وقت آپ کا چہرہ۔۔۔۔ آپ کے جھوٹ کا ساتھ نہیں دے رہا۔۔۔۔!'' پھر وہ گرم جوشی سے اداکار کا سیدھا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام کر دریافت کرتی ہے ''سچ سچ بتائیں۔۔۔۔ آپ دل سے الگ کرنا چاہتے تھے بیٹا اور بہو کو۔۔۔۔؟'' اداکار چہرے پر مصنوعی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بودی آواز میں ''اب کیا اسٹامپ لکھ کر دوں۔۔۔۔!''

اس منظر میں پچھلے مناظر کی نسبت اداکارہ کی صحت کو میک اپ کی ذریعے زیادہ خراب دکھلایا گیا ہے جس کے سبب اداکارہ پہلے سے زیادہ کم گو' سنجیدہ اور اُداس دکھلائی گئی ہے۔ ہدایتکار کو منظر کے خشک اور بے کیف ہونے کا اندازہ ہوگیا ہے اسی لیے اُس نے ٹیلی فون کے ذریعے نواسی کی پیدائش کی خبر سنوائی ہے۔ پورا سیٹ اور سیٹ پر موجود اداکار' معاون اداکار خوشی کی خبر سن کر ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے دکھائے گئے ہیں۔ ساتھی اداکاروں کی نسبت اداکارہ کا ردِعمل زیادہ پُرجوش دکھایا گیا ہے۔ اسی منظر کے اگلے شاٹ میں اداکارہ کو بیٹی کے گھر جانے کی تیاریوں میں مصروف دکھایا گیا ہے۔ طرح طرح کے ننّھے منّے کپڑے' کھلونے اور دیگر سامان بھی نمایاں ہے۔ بن دیکھی نواسی کی نسبت اداکارہ کا پُرجوش رویہ' اداکار کے لیے ایک طرح سے نیا تجربہ ہے۔ ''ہم تو مفت میں مارے گئے' تم تو پیدائشی نانی' دادی نکلیں۔۔۔۔!'' اس بار پھر اداکار کے گال کی شامت کے ساتھ اداکارہ نے بھولی بسری شوخی کو کام میں لاتے ہوئے ''کیوں نہ ہوں۔۔۔۔ اتنے بڑے بڑے بچّے جو پالنے ہیں۔۔۔۔!''

لگتا ہے ''امر کہانی'' تکمیل کے مراحل میں داخل ہوگئی ہے۔ آج کا منظر فلماتے ہوئے ہدایتکار کا رویہ قطعی اجنبی اور بیگانگی کا مظہر ہے۔ وہ نہ پہلے کی طرح تکنیک کاروں اور اداکاروں سے خوش اخلاقی سے پیش آرہا ہے نہ اُن کا حال احوال دریافت کر رہا ہے۔ مشینی انداز میں ہسپتال کے بڑے سیٹ پر بہت سے ڈاکٹروں' نرسوں اور وارڈ بوائے کو رسمی ہدایت دیتے ہوئے کمپیوٹرائز ڈ مشین پر کھڑے ڈاکٹر کو ''ایکشن'' کہہ کر اداکارہ کے پیٹ کی فلم بنانے کی ہدایت کرتا ہے۔ دوسرے شاٹ میں اداکارہ کے شوہر اور بڑے بیٹے کا کردار ادا کرنے والے اداکاروں کو اشاروں سے پریشانی کی اداکاری کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ اسی منظر کے تیسرے شاٹ میں وہی ڈاکٹر اداکار کو اندر بلا کر دھیمی آواز میں کچھ اس انداز میں گفتگو کرتا ہے کہ تمام تر گفتگو اداکارہ کے شوہر کا کردار نبھانے والے کردار اور ڈاکٹر کے درمیان ہی سنی جاسکتی ہے۔ آخری شاٹ میں تینوں اداکار یعنی ماں' باپ اور بیٹا گاڑی میں بیٹھے گھر کی جانب جاتے دکھائے گئے ہیں۔ دوسری سواری میں بیٹھا ہدایتکار اداکار کے چہرے کے کلوز پر منظر کا اختتام کرتا ہے جس پر پریشانی اور افسردگی چھائی ہوئی ہے۔

یہ منظر کئی چھوٹے چھوٹے مناظر پر مشتمل ہے۔ جس میں مرکزی اداکار و اداکارہ کے علاوہ تمام بیٹے' بہو اور پوتوں کا کردار نبھانے والے ننھے اداکار بھی نمایاں دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ مناظر شہر کے مختلف بازار' پارک' ریستوران' ہوٹلز اور فوڈ اسٹریٹ میں فلمائے گئے ہیں۔ ان مناظر میں اداکارہ کے ساتھی مختلف اقسام کے کھانے اور طرح طرح کے مشروب جو پہلے اداکارہ کے لیے منع تھے اصرار کے ساتھ اداکارہ کو کھلاتے پلاتے دکھائے گئے ہیں۔ اداکارہ خوش اور ساتھی اداکار خوش رہنے کی اداکاری بڑی ہنرمندی سے نبھا رہے ہیں۔

اس بار فلم کا سب سے بڑا اور ابھاری سیٹ لگایا گیا ہے۔ فلم کی پوری کاسٹ' عزیزوں رشتے داروں اور محلے داروں کا کردار ادا کرنے والے کئی نئے اداکار بھی مختلف مناظر میں دکھلائی دے رہے ہیں۔ ایک بڑے کمرے میں بہت سی کُرسیاں اور صوفہ سیٹ لگا کر لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ ہلکے نیلے پردوں کے سامنے بیڈ پر لیٹی مریضہ کی اداکاری کرنے والی اداکارہ کے دائیں بائیں دو میزیں بھی لگائی گئیں ہیں۔ دائیں طرف کی میز پر طرح طرح کے پھل' دودھ' مشروب نظر آرہے ہیں جبکہ بائیں طرف کی میز پر بہت ساری دوائیاں' انجکشن' ڈرپس اور سرنج وغیرہ سجا کر رکھی گئی ہیں۔ سامنے بڑی سکرین کے رنگین ٹی وی پر چلتی پھرتی تصویریں اور اداکارہ کے بازو میں لگی ڈرپ منظر میں حقیقت کا رنگ بھر رہے ہیں۔ اداکارہ کو مزید نڈھال اور کمزور دکھانے کے لیے میک اپ مین ابھی ابھی خاصی محنت کر کے گیا ہے۔ سنا ہے! جانے سے پہلے ہدایتکار سے کافی دیر اس بات پر الجھتا رہا کہ وہ اُسے کہانی کے انجام کی بابت واضح طور پر کیوں نہیں بتلا رہا۔ کچھ اُسی طرح کا اختلاف آرٹ ڈائریکٹر' لائٹ مین اور کیمرہ مین ہدایتکار سے پہلے ہی کر چکے ہیں۔ سیٹ پر موجود تمام اداکار مختلف مناظر میں ایک دوسرے سے ہدایتکار کے موڈ' مزاج اور میلان پر گفتگو کرتے دکھائے گئے ہیں۔ ہر کسی کو فلم کے اختتام کی بابت تجسس اور اشتیاق ہے۔ ہر کوئی اپنے اپنے رنگ اور ڈھب سے فلم کے انجام کی نسبت خیال آرائی کر رہا ہے۔ ہر کسی کو ہدایتکار کی خلاّقی اور کشادہ قلبی کا احساس ہے۔ ہر کوئی امید و یاس سے ہدایتکار کی جانب دیکھ رہا ہے مگر ہدایتکار تمام اداکاروں سے قطعی طور پر بیگانہ' اپنے کام میں منہمک و مصروف ہے۔

لائٹس' کیمرہ' ساؤنڈ اسٹارٹ ہوتے ہی ہدایتکار ''ایکشن'' کی آواز لگاتا ہے۔ سیٹ پر موجود سبھی اداکار اس کی ہدایت کے مطابق چہروں پر حزن و ملال اور مناجات کی کیفیت طاری کر لیتے ہیں۔ کچھ اداکارہ کا جی بہلانے کے لیے اُس کی جلد صحت یابی کی نوید سنا رہے ہیں۔ کچھ اُس کا سر دبا رہے ہیں۔ کچھ اُس کے پیر سہلاتے ہوئے مختلف قسم کا ورد کر رہے ہیں۔ جیسے ہی ڈاکٹر کا کردار نبھانے والا اداکار اپنے معاون اداکار کے ہمراہ فریم میں داخل ہوتا ہے تو سیٹ پر موجود تمام اداکار اور تکنیک کار سکھ کا سانس لیتے ہوئے ایک دوسرے کی جانب تشکر آمیز نظروں سے دیکھتے ہیں۔ سب کو اس بات کا یقین ہے کہ فلم نگر کا یہ عظیم ہدایتکار ہمیشہ کی مانند آج بھی کہانی کو نیا موڑ دے کر فلم کے انجام کو کسی نہ کسی شکل میں منفرد اور مثبت ضرور بنائے گا۔ ڈاکٹر کا کردار نبھانے والا اداکار جلدی سے اپنے معاون کو ہدایت دیتا ہے جو سرعت سے اپنے سینئر کی ہدایت کے مطابق اداکارہ کے بازو میں لگی ڈرپ میں رنگ برنگے ٹیکے ڈالنے لگتا ہے۔ ایک ٹیکہ ڈاکٹر اپنے ہاتھوں سے اداکارہ کے بازو میں لگانے کے بعد شفقت سے اداکارہ کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی خیریت دریافت کرتا ہے۔ اداکارہ سر کی جنبش سے بہتری کا اشارہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر دعاؤں کے ساتھ اجازت کا طالب ہوتا ہے۔ منجھلے بیٹے کا کردار نبھانے والا ڈاکٹر کا بیگ اٹھا کر اُس کے پیچھے پیچھے فریم سے باہر ہو جاتا ہے۔

رات بھیگتی جا رہی ہے۔ سناٹا بڑھتا جا رہا ہے۔ دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو رہی ہیں۔ ایک ایک کر کے مہمان اداکار دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو رہے ہیں۔ بڑے بیٹے کا کردار نبھانے والا اداکار بچوں کی اکتاہٹ اور پریشانی دیکھتے ہوئے بیوی اور بہن سے بچوں کو باہر لے جانے کے لیے کہتا ہے۔ دونوں مائیں اپنے اپنے بچوں کو باپ اور ماموں کے ساتھ مٹھائی اور چاکلیٹ کا لالچ دے کر باہر بھیج رہی ہیں۔ چھوٹے بیٹے کو بڑا بیٹا اور چھوٹی بچی کو سب سے چھوٹا بیٹا گود میں اٹھا کر دوسرے دونوں بچوں کی انگلیاں تھامے جیسے ہی باہر کا رخ کرتے ہیں بیماری اور نقاہت کی اداکاری سے پُور پلنگ پر لیٹی اداکارہ' تمام تر قوت مجتمع کر کے بڑے بیٹے کو آواز دیتی ہے۔ بیٹا لپک کر ماں کے نزدیک ہو جاتا ہے۔ ماں آہستہ آہستہ سانس درست کرتے ہوئے ''کئی دنوں سے تمہارے ڈیڈی نے ڈھنگ سے کھانا نہیں کھایا۔۔۔۔ اُن کی پسند کی مٹھائی ضرور لے کر آنا۔۔۔۔!'' بیٹا ماں کے حکم کی اطاعت میں ''جی اچھا'' کہہ کر باہر نکل جاتا ہے۔

اور راتوں کی مانند ہدایتکار نے اس منظر میں رات کو بہت طویل اور

تھکا دینے والی رات بنا دیا ہے۔ اداکارہ تکلیف کی شدت سے چُور بستر پر کروٹیں بدل رہی ہے۔ اداکار اپنے حصے کا کردار جذباتی انداز میں نبھاتے ہوئے وقفے وقفے سے اداکارہ سے اس کی ضرورت کی بابت دریافت کر رہا ہے۔ اداکارہ ہاتھ ملانے کی خواہش میں اُس کی جانب ہاتھ بڑھاتی ہے جسے اداکار پھرتی سے تھام کر اُس کی خواہش دریافت کرتا ہے۔ جواب میں اداکارہ اپنے ساتھی اداکار کا ہاتھ دبانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے نہایت دھیمی آواز میں حسرت سے کہتی ہے'' پاس بیٹھے رہیے۔۔۔۔ میرے قریب۔۔۔۔ بالکل قریب۔۔۔۔!''

رات ڈھلتی جا رہی ہے۔ وقتِ زوال شروع ہو رہا ہے۔ اداکارہ کے کراہنے کی آواز پر تمام ساتھی اداکار باہمی مشورے سے ڈاکٹر کو بلانے پر اتفاق کرتے ہیں۔ بڑا بیٹا ڈاکٹر کو فون کرنے کی غرض سے فریم سے آوٹ ہو جاتا ہے۔ اداکارہ ہڑبڑا کر نیند سے چونکتے ہوئے ساتھ بیٹھے اداکار کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے پانی' پانی کی صدا لگاتی ہے۔ اداکار تیزی سے پانی لانے کے لیے فریج کی جانب دوڑتا ہے۔ منجھلا بیٹا اُسی پھرتی سے باپ کے پیچھے لپکتا ہے۔ باپ بیٹے مل کر لیموں' چینی' نمک کا شربت بناتے ہیں۔ اداکار اپنے ہاتھوں سے گلاس اداکارہ کے منہ سے لگاتا ہے۔ اداکارہ جس کا کئی دن پہلے دانہ پانی اٹھ گیا تھا۔ غٹ غٹ شربت کا پورا گلاس پی کر کہتی ہے''مزا آ گیا۔۔۔۔!'' اداکار اُسے خاموش رہنے کی تاکید کرتے ہوئے گردن میں ہاتھ ڈال کر لٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ اتنے میں بڑا بیٹا اور شب خوابی کے لباس میں ملبوس ڈاکٹر نمودار ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر محبت کے ساتھ اداکار کو پیچھے ہٹاتے ہوئے آگے بڑھ کر اداکارہ کی نبض' دل کی دھڑکن اور آنکھوں کا معائنہ کرنے کے بعد اُجلت میں بیگ کھول کر کچھ تلاش کرنے لگتا ہے۔ اداکارہ کو سانس لینے میں دشواری کا سامنا ہے۔ اداکار سے اُس کی تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔ آگے بڑھ کر اُس کا ماتھا سہلاتے ہوئے اداکارہ کو سانس لینے میں مدد دینے کی کوشش کرتا ہے جس کے جواب میں اداکارہ کے منہ سے ہچکی کی آواز کے ساتھ لال رنگ کا ڈھیر سارا محلول برآمد ہوتا ہے۔ ڈاکٹر گھبراہٹ کے عالم میں بیگ بھول کر اداکارہ کی نبض اور دل کی دھڑکن ٹٹولنے لگتا ہے۔

گھر سے باہر بلیّوں کے رونے اور کتوں کے بھونکنے کی آواز کے ساتھ سیٹ پر موجود تمام اداکار چونک کر باہر کی جانب دیکھنے لگتے ہیں۔ اچانک تیز ہوا کے ساتھ بجلی چمکنے لگتی ہے۔ روشنی اور نور سے سارا سیٹ منوّر ہو جاتا ہے۔ سیٹ پر موجود تمام اداکار خوف سے تھر تھر کانپنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر اسی پوزیشن میں سر جھکائے ادب سے خاموش کھڑا ہے۔ کچھ دیر بعد سیٹ پر برپا کہرام سے چونک کر بوجھل قدموں کے ساتھ اداکار کی جانب بڑھتا ہے۔ چند بے ربط جملے ٹھہر ٹھہر کر' آہستہ آہستہ اداکار کے شانے تھپتھپاتے ہوئے ادا کر کے سیٹ سے باہر چلا جاتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ یہ فلم کا آخری منظر ہے۔ تمام اداکار رونے' پیٹنے اور آہ و بکا کی اداکاری میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں مصروف ہیں۔ ہر کوئی اپنے اپنے رنگ میں ہدایتکار سے گِلہ مند نظر آ رہا ہے۔ کوئی آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے' کوئی دامن پھیلاتے ہوئے' کوئی دونوں ہاتھوں کو شکول بناتے ہوئے گریہ وزاری کر رہا ہے۔

سیٹ کے ایک گوشے میں گم سم کھڑا اداکار' فلم کے اچانک اور حیران کن انجام پر دل گرفتہ بھی ہے اور دل گیر بھی۔ وہ غم' غصّہ' احتجاج کے تمام پیرائے اختیار کر ہدایتکار سے اپنے کردار کے ساتھ ناانصافی پر وہ سب کچھ کرنا چاہتا ہے جو ایک بڑے اداکار کو کرنا چاہیے۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔ ہدایتکار کی منشا کے مطابق حواسِ خمسہ پر اُس کا اختیار ختم ہو چکا ہے۔ وہ آہستہ' آہستہ خود کو اندھے کنویں میں گرتا محسوس کر رہا ہے۔ اُس کے اندر چھپا شوخ و چنچل بچہ اس سفر میں اُس کا ہمراہی بننے کے لیے قطعاً تیار نہیں۔ وہ بچہ اچانک نمودار ہو کر رونے اور گڑگڑانے کی اداکاری کرنے لگتا ہے۔۔۔۔ وہ بچہ۔۔۔۔ جسے بھوک بھی لگ رہی ہے۔۔۔۔ جسے نیند بھی آ رہی ہے۔۔۔۔ لمحہ لمحہ تنہائی بھی ڈستی جا رہی ہے۔۔۔۔ وہ رونا بھی چاہتا ہے۔۔۔۔ چیخنا۔۔۔۔ چلانا۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ آہ و بکا بھی کرنا چاہتا ہے۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ گہری نیند سے جگا کر۔۔۔۔ بے خبر سونے والی کو۔۔۔۔ اُس کے قول و قرار۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ ذمہ داریاں یاد دلا کر۔۔۔۔ ہدایتکار کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کرنے کے لیے۔۔۔۔ بے چین بھی ہے۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ بے قرار بھی۔۔۔۔!

ہدایتکار بچوں سے ہمیشہ محبت اور شفقت سے پیش آتا رہا ہے۔ اُس کے ایک اشارے پر اداکار کو اندھے کنویں سے برآمد کر کے بچے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غائب کر دیا جاتا ہے۔ ہدایتکار کی جانب سے اداکار کو تنبیہہ کی جاتی ہے کہ وہ ہدایتکار کی اس نادر و نایاب فلم میں' بچے کا نہیں۔۔۔۔ چار بچوں کے باپ کا کردار نبھا رہا ہے۔۔۔۔ فلم ختم نہیں ہوئی۔۔۔۔ فلم باقی ہے ابھی۔۔۔۔ اُس کا کردار بھی جاری ہے۔۔۔۔ بقیہ تمام فلم میں اُسے ہدایتکار کی مرضی و منشا کے مطابق۔۔۔۔ بچے کے بجائے۔۔۔۔ چار بچوں کے سنجیدہ اور بُردبار باپ کا کردار نبھاتے رہنا ہے۔۔۔۔!

اداکار جذبات سے مغلوب ایسی بھرپور اداکاری کرتا ہے جو اُس نے اس سے قبل شاید کبھی نہ کی تھی۔۔۔۔! وہ ایک شکست خوردہ انسان کی مانند جس کا کل اثاثہ لُٹ گیا ہو۔۔۔۔ قدم بڑھاتا ہوا۔۔۔۔ مختلف عمر کے چار جوان' نوجوان' نوعمر اور نوخیز بچوں اور اُن کے ننھے مُنے جگر گوشوں کو سینے سے لگا کر ہدایتکار کی ہدایت میں حقیقت کا رنگ بھرنے لگتا ہے۔۔۔۔ فضا میں سوگوار دھن کے تار بکھرنے لگتے ہیں۔۔۔۔ جن کی لَے پر ایک پُرسوز نغمہ اوورلیپ میں سنائی دے رہا ہے۔۔۔۔!

چاک دل' چاک جگر' چاک گریباں والے
مثلِ گُل آتے ہیں' مانندِ بہار آتے ہیں

☆

(ولیم شیکسپیئر اور علی سردار جعفری سے اظہارِ تشکر کے ساتھ)

رپورتاژ۔۔۔نگیں گُم گشتہ

طاہرہ اقبال (فیصل آباد)

(آخری قسط)

اگلی صبح میرٹ Marriet ریسٹ ہاؤس کے ڈائیننگ روم میں ناشتہ کرتے ہوئے ہمارے میزبان ہمارے لیے مختلف سیر گاہوں کو تجویز کرتے اور پھر خود ہی رد بھی کر دیتے۔

''سنار گاؤں'' لیکن وہاں ہے کیا' یہی کھنڈیوں پر کپڑے بنتی ڈھانچہ عورتیں گرد پھیلے ہوئے یہی دھان کے کھیت پانیوں سے گھرے ہوئے' بیٹھنے تک کو جگہ نہیں ہے۔ایسے گورے گورے بچے دیکھ کر جہاں بیٹھیں گے لوگ پیچھے لگ جائیں گے۔

نواب سلیم اللہ خان کا محل دیکھ لیں البتہ قلعہ لاہور اور مقبرہ جہانگیر کے سامنے اس کی کوئی وقعت نہیں ہے لیکن پھر بھی ہمیں کچھ تو دیکھنا چاہیے۔کیونکہ آج ہمارا ڈھاکہ میں آخری دن تھا اور شاید دوبارہ کبھی زندگی میں ہم نے اسے نہیں دیکھنا تھا۔

جس علاقے میں نواب سلیم اللہ خان کا محل تھا۔ وہاں پہنچنا عام دنوں میں ناممکن ہے لیکن آج چونکہ جمعہ ہے اور بنگلہ دیش میں جمعہ کی چھٹی ہوتی ہے۔اس لیے ہم پہنچ گئے۔انتہائی تنگ گلیاں جن میں سائیکل رکشہ' ہتھ ریڑھیاں اور جھومتے ہوئے نشئی بھرے تھے۔ہمارے اندرون لاہور کا منظر تھا۔محل جمعہ کی نماز کے وقفے کے لیے بند تھا' لیکن ناریل' الائچی کے درختوں میں گھرے احاطے میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ بوڑھی گنگا کے کنارے واقع محل کی عمارت تک پہنچنے کے لیے تقریباً پچاس ساٹھ سیڑھیاں چڑھنا پڑیں جن پر بیٹھے ہوئے لوگ پکنک کے موڈ میں آئے ہوئے تھے۔پینٹس پر بنیان پہنے لڑکے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے۔ ہماری طرف دیکھتے تو ان آنکھوں میں ناریل سی چکنی چمک میں کچھ اور شامل ہو جاتا۔شاید وہی Love اینڈ Hate والا رشتہ' کبھی اُمڈتا کبھی سمٹتا' سامنے گراؤنڈ میں ٹنٹ لگا کر بیسوؤں کرسیاں رکھی گئی تھیں جن پر کوئی نہ بیٹھا تھا اور سٹیج پر رکھے ڈائس پہ کھڑا ایک شخص بنگلہ زبان میں نواب سلیم اللہ خان کے حالاتِ زندگی اور کارناموں کو بیان کر رہا تھا' جس میں سے مسلم لیگ اور پاکستان کا لفظ بار بار سُنائی دیتا تھا' پتہ نہیں یہاں کا مؤرخ تاریخ کے اس رخ کو کس انداز سے لکھ رہا ہے۔تاریخ اپنے اینگلز اور پہلو تبدیل کیوں کرتی رہتی ہے۔مسلمات مشتبہات میں کیسے تبدیل ہو جاتے ہیں۔نواب سلیم اللہ خان کا ذکر بار بار ہو رہا تھا جن کے متعلق پمفلٹ دیواروں پر چسپاں تھے۔ پر نہ کوئی سُن رہا تھا نہ کوئی پڑھ رہا تھا۔ مجھے وقار بھائی کی بات یاد آئی۔ یہ ہسٹری لیس لوگ ہیں انہوں نے پاکستان سے علیحدگی کیا اختیار کی اپنی تاریخ سے بھی مُنہ موڑ لیا۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی تو ان کی تاریخ ہے جبکہ ہماری پُشت پر تو ہزاروں سالہ تاریخی ورثہ لدا ہے' تو ہم تاریخ یافتہ لوگ ہیں پر یہ تاریخ اتنی لرزہ براندام کیوں ہے۔ایک ہی تاریخ کس دوراہے پر آ کر غیر غیر ہو جاتی ہے۔تقسیم کر دی جاتی ہے۔ چھینا جھپٹی ہوتی ہے جس کے جو ہاتھ لگتا ہے اُچک لیتا ہے۔ تاریخ میں بھی غدر برپا ہوتا ہے کیا؟ یہ محل تو ہمارے قومی ہیرو کا ہے' لیکن اس کی توجیہہ وہ بیان کر رہے ہیں۔

''اگر پاکستان نہ بنتا تو ہم بھی آزاد نہ ہو سکتے' بنگلہ دیش کی پہلی اینٹ پاکستان بنا کر رکھی گئی۔'' گویا پاکستان کی آزادی' بنگلہ دیش کی آزادی کا نقطہ آغاز تھا۔نواب سلیم اللہ خان نے پاکستان کی حمایت کر کے گویا بنگلہ دیش کی بنیاد رکھ دی تھی۔تاریخ کو اپنی ضرورت اور پسند کا زاویہ کب دے دیا جاتا ہے۔ یہ تاریخ بھی کتنی بے اعتباری شے ہے۔اپنی وفاداریاں بدلتی رہتی ہے۔ ہر جائی کہیں کی ہر ایک کی مطلب برآوری میں ساتھ دے دیتی ہے۔آج ہماری کل کسی اور کی' وہی واقعات اپنا زاویہ بدل کر کسی اور کے مددگار ہو جاتے ہیں۔محل کی سیڑھیوں پر ایک مصری نوجوان نے اقبال صاحب کو روک کر پوچھا تھا۔''اس عمارت کی تاریخی اہمیت کیا ہے۔''

''یہ محل جس شخص کی رہائش گاہ رہا ہے۔وہ تحریکِ پاکستان کے قائد تھے۔اس کی وجہ اہمیت یہ ہے کہ مسلم لیگ کے باقاعدہ قیام کا اعلان اسی محل میں کیا گیا' نواب سلیم اللہ خان مسلم لیگ کے بانیوں میں سے تھے۔انہوں نے ہندوؤں اور انگریزوں سے لڑ کر مشرقی پاکستان کو آزاد کروایا اور مغربی پاکستان سے الحاق کیا یہ پاکستان کے قومی پیش رو ہیں۔'' لیکن ڈائس پر کھڑا شخص تو انھیں بنگلہ دیش کا قومی ہیرو قرار دے رہا تھا۔ہم نے ملک ہی نہیں تقسیم کیا۔ ہیروز کو بھی دولخت کر دیا ہے۔ٹانگیں ہم کھینچ رہے ہیں۔سَر وہ کھینچ رہے ہیں۔ یہ کھینچا تانی بڑی تکلیف دہ ہو گی ان کے لیے جن سے نبرد آزمائی کی جا رہی ہے۔سپیکر ایک ہی لکھی لکھائی تحریر بار بار پڑھ رہا تھا۔مسلم لیگ' نواب سلیم اللہ خان' پاکستان' تحریکِ آزادی' بنگلہ دیش محل کی سیر کی خواہش دم توڑ گئی۔

ہم محل سے باہر نکل آئے۔ ہمارے ٹیکسی ڈرائیور زمان نے بڑی خوشی سے ہمیں باخبر کیا' پُل کے اس پار بوڑھی گنگا ہے۔ دراصل ہم نے اُسے بوڑھی گنگا پر چلنے کو کہا تھا۔تو اُس نے یہ کہہ کر معذوری ظاہر کی کہ اسے رستہ نہیں آتا کیونکہ وہ تیرہ برس سعودیہ میں گزار کر آیا تھا۔ وہیں پاکستانیوں کے ساتھ رہتے ہوئے اُس نے اردو بھی سیکھی تھی جو ہر لفظ کے ساتھ ''نا'' کا لاحقہ ضرور لگاتا تھا۔

''میری بھابی نے کہا نا' ناریل اُتار دو نا' ناریل کو تیار ہونے میں پورا سال لگتا ہے نا' ڈاب بھی دس ٹکا میں ملتا ہے نا اور پکا ہوا ناریل بھی دس ٹکا کا آتا ہے نا۔'' زمان شکلاً ہرگز ٹیکسی ڈرائیور نہ لگتا تھا۔ پینٹ شرٹ میں ملبوس انتہائی

سمارٹ نوجوان' جو بنگالی بھی نہ معلوم ہوتا۔ سعودیہ میں گزارے تیرہ برسوں نے اپنی تاثیر اس پر بڑی خوشگوار چھوڑی تھی۔ تھوڑا تھوڑا عربی' تھوڑا تھوڑا پاکستانی' وہ سرزمینِ عرب میں پاکستانیوں کے ساتھ رہتا رہا تھا۔۔۔ پاکستانیوں سے اُس نے اردو بھی سیکھی تھی۔ یہ دھرتی اور ماحول بندے کو کیسے اپنے خمیر اور رنگ میں جذب کر لیتے ہیں۔ انہی کی تاثیر نظریات وعقائد کی آبیاری کرتی ہے۔

بوڑھی گنگا تک پہنچنے کے لیے' ہمیں فلائی اوور کے نیچے سے گُزرنا تھا۔ پُل کے نیچے ناریل سے بھرے ہوئے سٹور تھے۔ بوریوں کے انبار اور ناریل کے ڈھیر لگے تھے۔ سُرنگ نما پُل کے نیچے کی گھٹن' تاریکی' دھوتیوں اور شرٹوں والے بنگالی' کرخت کاروباری چہروں والے' خشک ناریل کے ڈھیروں پر بیٹھے بنیا نما دوکان دار' شاید یہ ناریل کی تھوک کی منڈی تھی۔ اسٹیمروں پر چڑھنے کے لیے کھیپیں تیار تھیں۔ اتنا لمبا پُل ختم ہونے میں ہی نہ آتا' جتنا تیز چلتے اُتنا ہی طویل ہوتا چلا جاتا۔۔۔ طویل تاریک سُرنگ سی عبور کرتے ہوئے خوف جسم کے رونگٹوں پر تھرتھرا رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں ہم یہاں بنگلہ دیش میں ہَوا کی آہٹ سے بھی ڈر جاتے تھے۔ ہر ماحول' ہر فرد مشکوک نظر آنے لگتا' شاید اسی کو کہتے ہیں چور کی داڑھی میں تنکا۔ باہر نکلے تو سامنے بوڑھی گنگا تھی' جس میں اسٹیمر بھرے تھے جیسے بسوں کا اڈا کھچا کھچ ہو۔ اسٹیمروں تک پہنچنے کے لیے لکڑی کے پُل بنائے گئے تھے' جن کے جنگلوں سے لگے ہوئے نشئی جھوم رہے تھے۔ سگریٹوں میں نشہ بھر کے کش لیتے' بے سُدھ ہوتے۔ قدم قدم پر اوندھے پڑ رہے تھے۔ اکڑے ہوئے اعضاء' پتھر چہرے' جیسے موت کا عمل گزرے ابھی دو تین گھنٹے گزرے ہوں۔ دریا کنارے سارے ہنگامے ان نیم مُردوں سے بالکل لاتعلق تھے۔ جہاں اسٹیمروں پر کھڑے نوجوان زنجیروں سے بندھی بالٹیاں دریا کے سیاہ کیچڑ پانیوں سے بھر بھر باہر کھینچتے اور نہاتے' کچھ کپڑے دھو رہے تھے۔ کچھ سٹیمروں کو صرف مار مار کر دھو رہے تھے۔ انڈین گانے گا رہے تھے۔ بیچ بیچ میں بنگلہ بھی' شاید آج چھٹی کا دن تھا اور شام میں کوئی فنکشن برپا ہونے والا تھا۔ ایک ہنگامہ تھا۔ بے فکری' تفریح' موجِ مستی' اسٹیمروں کے زیادہ تر کیبنوں کو تالے لگے ہوئے تھے۔ چند ایک کھلے بھی تھے' جن میں اُوپر نیچے برتھیں بنی تھیں۔ گھٹے گھٹے اور گندے گندے کیبن بعض میں نیا نیا پینٹ کیا ہوا تھا' جن کے کوریڈور صاف تھے' جہاں لگے بیسنوں کے شیشوں کے سامنے کھڑے ملاح شیو بنا رہے تھے اور اسی گندے پانی سے ٹوتھ پیسٹ کر رہے تھے۔

کچھ اسٹیمر پانی کے بلبلے اور دھواں اُڑاتے دریا کے کنارے چھوڑ رہے تھے' بوڑھی گنگا کے پانیوں میں کیلوں کے ٹہنے' پتے' ناریل کے چھلکے اور باسی گلی سڑی سبزیوں کی پوری تہہ کشتیوں اور اسٹیمروں کے سنگ سنگ تیر رہی تھی' جیسے پانی کے اُوپر اِک شہر آباد ہو۔ یہ اسٹیمر نہ ہوں کئی منزلہ فلیٹ ہوں جن میں آدھا بنگلہ دیش بند ہو گیا ہو' جن کا بنیادی مقصد موج مستی کرنا ہو۔ پتہ نہیں یہ ملاح اتنے خوش خوش کیوں رہتے ہیں۔ شاید پانی کی سنگت میں کوئی خوشی کا تعویز گھلا ہے۔ یا شاید مہینوں بعد ہم جنسوں کی صحبت دیوانہ کر دیتی ہے۔ یہ پانی کا شہر بھی ایسا ہی گنجان اور آلودہ تھا جیسے دوسرا ڈھاکہ' یہاں پانی پر بچھا دیا گیا ہو۔۔۔ پانی کے اس شہر میں عورتیں اور بچے بہت کم تھے۔

اقبال صاحب نے فی الفور واپسی کا فیصلہ کر لیا' ملاح ہمیں اُس تضحیک سے دیکھ رہے تھے جو غیر ملکیوں کی ہیئت کذائی دیکھتے ہوئے اکثر اُبھر آتی ہے۔ اُن کی آنکھوں کی آئیلی چمک میں کوئی دوسری چمک شامل ہو چکی تھی اور ہم تو ناریل کے خول سے بھی تر بک جاتے تھے' یہاں تو پانی کے پورے شہر کی چکنی بنگالی آنکھوں کا ہمیں ہدف تھے۔ ایک داڑھی والے ادھیڑ عمر مچھیرے کے کینو میں جیسے ہم چھپ گئے۔ کینو کا رسہ کھلا چھلک کر دریا کے دھارے پر آیا' جیسے ہاتھوں سے مچھلی پھسل کر پانی میں غوطہ لگا جائے' لیکن اس گار میں مچھلیاں تو عرصہ ہوا مر چکی ہوں گی۔ اتنی آلودگی میں حیات کہاں جی پاتی ہے' لیکن یہ انسان کتنا ڈھیٹ ہے' ہر پلوشن میں رچ بس جاتا ہے' یہ پانی کا شہر کتنا آباد اور خوش باش تھا جیسے کسی آلودگی کا کوئی مسئلہ درپیش ہی نہ ہو۔ کینو چلنے لگا۔ غلیظ پانی کی جھاگ پیچھے چھٹتی رہی' جو سیٹمرز اور بوٹس کی نالیوں سے خارج ہوتی جیسے کسی فیکٹری کا فضلہ خارج ہو رہا ہو۔ ہمارا ملاح تو ہلکے ہاتھوں چپو چلا رہا تھا۔ بنا بازوؤں کے ذرا سی صدری پہنے چارخانہ دھوتی باندھے جو ایک لفظ ہمارا نہ سمجھتا تھا۔ نہ ہی ہم اُس کا' اور نہ ہی ایک لفظ وہ بولا' شاید وہ گونگا اور بہرا تھا۔

خاموشی بھی کیسی پُراسراریت پیدا کرتی ہے۔ معمولی انسان غیر معمولی معلوم ہونے لگتا ہے۔ جن بھوت' دیوتا ایلین کیا کچھ لگنے لگتا ہے۔ کشتی چلتی رہی اسٹیمروں کے پہلو سے نکلتے ہوئے بڑی کشتیوں سے بچتے بچاتے ہوئے دریا کے سینے کے بیچوں بیچ بہتے دھارے کے رخ پر۔ پتہ نہیں کہاں لے جائے گا۔ اُن مُردہ مُردہ آنکھوں میں کوئی چمک بھی نہ تھی۔ چہرے کی سلیٹ بھی بالکل صاف تھی جیسے لکھ لکھ سب کچھ مٹا دیا گیا ہو' کچھ بھی تو اس کے ارادوں کا اندازہ نہ ہوتا تھا۔ چاہے بیچ دریا ڈبو دے چاہے کسی اسٹیمر سے ٹکرا دے چاہے کسی سنسان کونے میں لے جا سب کچھ چھین لے۔ ٹکٹ اور پاسپورٹ تک' خاموش آنکھیں' چُپ چہرہ' لب بستہ سکوت' کہیں کچھ کلام واضح نہ تھا۔ سب گڈمڈ تھا۔

''واپس مڑ' مڑو۔'' پر وہ تو کچھ سنتا ہی نہ تھا۔ آگے ہی آگے لہروں پر سوار کشتی بڑھتی جا رہی تھی۔ جدھر اسٹیمر کم ہو رہے تھے۔ کشتیاں دور دور ہو رہی تھیں۔ خوف کے ناگ پھن پھیلا رہے تھے۔ بوڑھی گنگا کے پانیوں جیسے کالے سیاہ' کچھ ہونے والا تھا۔ شاید مکافاتِ عمل' لیکن ہم نے تو کچھ نہ کیا تھا' لیکن جنہوں نے کیا تھا انہی کے کُچھ لگتے تھے ہم۔

پانی میں چھپے [p 12] سُنٹھ مگرمچھ کی طرح' خاموش' بے حس' بے سماعت' ناخدا' جس کے ہاتھ کے ذرا سے اشارے پر ناؤ بہے چلی جا رہی تھی۔

''چہارسُو''

جدھر وہ چاہتا تھا' جس میں ہم سوار تھے' جس کے پتوار اُسی ماجھی کے ہاتھ میں تھے' جو بہت پُراسرار تھا۔ ایک اسٹیمر کے قریب ہم نے شور مچا دیا۔ ''واپس کرو' واپس مڑو' بیک' بیک۔'' سٹیمر کی پہلی منزل ناریل سے بھری تھی' دوسری میں انسان ٹھنسے تھے' تیسری میں چھوٹے چھوٹے کیبن بنے تھے' جن کے مُنہ پر تالے لگے تھے' پتہ نہیں ان کے اندر کیا بھرا ہو۔

''واپس۔۔۔واپس۔۔۔''

کشتی مڑ گئی' مگر مچھ سے سونٹھ چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ آئی' جیسے کہتا ہو' بس ڈر گئے' اتنے سے جھٹکے سے ڈر گئے' بڑے آئے تھے۔ ''ڈھاکے ہم چلانے۔'' کشتی کے کنارے پر لگتے ہی ہم واپس بھاگے کشتیوں کے طویل پُل پر پڑے نشیئوں کے بے سُدھ جسموں کو پھلانگتے ہوئے۔ دریا کنارے بانسوں پہ ٹکے کھوکھوں میں بھرے گلے سڑے پھل سبزیاں' سیلے بسکٹ اور ہواڑ چھوڑتے رسوں کی مہک سیاہ کیچڑ پانیوں میں رچتی رہی۔ فلائی اوور کے نیچے میلوں لمبی سُرنگ تاریک اور خوفناک تھی' جس میں بھرے بنگالیوں کی آنکھوں کی چمک میں لہریں اُٹھتی تھیں۔ جدھر جدھر ہم چلتے' بوڑھی گنگا کی موجوں جیسی بھنور بناتی ہوئی' کشتیوں اور اسٹیمروں کو ڈبونے والی۔

واپسی پر بنگو بازار سے ہم نے برینڈڈ شرٹس خریدنے کی کوشش کی۔ ذرا ذرا کھوکھے' جن میں ہماری اطلاع کے مطابق مارک اینڈ سپنسر' وال مارٹ' جیسی پینی' ڈیزل' باس' رسل وغیرہ کے برینڈ بھرے پڑے ہیں جو یہاں کے سٹیچنگ یونٹس میں سلتے ہیں۔ ان بڑھیا اور مہنگی فرمز کا اور بجنل مال یہاں بنگلہ دیش میں ہی تیار ہوتا ہے لیکن اجنبی ہونے کی وجہ سے ہمیں کچھ نہ مل سکا۔

ایسے ہی جیسے کئی گھنٹے ٹریفک بلاک میں پھنسنے کے بعد جب ہم چڑیا گھر پہنچے تو گیٹ کے سامنے صف بچھا کر عملہ مغرب کی نماز ادا کر رہا تھا۔ ٹکٹ گھر بند تھا اور آدھ پون گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد جب ہم بنا ٹکٹ کے اندر پہنچے تو چوکیدار سیٹیاں بجا بجا لوگوں کو باہر نکال رہے تھے لیکن ہمیں غیر ملکی سمجھ کر ایک چوکیدار پنجروں کے پاس لے جا کر بتانے لگا' یہ بنگالی ٹائیگر بند ہے۔ یہ ببر شیر ہے یہ سُندر بن کا چیتا ہے۔ اب پتہ نہیں پنجرے کے اندر بنگالی ٹائیگر بند تھا کہ بنگالی بلی تھی۔ ہمیں تو بس اندھیرے میں سائے سے لہراتے نظر آ رہے تھے۔

اسی طرح ہمیں کیا معلوم کہ کس گلی کے کس کھوکھے پر برینڈڈ شرٹس پڑی ہیں۔ چار چار ہاتھ کی گنجان گلیاں' گھسنا ہی خطرناک معلوم ہو رہا تھا اور پھر اُن میں ٹھنسے ہوئے کھوکھلے' جیسے شہد کے چھتے کے بے شمار سوراخ' پتہ نہیں کتنی مکھیاں اندر موجود ہوں۔

بنگلہ دیش پارلیمنٹ کی عمارت کے قریب سے گزرتے ہوئے ہم نے پھر بنگلہ دیش کے اندر اُترتا ہوا پاکستان دیکھا۔ تین اطراف سے پانی میں گھری ہوئی عمارت پر منی پاکستان کی شبیہہ بھی موجود ہے جہاں پاکستانی جھنڈے کی شکل اُبھرتی ہے۔ چاند ستارے کی قوس بنتی ہے۔ جڑواں بچوں کی شکلیں' عادتیں اور کیا کچھ ملتا جلتا ہے۔ پہچان لیے جاتے ہیں کہ کبھی ایک ہی کوکھ میں پلے تھے۔

فلیٹ کے چوکیدار نے وہ پیکٹ دیا جسے ڈاکٹر عبدالواحد نے بھجوایا تھا جس میں اُن کا تعارف اور ایسے معلوماتی کتابچے شامل تھے جو بنگلہ دیش میں اردو اور اقبالیات پر رفتار کار کی وضاحت کرتے تھے۔ اب ملاح کی بے چمک آنکھیں اور بے تاثر چہرہ بالکل بے ضرر لگنے لگا۔ بے چارہ' طے شدہ ٹکوں کے علاوہ بخشش مانگتا رہا اور ہم ڈر کے مارے دور بھاگتے رہے۔ ابلاغ کا فقدان کیسے کیسے شکوک و شبہات کی دیواریں کھڑی کر دیتا ہے۔ انسانوں کے اندر' فاصلوں کے بیچ' خطوں کے درمیان' اندازوں کے ابہام کیسے جناتی ہو جاتے ہیں۔

آج شام آٹھ بجے کی واپسی فلائٹ تھی۔ پیکنگ کرتے ہوئے شدت سے یہ احساس اُبھرا' کاش ہمارے یہاں رہنے کا دورانیہ بڑھ جائے۔ اب تک تو ہم یہاں سے جانے کے بہانے ڈھونڈتے رہے تھے لیکن آج یہ کیسی اُداسی تھی جو دل میں ایسے ہی بھرتی تھی جیسے اسٹیمرز کی نالیوں میں پانی بھرتا' بھاپ بنتا اور پھر باہر چھٹتا تھا۔ فلائٹ تو شام آٹھ بجے کی تھی' لیکن دن بھر اس فلیٹ کو صاف ستھرا کرنا تھا' جسے ہم نے بیس روز استعمال کیا تھا جس سے استفادہ کرتے ہیں' اُس کے کچھ حقوق بھی تو بن جاتے ہیں۔ برتن صاف ستھرے دھل کر اپنی جگہ پر لگنے چاہئیں۔ باتھ روم چمکتے ہوئے' شیشے لشکتے ہوئے' فرش تاب دار' فرنیچر اُجلا ہونا چاہیئے۔ پورا دن ہی تو درکار تھا' جو چیز جس شکل میں ملی تھی اُسی صورت میں لوٹانے کیلئے۔۔۔

بالکونی سے آخری بار باہر جھانکا۔ یہی بالکونی تو شہر ڈھاکہ کا دیباچہ رہی تھی ہمارے لیے' فلیٹوں میں کام کرتی ادھرانی ساڑھیوں والی بوائیں' دائیں ہاتھ تعمیر ہوتی عمارت پہ کام کرتے مزدور' فلیٹوں کے گیٹ کھولتے چوکیدار' نیچے سڑک پر دوڑتے سائیکل رکشہ سوار' کسی کو کچھ معلوم ہی نہ تھا' کہ اُن کے یہ غیر ملکی پڑوسی واپس جا رہے ہیں' ہمیشہ کے لیے۔ گلے میں مالائیں پہنے ناریل کے درخت' کیلوں سے ڈھکی ہوئی جھیلیں اور کشتیوں سے بھرے دریا' سب کچھ چھوڑ کر' یہ سب کچھ ہم چھوڑ کر جا رہے تھے لیکن ان میں سے ہمارا تھا کیا' چھٹتا تو وہ ہے جو اپنا ہوتا ہے۔ پر یہ دل خالی گھونسلے جیسا کیوں تھا' جس کے سارے پرندے ہجرت کر گئے ہوں' راہی کو چھوڑی ہوئی منزل اتنی شدت سے بھی یاد آتی ہے؟ بنگال کا جادو سَر چڑھ کے بول رہا تھا۔ کچھ گُم جانے' کھو جانے کا احساس' کیا گُم ہوا تھا' تاریخ' کلچر' زبان' زمین' رشتہ' کچھ تو ٹوٹا تھا۔ پر ہمارا یہاں تھا کیا' پر کچھ تو تھا' جو یہیں رہ گیا تھا' اُس ہیرے کی انگوٹھی جیسا قیمتی' جو وہیں کہیں گُم ہو گئی تھی۔ شاید بوڑھی گنگا کے پانیوں میں گر گئی تھی۔ یا چاندنی بازار میں کھو گئی تھی۔ یا گلشن ٹو کے فلیٹ نمبر 10 میں ہی رہ گئی تھی جسے ہم اب تک تلاش کر رہے ہیں' پر وہ ہوتی تو ملتی' وہ تو وہیں کہیں رہ گئی ہے۔۔۔۔

ماتمِ صدآ روز

سرورانبالوی

(راولپنڈی)

چُنگل سے بچ کے موت کے جائے بشر کہاں
آلامِ روزگار سے اِس کو مفر کہاں

جس زندگی پہ مان ہے اِنسان کو بڑا
وُہ زندگی بھی اصل میں معتبر کہاں

آواز دو کہ کونسی منزل میں کھو گئے
پھرتی ہے تم کو ڈھونڈتی اپنی نظر کہاں

''تُم'' نے تو عہد باندھا تھا اِک عمر کا مگر
خُود ہی بتاؤ پورا ہوا ہے سفر کہاں

کِن بستیوں میں دُور اُفق سے نکل گئے
جاؤں میں تم کو ڈھونڈنے اب در بہ در کہاں

حِرماں نصیب رہ گئی ہیں آرزوئیں سب
حیراں ہے عقل جائے یہ فانی بشر کہاں

جا کر جہاں سے کوئی بھی لوٹا نہ پھر کبھی
تم نے بسا لیا ہے بھلا اپنا گھر کہاں

رہوارِ عمر زیست کی رہ میں رواں دواں
لیکن اجل سے اِس کو بھی حاصل مفر کہاں

کرنیں تو چاند اب بھی بکھیرے گا صحن میں
پہلی سی روشنی مگر وُہ بام پر کہاں

اشکوں سے نامہ لکھا جو میں نے تمہارے نام
لیکر بتاؤ جائے اُسے نامہ بر کہاں

یہ داستانِ غم تو بڑی ہی طویل ہے
یہ داستانِ غم ہو بھلا مُختصر کہاں

جاوؔید تیرے دوستوں کی ہے یہی دعا
مرحُومہ پر ہوں رحمتیں اللہ کی صدا

(عزیز دوست گلزار جاوید کی اہلیہ کی وفاتِ حسرتِ آیات کے موقع پر کہی گئی)

گلزار
(ممبئی' بھارت)

مٹکا بھر کے سورج اُلٹا۔۔۔

مٹکا بھر کے سُورج اُلٹا' شام نے دُور سمندر کی دہلیز پہ جا کر
رات کا پشمینہ پہنے تُم آئی تھیں!

رات تمہارے جسم سے پھسلی پڑتی تھی
جسم تمہارا اِک جلتے سیارے سا
دُودھ اور دُھوپ سے گوندی مٹّی
ایک فلک بھر خوشبو تھی آواز تمہاری!

تُم بول رہی تھیں
ہونٹ تمہارے چاند کی قاشیں کاٹ رہے تھے!
میں حیراں۔۔۔۔
حیراں حیراں۔۔۔۔
مٹکا بھر کے سورج کا، ایک اور سحر نکلی پانی سے
اُنگلی تھام کے صبح کی تم پانی پر چلتے چلتے ایک اور اُفق کو لوٹ گئیں!

وقت کے پُر اسرار کسی ''کومیٹ'' کی طرح
کائنات سے آئیں تم اور کائنات میں لوٹ گئیں!!

○

خیال کو وجود دے کے، اُس کو ڈھونڈتے رہے

خیال کو وجود دے کے، اُس کو ڈھونڈتے رہے
وجود جو خیال تھا!
دعائیں پھونکتے رہے، دُھوئیں میں ہم
کہ آگ کی لپٹ اُٹھے تو تھام لیں
اُسے تمہارا نام دیں!

پہاڑوں کی گُفاؤں میں۔۔۔۔
کِسی نے جستجو جلا کے رکھّی تھی
اور انتظار کے لئے،
سمئے کی انتہا ہٹا کے رکھّی تھی
عبادتیں تراشیں پتّھروں پہ اور گھر بنا لئے خیال کی پناہ کے لیے،
بس اک امید کے گُناہ کے لئے!

تمام شب جلی ہے شمع ہجر کی۔۔۔۔
اُمید بھی بچی ہے تو بس اتنی۔۔۔۔
جتنی ایک بانجھ کی کوکھ کو اُمید ہو!!

○

گذشتہ سال ۲۰۰۹ء کا مرثیہ

نقشبند قمر نقوی بھوپالی
(ٹلسا' امریکہ)

کٹ گیا اب کے بھی بارہ ماہ میں ہی سارا سال　　اس جواں سالی میں اس کا ہو گیا یوں انتقال
خوش ہیں ظالم، اور مظلوموں کو ہے اس کا ملال　　سچ ہی کہتا ہے زمانہ ، ہر کمالے رازوال
کوئی گذرے سال کا ہوتا نہیں پرسان حال
سانحے کے ضمن میں آتا نہیں یہ ارتحال

جب یہ آیا تھا تو امیدیں بہت وابستہ تھیں　　اور امیدیں بھی کچھ ایسی جیسے از خود رفتہ تھیں
چند ایسی تھیں گذشتہ سے ہی جو پیوستہ تھیں　　کچھ سریع السیر تھیں اور ان میں کچھ آہستہ تھیں
جب یہ سال آیا تو سب ہی تھے کچھ ایسے خوش خیال
جیسے دنیا میں نہ ہوگا اب کوئی آشفتہ حال

لیکن امیدوں کی شمعیں جھلملا کر بجھ گئیں　　آرزوئیں یا تمنائیں ، نہ کچھ باقی رہیں
یوں تو سب ہی معتبر بنتے رہے اپنے تئیں　　پھر سمجھ میں آ گیا یہ سال ہی اچھا نہیں
بہتری کا روز ہی آتا رہا سب کو خیال
صرف امیدوں پہ سب جیتے رہے تھے ایک سال

جانے کچھ لوگوں پہ کیا ابلیس نے پھونکا فسوں　　شیطنیت کا ان پہ طاری ہو گیا ایسا جنوں
ساری دنیا میں کیا برپا انھوں نے کشت وخوں　　کر دیا انسانیت کا حال اس درجہ زبوں
زیست کی اقدار کو کرتے رہے ہیں پائمال
ہائے کیسا روح فرسا، خون آلودہ تھا سال

جو بھی دہشت گرد ہے، شیطاں کا خدمتگار ہے　　قاتل اعظم ہے وہ، خوں خوار ہے، بیمار ہے
لوگ کہتے تھے کہ وہ ایک افسر التجا رہے　　دین کو برباد کرنے کا ہی کاروبار ہے
دین اپنا، اپنی ملت اور اپنا ملک و مال
جس کو یہ کرتے رہے بربادیوں ہی سارا سال

پھر فلسطین وعراق ، افغان اور کشمیر ہیں　　سال یہ بھی کٹ گیا، اور غمزدہ، دل گیر ہیں
جو حمایت کرنے والے ہیں وہ رسہ گیر ہیں　　آستینوں میں چھپائے خنجر و شمشیر ہیں
بزدلوں نے اس طرح پھیلا دیا دہشت کا جال
بھاگ کر ماضی کے حجرے میں چھپا اک اور سال

''غریب الوطن کا تہوار''

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ (کیلی فورنیا' یو ایس اے)

غریب الوطن کا تہوار کیا! تماشا کیا!
کہاں کی عید ' ہولی' دیوالی' دُسہرہ کیا!
مٹا کر رنجشیں' شکوے' عید پر پھر سے گلے ملنا
دیارِ غیر میں کوئی بھی اپنا سا ہو کر نہیں ملتا

کہاں وہ یار اِدھر' جو ہوں بھائی سے بھی اعلیٰ
کہاں کی رنگ رلیاں' کوئی بھی اپنا نہیں کہتا
بظاہر خوش نظر آئے' دلمیں تیرگی کا ڈیرہ
منائے کیسے دیوالی یہاں تنہا ہر اِک بندہ

کہیں دو چار اپنے سے مل جائیں جو ہو ہموطنی
منا لیتے ہیں دیوالی' خوش کرنے کو اپنا جی
جہاں میں ہوں' وہاں کوئی نہیں ہے ایسا بھی
جلا کر اِک ' دو' چار دیئے' ہوئی اپنی دیوالی

لڑکپن سے بڑھاپے تک ہے ''واحد'' ہر اک امریکی
انہیں لا یعنی لگتا ہے' محبت کا تصور بھی
یہاں آزاد ہے ہر اک شخص' اور جنسی تعلق بھی
انہیں اچھا نہیں لگتا' امداد لینا اور دینا بھی

یہ بندے ''پہلی دنیا'' کے' عجیب تہذیب ہے انکی
مجھے ہر بات لگتی ہے یہاں کی تو نرالی ہی
یہ سچ ہے' یہاں ہر طور سے ہے جمہوریت' ہے آزادی
مگر کچھ ایسے تقاضے ہیں بہ زعمِ خود ہوں میں قیدی

یہاں طرز دیوالی پر' ہیلو وین مناتے ہیں
اور شہر خموشاں کی مانند' اپنے گھر سجاتے ہیں
ڈراؤنے' خوف سے بھرپور تحائف لیتے دیتے ہیں
بنا کر بھوت سے چہرے اِک دوجے کو ملتے ڈراتے ہیں

عدیم الفرصتی یہاں عذر نہیں' تلخ حقیقت ہے
ماں باپ' بچوں نہ بیوی کو شوہر سے ملنے کی فرصت ہے
یہاں کے تہواروں میں ڈھل جانا تو اسکی ضرورت ہے
نہ ہنستا ہے' نہ روتا ہے' عجب دل کی کیفیت ہے

تصوّر میں اُبھرتے ہیں جسدم وطن کے تہوار
وہ نورانی منڈیریں' سڑکیں ' بازار و مینار
اور قریہ قریہ' شہر شہر میں روشنی کی پھوار
تصوّر میں لپٹ کر وطن سے منا لیتا ہوں میں تہوار

جہاں ہو گھٹن ایسی کہ ہو دشوار سانس لینا بھی
ذرا سوچو مرے ہمدم وہاں کیسی ہوتی ہوگی دیوالی
جو تشنہ محبت ہو' محبت جسکے دلمیں لا متناہی
کیسی گزری ہوگی اے تشنہ یہاں پر اسکی دیوالی

۱۔ہیلووین HALLOWEEN
۲۔واحد INDIVIDUAL

رفیقۂ حیات کی مرگِ ناگہاں پر۔۔۔

(معذرت کے ساتھ)

مہندر پرتاپ چاند (انبالہ، بھارت)

پلک جھپکتے ہی تُو نے جو مُوند لیں آنکھیں
کسے خبر تھی کبھی اب یہ کھُل نہ پائیں گی!
مری صدائیں، مری آہیں، میری فریادیں
فلک کو چھو کے بھی ناکام لوٹ آئیں گی!

جوان بیٹے کی بے وقت موت نے تجھ کو
دیئے وہ زخم جو تازیست مندمل نہ ہوئے
میں جانتا ہوں یہی جاں گداز گھاؤ تجھے
مآلِ کار بہت دُور لے گیا مجھ سے!

وہ ہم نوائی، وہ راز ونیاز کی باتیں
بھلی سی لگتی تھیں فہمائشیں بھی مجھ کو تری
اک ایک بات تری تھی عزیز تر مجھ کو
ہزار حیف! وہ سب چھن گئی متاعِ مری!

ہماری زندگی تھی یوں تو خوش گوار، مگر
ضرور میں نے تجھے رنج بھی دیئے ہوں گے!
ترستی رہ گئی ہوں گی بہت تمنائیں!
بہت سے ولولے پامال بھی ہوئے ہوں گے!

یہ سُونا سُونا سا گھر، رات کا یہ سنّاٹا
تجھی کو ڈھونڈتی ہے بار بار میری نظر
رہِ حیات کا بھٹکا ہوامسافر ہوں
ترے بغیر ہر اک راہ بند ہے مجھ پر

مگر یقین ہے مجھے، تجھ کو جب بھی پالوں گا
خطائیں جتنی بھی ہیں، ساری بخشوالوں گا

شانوں پر سر محفوظ نہیں

ارشاد عرشی ملک (اسلام آباد)

محفوظ نہیں گھر بندوں کے، اللہ کے گھر محفوظ نہیں
اس آگ اور خون کی ہو لی میں، اب کوئی بشر محفوظ نہیں

شعلوں کی تپش بڑھتے بڑھتے ہر آنگن تک آ پہنچی ہے
اب پھول جھلستے جاتے ہیں، پیڑوں پہ شجر محفوظ نہیں

کل تک تھا سکوں جن شہروں میں، وہ موت کی دستک سنتے ہیں
ہر روز دھماکے ہوتے ہیں، اب کوئی نگر محفوظ نہیں

دن رات بھڑکتی دوزخ میں جسموں کا ایندھن پڑتا ہے
کیا زکر ہو عام انسانوں کا، خود فتنہ گر محفوظ نہیں

آباد مکاں اک لمحے میں ویران کھنڈر بن جاتے ہیں
دیوار و در محفوظ نہیں، اور زید و بکر محفوظ نہیں

شمشان بنے کوچے گلیاں، ہر سمت مچی ہے آہ و فغاں
فریاد ہے ماؤں بہنوں کی، اب لخت جگر محفوظ نہیں

انسان کو ڈر انسانوں سے، انسان نما حیوانوں سے
محفوظ نہیں سر پر شملے، شملوں میں سر محفوظ نہیں

پہرے ہیں کلاشنکوفوں کے، ہر ایک گلی کے نکڑ پر
آنگن میں شجر محفوظ نہیں، شانوں پر سر محفوظ نہیں

مہنگا ہو اگر آٹا عرشی اور خودکش جیکٹ سستی ہو
پھر موت کا بھنگڑا ہوتا ہے، پھر کوئی بشر محفوظ نہیں

اک استغفار کا نسخہ ہے اس کو بھی برت لو نادانو
مت ناز کرو تدبیروں پر، یہ راہ گذر محفوظ نہیں

اے کاش کہ قوم یونسؑ کی تقلید کی ہو تو فیق ہمیں
وہ آہ سحر محفوظ نہیں، وہ دیدۂ تر محفوظ نہیں

جب بانجھ ہوں آنکھیں اشکوں سے دل قبر کی صورت ویراں ہوں
جب پست ہو مقصد جینے کا، تب حسن بشر محفوظ نہیں

اِنتباہ!

حامد لطیف (ممبئی، بھارت)

مرے بچّے، مرے معصوم بچّے!
ابھی تک تو جہاں جس حال میں بھی ہے
بڑے آرام سے ہے!
تجھ کو کوئی خوف، کوئی غم نہیں ہے
مگر، بچّے مرے، سن،
اب جہاں تو آنے والا ہے
وہ اِک عالم نرالا ہے!
جہاں ہر ہر قدم پر
تجھ کو خطرہ ہے!
ابھی بھی وقت ہے
ابھی کچھ بھی نہیں بگڑا
ترا دشمن نہیں ہوں میں،
تو کہنا مان لے میرا،
میں تجھ کو آنے والی ہر مصیبت سے
بچانا چاہتا ہوں!
یہ میری خواہش دیرینہ ہے،
کہ تو ہماری گود میں آئے!
مگر اب تجھ کو میں سمجھاؤں بھی،
تو کیسے سمجھاؤں؟
وہیں واپس چلا جا،
تو جہاں سے آنے والا ہے،
کہ میں تیری بھلائی چاہتا ہوں!
حقیقت سے تجھے آگاہ کرنا فرض ہے میرا
ادا کرنے دے مجھ کو، میرے اوپر قرض ہے تیرا!
اگر اب بھی تجھے آنا ہے، تو آجا۔۔۔۔
مگر، پھر مجھ کو یہ الزام مت دینا،
کہ میں نے تجھ کو سمجھایا نہیں تھا۔۔۔۔
کہ میں نے تجھ کو بتلایا نہیں تھا۔۔۔۔
بات میری مان لے۔۔۔۔
واپس چلا جا۔۔۔۔!
مرے بچے، مرے معصوم بچے
مرے نادان بچّے، مرے انجان بچّے!

اُردو ادب

گل بخشالوی (یو۔کے)

ا اَدب گلوں کے دم سے اُردو ایسی خوش بُو بولے ہے
بام پہ جیسے دُلہن کوئی دھوپ میں زلفیں کھولے ہے

ر رُخ سے جیسے تاج محل کے جھلمل پردہ ڈھلتا ہو
او رُخن ور پروانہ ہو، رُوپ پہ اُس کے جلتا ہو

د دنیا بھر میں، اردو اپنے نام کی عظمت رکھتی ہے
چاہنے والوں کی آنکھوں میں بَن کے نور جھلکتی ہے

و وادی میں کشمیر کے جیسے، لگتی ہے مظلوم کبھی
اُردو لکھنے والے ہوں جب طبقوں میں تقسیم سبھی

ا اُردو دنیا بھر میں اپنی عظمت اور پہچان بھی ہے
اس کو ہم گل زار رکھیں یہ شان ہماری آن بھی ہے

د دِل دنیا کو اُردو خوش بُو سے آؤ مہکائیں ہم
طبقوں کی، صحرا سے نکلیں اِک گلشن بن جائیں ہم

ب باغ ہمارا اُردو ہے ''گُل'' باغ کے مالی سوچیں ہم
مغرب میں بچوں سے اپنے گھر میں اُردو بولیں ہم

○

کلاسک اور کلاسکیت

ضیاء محی الدین (کراچی)
انگریزی سے ترجمہ
ڈاکٹر احسان احمد شیخ (اسلام آباد)

مجھے اکثر کلاسیکت کا مقلّد کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ میں اس پر معترض نہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ یوں سرِ تسلیم خم کرنے سے یہ سمجھا جائے گا کہ میرا تعلق اس نسل سے ہے جس کا ذوق قدامت پسند ہے اور جو جدّت کا ادراک نہیں رکھتی خواہ اس نئی راہ کا تعلق ادب سے ہو یا فنِ تعمیر سے اور جو کمپیوٹر کے عجائبات سے قطعی نابلد ہے۔ یہ صورتِ حال آج کل ہمارے اطراف پائے جانے والے اس کلچر کو کھل کر پیش کرتی ہے جو سنجیدگی اور دانشوری کو فرسودہ خیال کرتا ہے اور کاسکس کو پرانے فیشن سے تعبیر کرتا ہے جسے صرف بوڑھی نسل ہی پیدا کرتی ہے۔

کلاسک کیا ہے؟ کلاسکیت کسے کہتے ہیں؟ آپ اگر ڈکشنری کھولیں تو بعض جگہ آپ لکھا پائیں گے کہ کلاسک قدیم لاطینی اور یونانی ادب اور فن پارے کو کہا جاتا ہے۔ کہیں کلاسک اسے کہا گیا جو سادہ، سلیس اور باوزن ہو۔ یہاں تک کہ آکسفورڈ ڈکشنری جیسی ثقہ بند کتاب بھی ان ہی گنے چنے معانی سے آگے نہیں بڑھتی ہاں اتنا ضرور کرتی ہے کہ کلاسک کی تصریح کرتے ہوئے یہ بیان کر دیتی ہے کہ یہ بالعموم تسلیم شدہ، برتر اور غیر معمولی اہمیت کے حامل ادب اور فن پاروں کو کہا جاتا ہے۔

میں نے ماضی میں جو بھی تخلیقی کام کیا ہے خواہ وہ مجسمہ سازی ہو، پینٹنگ، ڈرامہ، فنِ تعمیر، شاعری یا تاریخ سے متعلق ہو اور جس نے آپ کے ذہن کو جھنجوڑا ہو اور آپ کے تخیل کی گہرائیوں کو چھونے میں کامیاب رہا ہو، وہی کلاسک ہے (یہ بھی یاد رہے کہ ہر قدیم شے کو کلاسک نہیں کہا جاسکتا کیونکہ کلاسک کا تعلق قدیم دنیا سے ہونا ضروری نہیں ہے)۔

خواہ وہ Discobolus اور Parthenon ہوں، ساتچنی کے اسٹوپا، غالبؔ کی شاعری، مائیکل انجیلو کے فن پارے، پیلے ڈی ین کے فن تعمیر کے شاہکار ہوں یا نثر اور شاعری کے فن پارے ہوں سب کلاسک کا درجہ میرے لئے رکھتے ہیں۔ جس ماحول میں آج ہم سانس لے رہے ہیں اس میں عام طور سے کلاسک کا درجہ ہر اس فن پارے کو دے دیا جاتا ہے جسے قبولِ عام حاصل ہو جائے اس میں مصوری، موسیقی، ڈرامہ، ناول سب شامل ہیں۔ اس طرح ''کلاسک'' کا درجہ پانے والے فن پاروں کے بارے میں صرف یہ بحث ہوتی ہے کہ ان میں سے بہتر کون ہے۔

Beard اور Henderson نے لکھا تھا کہ کلاسک کے نام سے جو اوّلین نقش ہمارے ذہنوں میں آتا ہے وہ قدیم یونانی دیومالائی کہانیاں ہیں۔ یہ کہانیاں قدیم ادب میں ہر طرف بکھری پڑی ہیں اور صرف یونانی ٹریجڈی اور ہومر کی عظیم نظموں تک محدود نہیں بلکہ رومی ادب بھی ان سے بھرا پڑا ہے جیسے Prometheus نے انسانی نسل کی بقا کیلئے اپنے آپ کو زنجیر سے ایک چٹان سے باندھا۔ Orpheus نے کس طرح اپنی جان جوکھم میں ڈال کر Euridice کو بچایا۔ Daphne نے اپنے آپ کو Apollo سے بچانے کیلئے اپنا سراپا ایک درخت کی شکل میں تبدیل کر لیا اور ہاں وہ مشہور زمانہ Midas کی کہانی جس کے ہاتھ کے لمس سے ہر شے سونا بن جاتی تھی۔

ان تمام دیومالائی کہانیوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے خاص طور سے بیسویں صدی میں اور ان کہانیوں کے بہت دور تک اثرات پڑے۔ Oedipus کی وہ مشہور کہانی جس میں وہ اپنے باپ کو قتل کر کے اپنی ماں سے جنسی تعلقات پیدا کرتا ہے اس کہانی سے مشہور Psychologist Freud سے متاثر ہو کر مشہور زمانہ نظریئے کی بنیاد رکھی۔ جس کو آج بھی خاندانی مسائل کی گتھی سلجھانے کے لیے ساری دنیا کے Psychologist اور Psychiatrist اپنی تشخیص کی بنیاد بناتے ہیں۔ نرگسیت، شہوت پرستی اور بادہ نوشوں کی رنگ رلیوں کی وجوہات بھی یہیں ڈھونڈی جاتی ہیں

یونانی کلاسکس کی المیہ نویسی جس کی تاریخ چوتھی صدی قبل از مسیح تک جاتی ہے ہمیں بتاتی ہے کہ اگر انسانی معاشرہ اپنی ہی مقرر کردہ حدود کی پاسداری نہ کرے تو طوائف الملوکی اور تباہی اُس کا مقدر ہوگی۔ Aescylus، Euripedes اور Sophocles جیسے المیئے اس تباہی و بربادی کا مرکزی نقطہ ہیں جو انسان اپنے آپ پر اور دوسروں پر لاسکتا ہے۔

یونانی المیہ نگاری کی تاریخ اڑھائی ہزار سال قدیم ہے اور یہ صرف یونان ہی میں نہیں پیش کی جاتی رہی ہے بلکہ اس کی وسعت مصر اور مقدونیہ تک جا پہنچتی ہے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ ان ڈراموں کی کلاسکیت اسی قدر طاقتور ہے کہ جس جمہوریت میں یہ وقوع پذیر ہوئے ان کی زندگی کی طوالت اُس سے بھی زیادہ ثابت ہوئی۔ میں نہیں سمجھتا اس کرۂ ارض پر کوئی ایسا ملک ہے جہاں تھیٹر زندہ ہے اور وہاں Medea اور Oedipus Rex کو اسٹیج کی زینت نہ بنایا گیا ہو۔

اب آپ پوچھیں گے کہ آخر ان ڈراموں میں ایسی کیا خاص کشش ہے جو ان کٹھور دل، ضدّی، سنگدل دیوتاؤں اور انسانوں کی کہانیوں کو ہم جیسے

فانی انسانوں کے مقابل لاکھڑا کرتی ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ ان ناقابلِ شکست مردوں اور عورتوں کی لازوال ہمّت وشجاعت کو اجاگر کرتی ہیں جنہوں نے اپنے یقین اور اصولوں کے لئے اپنی ہی تباہی اور موت کو دعوت دے ڈالی۔ یہی انسانی عزم کی معراج ہے کہ یہ المیئے آج بھی اپنی شان وشوکت کے ساتھ دائم وقائم اور مقبول ہیں اور ان کو دیکھنے والے تزکیۂ نفسی سے گزرتے ہیں۔

بھارت بھی ایک ایسا ہی ملک ہے جہاں کلاسکس اور کلاسکیت کی بھرمار ہے۔یونان کی طرح بھارت میں بھی ڈرامہ کئی صدیاں قبل از مسیح میں ہی ایک واضح خدوخال سے آراستہ ہو چکا تھا۔بھارت میں بھی کلاسیکل ڈرامہ (یعنی سنسکرت ڈرامہ) موسیقی، رقص اور نقالی کے بغیر نامکمل رہتا ہے۔ دراصل سنسکرت ڈرامہ تو رقص ہی کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے جہاں مکالمے، شاعری اور لفاظی سب موسیقی اور رقص کے مقابلے میں ثانوی ہوتے ہیں۔ہوسکتا ہے میرے بعض بھارتی دوست اس بات سے اتفاق نہ کریں مگر جتنا ڈرامہ وہاں میں نے دیکھا (زیادہ تر کالی داسا) اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔

اس سے پہلے کہ مجھ پر مغرب زدہ مشرقی ہونے کا الزام دھر دیا جائے میں یہ وضاحت کردوں کہ میں یونانی اور سنسکرت دونوں ہی زبانوں سے نابلد ہوں۔بات دراصل یہ ہے کہ مزاج کے مقابلے میں مجھے المیہ زیادہ متاثر کرتا ہے۔ بھارتی کلاسیکل تھیٹر نہ ارسطولین اور نہ ہی اس المیئے کا احاطہ کرتا ہے جو نشاطِ ثانیہ سے جُوی ہے۔

المیہ ہمیں حالاتِ انسانی، مجبوری اور حوصلے کو خوب کھنگالنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔اسی لئے یہ اداکاروں کو ایسے کردار فراہم کرتا ہے جو انسانی قابلیت کی معراج چھو لیتے ہیں۔ Oedipus، Creon، Lear یا اوتھیلو Othello کے کردار اسی لئے صرف انتہائی منجھے ہوئے اور وسیع تخیل رکھنے والے اداکار ہی نبھا سکتے ہیں۔ دراصل تھیٹر کا آرٹ ہے ہی اداکار کا آرٹ۔ انڈین تھیٹر میں اس پائے کے المیہ کردار نہیں پائے جاتے۔

میں ایک بار پھر وضاحت کردوں کہ میں کسی طور بھی سنسکرت ڈرامے کو بدنام کرنے کی جسارت نہیں کررہا ہوں۔یہ اپنی بناوٹ میں کلاسیکل ہی ہے۔ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان ڈراموں کو دیکھ کر میرا دل میری روح اسطرح متاثر نہ ہوئے جو صورت میں نے یونان میں Medea اور Antigone دیکھ کر محسوس کی۔

انڈین کلاسکیت قدیم ہے۔کچھ کے نزدیک یونانی کلاسکیت سے بھی زیادہ قدیم۔اس کی سب سے زیادہ بھرپور انداز میں قائم رہنے والی صنف ہے قدیم انڈین موسیقی جو اب بھی انڈین کلاسیکل موسیقی کی شکل میں سنی اور سنائی جاتی ہے۔

انڈین موسیقی کی بنیاد راگ پر قائم ہے۔تقریباً ہر موسیقار نے راگ کی تعریف اپنے انداز سے کرنے کی کوشش کی ہے۔ کچھ شروعات اس طرح کرتے ہیں کہ پہلے یہ سمجھیں کہ راگ کیا نہیں ہے۔ کچھ راگ کی تعریف انتہائی شاعرانہ انداز میں کرتے ہیں۔مثلاً یہ کہ ''جس طرح مٹھاس کو چینی اور شہد کی مٹھاس میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا اسی طرح راگوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا'' علیٰ ھذا القیاس

سب سے سادہ تعریف یہ ہے کہ راگ اونچے اور دھیمے لے والے نوٹس پر منحصر ایک سلسلہ ہے۔ اس کا ایک خاص پیمانہ ہے۔ اور ایک راگ دوسرے راگ سے اسی لئے مختلف ہے کہ ہر دو راگوں کے اونچے اور دھیمے نوٹس اور پیمانے مختلف ہیں۔ راگ کی خوبصورتی یہ ہے کہ اسے سُن کر ذہن پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ہے ذہن قوسِ قزح کے رنگوں کے سحر میں گم ہوجاتا ہے اور سننے والا ایک مسحور کن جذباتی کیفیت میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

جب ایک صداکار راگ گاتا ہے یا ایک سازندہ اسے بجاتا ہے تو راگ کے نوٹ ایک عمودی یا ترچھی شکل میں یا ان دونوں کے امتزاج سے گائے یا بجائے جاتے ہیں مگر ان کا مجموعی تاثر ہی اثر چھوڑتا اور صحیح رنگ جماتا ہے۔ جو لوگ راگوں کی ان باریکیوں سے ناواقف ہوں وہ اس لطیف احساس وگداز سے محروم رہتے ہیں۔

بھارت میں دیوی دیوتاؤں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو لاتعداد دیومالاؤں کی پیدائش کا باعث ہیں اور جن سے متاثر ہوکر بہت سے کلاسیکل فن پارے وجود میں آئے ہیں۔ گیتا گووندا ان میں سے ایک ہے۔ذاتی طور سے مجھے مندروں کے فنِ تعمیر سے خاص لگاؤ نہیں۔انہیں دیکھ کر مجھے احساس طمانیت نہیں ہوتا۔ مجھے تاج محل متاثر کرتا ہے اس کے سنگِ مرمر یا اس سے وابستہ رومانیت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی خوبیوں کی وجہ سے مثلاً اس کا ہر طرح سے متوازن ہونا، کسی بھی بہتات کا نہ ہونا، متوازن اشکال، گنبدوں کا توازن اور وہ احساسِ طمانیت جو اسے دیکھ کر دل وذہن میں پیدا ہوتا ہے۔کلاسکیت کے فن کے متعلق سر کینتھ کلارک نے جو بیسویں صدی کے نامی گرامی جمال دوست شمار ہوتے ہیں، کیا خوب کہا کہ اگر ہم کسی بھی قسم کی بندش پر اعتراض کرتے ہیں تو دراصل ہم کلاسک فن کی کلاسکیت پر معترض ہوتے ہیں۔

کلاسیکل فنِ تعمیر موزونیت اور توازن سے بھرپور ہے۔اس میں ہر ستون، مینار اور چبوترہ وغیرہ ایک خاص انتظام کے تحت اپنی جگہ بناتا ہے۔ رومیوں نے یونانیوں سے بہت سیکھا۔قرونِ وسطیٰ کے بعد کا اطالوی فنِ تعمیر یونانی نمونے کی بہتر شکل ہے اور یہ بہت تیز رفتاری سے یورپ اور روس میں پھیلا۔

ہم میں سے جو لوگ لاطینی اور یونانی زبانوں سے نابلد ہیں اُن کے لیے تو انگریزی ترجمے ہی وہ واحد ذریعہ ہیں جن سے یہ معلوم ہوسکے کہ کلاسیکل ادیبوں نے کیا لکھا اور کیا مطلب بیان کیا اور ہم نے کیا مطلب نکالا۔ قدیم ادیبوں کی تحریروں کو ہم تک پہنچانے اور قدیم دنیا کے کلاسک ادب کو نئی دنیا

تک لانے میں ان تراجم کا نمایاں ہاتھ ہے۔ یہاں تک کہ قدیم کلاسیکل ادب کے ترجمے پڑھنے والے کئی لوگ خود اپنی زبان کے کلاسیکل ادب تخلیق کرنے والے بن گئے۔ ان میں سے دو مشہورِ زمانہ مثالیں کیٹس اور شیکسپئر کی ہیں جو یونانی زبان سے نابلد تھے۔

ہمارا کلاسکس کا تجربہ ہمیں ہماری پچھلی نسلوں سے ملا ہے یہ کہ انہوں نے کلاسکس اور قدیم دنیا کے بارے میں کیا کہا کیا سوچا اور کیا لکھا۔ ایتھنز اور روم کی کلاسک تہذیب خود افریقی اور سامی تہذیبوں سے متاثر ہوئیں۔ کلاسکس نے اپنے اپنے زمانے میں جو اثرات چھوڑے وہ اس بات پر منحصر تھے کہ قدیم لکھاریوں نے اپنے وقت کی تہذیب و رسم و رواج کو کس طرح سمجھا اور پرکھا۔ ان کے کام میں ہمیں وہی نظر آتا ہے جسے آج ہم کثیر اُتہذیب کی عینک سے اپنی سوسائٹی کو دیکھنے کی سعی کر رہے ہیں۔ ہاں اُس زمانے میں جو ہم نہیں پاتے وہ غلامی کی مخالفت ہے جبکہ اُن وقتوں میں ایتھنز اور روم میں غلامی عام تھی۔ یہاں تک کہ Plato اور Horace بھی اس طریقۂ جمہوریت میں کچھ خرابی نہیں دیکھتے جس میں غلامی بنیادی عنصر کے طور پر شامل تھی۔

کلاسکس صرف ہمارے نظمِ نظر کی وسعت ہی نہیں بڑھاتیں بلکہ ہمیں اُس عہد کے غلط مفروضوں سے جھنجوڑ کر باہر لے آتی ہیں۔ یہ کلاسکس ہی ہیں جن کی وجہ سے ہم ان کے عہد کے حاکموں اور ان کی مخبوط الحواسیوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس کی مکمل مثال سلطان محمد تغلق کی ہے جس نے ہندوستان پر چھبیس سال (۱۳۲۵ سے ۱۳۵۱ تک) حکومت کی۔ ہمیں اسکول میں پڑھایا جاتا رہا تغلق کی سلطنت اپنی وسعت کے لحاظ سے اس وقت تک کی سب سے بڑی سلطنت تھی اور یہ صورت حال دو سو سال تک برقرار رہی یہاں تک کہ اکبر نے اس سے بڑی سلطنت قائم کی۔ ہم نے یہ بھی پڑھا کہ تغلق انتہائی مہذّب، شائستہ اور فراخ دل بادشاہ تھا۔ مانا ہوا خطاط تھا، فارسی شاعری کا ماہر تھا اور اسے ریاضی، منطق، طبیعات اور یونانی فلسفے پر عبور حاصل تھا۔ یہ سب کچھ ہمیں پڑھایا گیا مگر جب ہم نے ابنِ بطوطہ (کلاسکس) کو پڑھا اور یاد رہے کہ وہ Thucydides کے پائے کے مورّخ ہیں تو پتہ چلا کہ تغلق کی شخصیت میں کچھ ایسے وصف پائے جاتے تھے جو عقل و سمجھ سے باہر ہیں۔ ابن بطوطہ تحریر کرتے ہیں کہ سلطان تغلق کے محل کے اندر جانے کیلئے تین دروازوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ پہلے دروازے کے باہر بڑی تعداد میں سنتری، نقارے اور بانسریاں بجانے والے ہوتے تھے۔ دروازے کے باہر چبوترے تھے جہاں جلاّد بیٹھے ہوتے تھے۔ جب سلطان کسی کو گردن زدنی قرار دیتا تو سزا پر عمل ان ہی چبوتروں پر ہوتا اور لاش کو تین دن اور تین راتوں کے لیے یہیں پڑا رہنے دیئے جاتا۔ اس طرح جس شخص نے محل میں داخل ہونا ہوتا اُس کو پہلا منظر ان ہی لاشوں کا نظر آتا جن کے ہر وقت کشتوں کے پشتے لگے ہوتے۔ روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں زنجیروں میں بندھے معیوب یہاں لائے جاتے۔ یہیں پر مقتول قتل کئے جاتے۔ جن کو اذیت رسانی کا حکم ہوتا انہیں اذیتیں دی جاتیں اور جن کو محض مار پیٹ کئے جانے کا حکم ہوتا اس حکم کی تعمیل بھی یہیں ہوتی۔

Thucydides بھی یونانی جمہوریت کی ایسی ہی حکایت بیان کرتا ہے اور ایتھنز کو ایک ظالم وحشی شہر کا نام دیتا ہے جہاں عوام کا استحصال کیا جاتا اور یونانیوں کا بڑے پیمانے پر قتل ہوتا جو بسا اوقات نسل کشی کی حدود چھونے لگتا۔

Mary Beard اور John Henderson نے ایک چھوٹی سی مگر بہترین کتاب کلاسکس پر لکھی ہے جس میں وہ کلاسیکل کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ یہ ایک وحشی اور ہیبتناک دنیا کی وحشت اور سفاکی کو روکنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ یونانی فن اور ادب کا ایک بڑا حصہ ہمارے سامنے وحشت اور پاگل پن کی سرمستی کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

رومیوں نے یونان کو فتح کیا تو انہوں نے یونان کا بہت کچھ اثر قبول کیا۔ جب رومی سلطنت کا خاتمہ ہوا تو کلاسزم تقریباً فنا ہو گیا۔ کئی صدیوں بعد جب اطالوی نشاۃ ثانیہ نے سر اٹھایا تو کلاسزم بھی دوبارہ نظر آنے لگا۔ اس عمل میں اسلامی مملکت سے ہونے والی تجارت کا بڑا ہاتھ تھا۔ مسلمان اپنے ساتھ علم کا بیش بہا خزانہ لائے۔ قدیم یونانی علوم سے استفادہ حاصل کرنے کے ساتھ انہوں نے اپنی طرف سے بھی مختلف علوم میں بے بہا اضافہ کیا جن میں ریاضی، جغرافیہ، طبیعات، طبّی سائنس، منطق اور فلکی علوم شامل تھے۔

کلاسزم کی نشاۃ ثانیہ نے یورپی کلچر کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ جس پر ایک وقت میں محض کلاسک ہونے کی چھاپ لگا دی جاتی تھی اب اسے زیادہ بہتر اور منظم طریقے سے پیش کیا جانے لگا۔ نتیجتاً آرٹ اور موسیقی کے اسکول وجود میں آ گئے۔ اسی دور میں قدیم کلاسیکل بشمول یونانی المیہ نگاری ایک بار پھر جی اٹھی۔ شیکسپئر اسی نشاۃ ثانیہ کی پیداوار تھا۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں یونان کو ہی دوسری زندگی نہیں ملی بلکہ یہ مغربی کلچر کی دوسری زندگی تھی۔ یونان نے مغربی کلچر کو ایسی مضبوط جڑیں دیں کہ پھر اس تو انا درخت سے سب ہی نے استفادہ کیا۔ کلاسکس تو جیسے مغرب ہی کا اثاثہ ٹھہرے یہاں تک کہ کلاسکس تو آکسفورڈ اور کیمبرج میں تین سال کا کورس مکمل کر کے ڈگریاں لینے کا ذریعہ بن گئے۔ آخر کار بیسویں صدی میں مغرب نے مانا کہ کلاسکس میں مشرق نے بھی اپنا حصّہ ڈالا ہے۔

ہم نے اپنے ماضی سے جو ورثہ پایا ہے وہ بیک وقت محترم بھی ہے اور شہوت انگیز بھی۔ شہوت انگیزی کو اکثر علیحدہ کر دیا جاتا ہے حالانکہ نجی طور سے ہم بھی اس حقیقت سے لطف اندوز ہوتے ہیں کہ ہمارے اجداد بھی ہمارے جیسے ہی انسان تھے۔ مشکل یہ ہے کہ ہمیں یہ پڑھایا جاتا ہے کہ کلاسکس ایک اونچے سنگھاسن پر رکھی انتہائی پارسا قسم کی شے ہے اور اسی وجہ سے ہم کلاسکس سے دور ہوتے جاتے ہیں۔

قیصر تمکین کی داستان

سلطانہ مہر (برمنگھم یو۔کے)

کچھ یاد نہیں کہ قیصر تمکین کو میں نے کس عمر میں پڑھنا شروع کیا مگر وہ یقیناً نوعمری کا زمانہ نہیں تھا۔ ویسے میں نے (تقریباً گیارہ سال کی عمر سے ہی) ایم اسلم، رئیس احمد جعفری، عادل رشید، قیس رام پوری اور اس گروپ کے کئی لکھنے والوں کو پڑھا۔ والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ والدہ نے اسکول جانا ترک کرادیا اور میں اسکول کی سکھیوں سے ان کے ہوم ورک کے مضامین لکھ کر انھیں دینے کے عوض اسکول کی لائبریری سے کتابیں منگوالیا کرتی تھی۔ تب میرا تعارف کرشن چندر، منٹو، عصمت اور پریم چند سے ہوا۔ کیونکہ گھر میں ان ادیبوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ گھر کا ملازم محلے کی لائبریری سے جو کتابیں لاتا ان پر والدہ محترمہ کی کڑی نظر رہتی اور ظاہر ہے کہ محلے کی لائبریری کے قارئین مجھ جیسے چوتھی جماعت کے ہونہار طالبِ علم ہی ہو سکتے تھے۔

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ حالات بھی تبدیل ہوئے اور میری دسترس میں کچھ اور کتابیں بھی آئیں۔ اسی زمانے میں قیصر تمکین کے افسانے چند جرائد میں پڑھنے کا موقع ملا۔ ان کی کہانیوں سے متعارف ہونے کے بعد دل میں یہ تمنا بھی جاگی کہ کاش مصنف سے بھی ملاقات ہو پاتی۔

پھر بہت مدت کے بعد ان سے بذریعہ خط نصف ملاقات ہوئی۔ یوں ان کا تعارف میں نے اپنے نثر نگاروں کے تذکرے ''گفتنی اوّل'' میں شامل کرلیا۔ انھوں نے اپنے افسانوں کا مجموعہ ''یروشلم یروشلم'' مجھے امریکہ بھجوایا۔ اور کچھ عرصہ بعد مصنف سے ملنے کی خواہش بھی پوری ہوگئی۔ اب ان سے اکثر نیاز حاصل رہتا اور ان کی تخلیقات سے بھی۔

میں نقاد نہیں کہ ان کی کہانیوں پر اپنی رائے دے سکوں۔ لیکن اتنا ضرور کہنا چاہوں گی کہ ان کے افسانے ان کے دور کے مسائل معاشرتی حالات اور فرد کی فکر کا احاطہ کئے ہوتے ہیں۔ جس طرح ''The Book of the dead city'' کے مطالعہ سے قدیم مصری تمدن کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں اور جس طرح اردو کے ادیب مرزا فرحت اللہ بیگ، ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ راشد الخیری کے ناولوں اور مضامین سے ان کے معاشرے کی جھلکیاں ملتی ہیں اسی طرح قیصر تمکین کی کہانیاں ان کے عہد کی تصویر کشی کرتی ہیں۔ ماہنامہ فنون کے سالنامہ ۱۹۹۱ء میں ان کی کہانی ''سواستکا'' نہ صرف موضوع کے اعتبار سے ایک دلکش کہانی ہے بلکہ جملوں کی کاٹ اپنا ایک علیحدہ نشہ رکھتی ہے۔

قیصر تمکین کی کہانیوں کے موضوعات عام فہم ہیں مگر بہت سی کہانیوں کو سمجھنے کے لیے قاری کا تاریخ سے آگاہ ہونا بھی بہت ضروری ہے کیونکہ ایک کہانی کے فن کی گیرائی اور گہرائی تک پہنچنے کے لیے اسکے عہد کی تہذیب سے واقفیت کے ساتھ کہانی سے منسلک تہذیب کا مطالعہ بھی نہ کیا گیا ہو تو کہانی کی روح تک پہنچنا خاصا مشکل ہے۔

قیصر تمکین زود نویس نہیں نہ ہی اس پر یقین رکھتے ہیں کہ ''کا تا اور لے دوڑی۔'' پھر بھی انھوں نے بہت لکھا ہے اور جو لکھا ہے وہ نوک پلک سے درست زبان، سلاست اور روانی کے ساتھ لکھا ہے۔ ان کی اب تک بارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں آٹھ مجموعے افسانوں کے ہیں جن کے نام ہیں۔'' جگ ہنسائی۔ سواستکا۔ اللہ کے بندے۔ اوپاسمین۔ یروشلم یروشلم۔ ایک لفظ ایک حکایت۔ ایک کہانی گنگا جمنی اور صدی کے موڑ پر۔ ایک ناولٹ ہے۔ خدا خدا صنم صنم۔ تنقیدی مضامین کے دو مجموعے شعر و نظر اور تنقید کی موت کے علاوہ اخباروں کی دنیا کے تذکروں پر مشتمل ایک کتاب بعنوان ''خبر گیر'' بھی ہے جو ان کی خود نوشت بھی کہی جا سکتی ہے۔''

مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ ربع صدی ہند و پاک کی ادبی دنیا میں معروف، مشہور اور مستند ادیب ہونے کے باوجود کسی جریدے نے، کسی ادبی تنظیم نے اور حد یہ کہ کسی صاحبِ نظر ادیب نے بھی ان کی ادبی خدمات کا اعتراف ان معنوں میں نہیں کیا جس کی مستحق جناب قیصر تمکین کی شخصیت ہے۔ حکومتوں سے تو اسکی توقع بے کار ہے کہ وہاں تعلقات کے نام پر نامہ بروں کی کرم فرمائیاں کام کرتی ہیں جبکہ قیصر تمکین جیسے لوگوں کا مزاج اس قسم کی کاروائیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ مجھے خود اس کا تجربہ یوں ہے کہ میرے نثر نگاروں کے تذکرہ ''گفتنی اوّل'' کے لئے سوالنامے کے جواب بھیجنے میں اور اپنے بارے میں معلومات فراہم کرنے میں بھی انہوں نے بہت زیادہ سرگرمی نہیں دکھائی چنانچہ میں نے سوچا کہ ایک دن ان سے روبرو گفتگو ہونی چاہیے۔ اس ضمن میں انھوں نے مجھے مایوس نہیں کیا اور اس طویل گفتگو کا جو حاصل ہے وہ قیصر تمکین کے قارئین کے لئے حاضر ہے۔

پہلے میں آپ کو قیصر تمکین صاحب سے ملوا دوں۔ ان کا پورا نام شریف احمد قیصر تمکین علوی ہے۔ یکم جنوری ۱۹۳۸ء کے دن لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ مذہبی تعلیم کے بعد رسمی تعلیم شروع ہوئی۔ انھوں نے قرآن پاک حفظ کیا ہے۔ انگریزی ادب میں ایم۔اے کیا۔ اور ایل ایل بی یعنی قانون کی سند بھی حاصل کر لیتے اگر فائنل کا امتحان دے دیتے۔ کیونکہ حصولِ روزگار اسوقت ضرورت تھی چنانچہ ایک سرکاری نوکری مل گئی تو دہلی چلے گئے۔ ۱۹۶۵ء میں انگلستان آ گئے اور اب یہیں مقیم ہیں۔

اردو زبان و ادب سے انھیں بے حد محبت ہے۔ اردو زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ کی پیوند کاری انھیں بالکل پسند نہیں۔ لہٰذا اردو زبان کے حوالے سے منعقد کی گئی تقریبات میں اردو میں ہی اظہارِ خیال کرنا پسند کرتے ہیں چاہے سامعین میں انگریز بیٹھے ہوں۔ انھیں ان ادیبوں سے شکایت ہے جو اردو میں لکھتے ہیں اور انگریزی الفاظ کی بیساکھیاں استعمال کرتے ہیں۔ اس

طرح بقولِ قیصر تمکین ''انھوں نے اردو کو ''اردش'' بنا دیا ہے۔ جیسے ''میں چائے سپ کر رہی تھی۔'' اور ''اسکائی بلیو پانی میں فراگس (مینڈک) نیلم میں ایمرالڈ لگ رہے تھے۔''

ان کا کہنا ہے کہ اردو میں نالائق' کاہل اور کلاسیکی ادبیات سے ناواقف لوگ ہی اپنی اردو تحریروں میں انگریزی الفاظ کا استعمال جا و بے جا کرتے ہیں۔ خاص طور پر پاکستان میں تو ''اردو'' نام کی کوئی شے نظر ہی نہیں آتی۔ اردو کی ترقی تو انگریزی کے غلاموں نے پہلے ہی روک رکھی ہے۔ اب اس کا رسم الخط بھارتی ادیب ذبح کر رہے ہیں۔

ان کی شخصیت کے حوالے سے ایک سوال میرے ذہن میں تھا اور میری ان سے گفتگو کی ابتداء بھی اس سوال سے ہوئی کہ ابتک ہندو پاک کے نقادان نے ان کو نظر انداز کیوں کیا جبکہ ان کی کہانیاں پاک و ہند کے مقتدر جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں اور صفِ اوّل کے ادیبوں میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔

قیصر تمکین: شاید کچھ لوگ میرا ذکر کر کے خوشی محسوس نہ کرتے ہوں حالانکہ میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں۔ کوئی اختلاف نہیں۔ یہ ۱۹۶۰ء یا ۶۱ء کی بات ہے۔ دہلی کے ڈاکٹر محمد حسن نے اتر پردیش کے افسانہ نگار یا یوپی کے افسانہ نگار کے نام سے مضمون لکھا۔ اس میں ان سب کے نام تھے جن کا کوئی مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آیا تھا جبکہ یوپی میں میرا اور ایک مجھ سے سینئر افسانہ نگار مسیح الحسن رضوی کی کہانیوں کا مجموعہ شائع ہو چکا تھا۔ مضمون میں کئی نئے نام تھے لیکن نہیں تھا تو میرا۔ اس طرح انھوں نے یہ روایت قائم کی۔ یہی کرم فرمائی شہزاد منظر نے کی۔ وہ میرے اچھے واقف کار تھے۔ کلکتے میں تھے اور وہاں سے ایک ہفت روزہ نکالتے تھے۔ غالباً ''آثار'' نام تھا۔ انھوں نے افسانہ نگاری پر کئی مضامین لکھے لیکن میرا ذکر کہیں نہ تھا۔ ایک اور صاحب نے اپنا ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا ہے جس میں یوپی کے سب افسانہ نگاروں کے نام ہیں۔ میں اور نام گنواؤں۔ شارب ردولوی، رام لال، حسن عابد، قاضی عبدالستار۔ یہ سب وہ کرم فرما ہیں جنھوں نے مضامین میں کبھی میرا نام لکھنے کی زحمت نہیں کی۔ لیکن ایک شخص جس نے میری کہانیاں پڑھیں اور میرا ذکر کیا وہ گوپی چند نارنگ ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب میں میرا ذکر کیا ہے۔ لیکن ۱۹۵۸ء سے ابتک۔ کسی نے اسکو ضروری نہیں سمجھا۔ غالباً چند مخصوص لوگوں نے ایک انداز اپنایا ہے کہ پہلے تو اوپر سے چار پانچ افراد لے لیتے ہیں جیسے سعادت حسن منٹو' احمد ندیم قاسمی' بیدی وغیرہ۔ اس کے بعد اپنے علاقے کے لوگوں کو لیتے ہیں اسے ہم تعصب کہہ سکتے ہیں۔ حالانکہ میری کتابیں تمام لکھنے والوں کے پاس گئی ہیں اور جاتی ہیں مگر۔۔۔۔

س۔م: آپ کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ کب شائع ہوا؟

ق۔ت: ۱۹۵۸ء میں مجھے اس کا معاوضہ سو روپئے ملا تھا۔ اس رقم سے میں نے اپنی زندگی کا پہلا سوٹ بنوایا۔ ورنہ پہلے کبھی ٹائی لے لی۔ کبھی قمیض اور کبھی پتلون۔

س۔م: کہانی لکھتے وقت کیا خاص بات ذہن میں ہوتی ہے۔ ابلاغ ہو یا نہ ہو؟

ق۔ت: میں کہانی کسی پروگرام کے تحت نہیں لکھتا کہ صبح ۹ بجے بیٹھوں اور فلاں وقت تک اسے ختم کر دوں۔ کہانی تو عرصے تک ذہن میں پکتی ہے۔ پھر کاغذ پر منتقل ہوتی ہے پھر نظرِ ثانی ہوتی ہے اور کانٹ چھانٹ بھی۔ اور کہانی میں کوئی بات تو ہوتی ہے کہنے کے لیے۔ جیسے کوئی فوٹو گرافر کیمرہ لیے گھوم رہا ہے اور کوئی ایسی چیز مل گئی کہ وہ کیمرے میں محفوظ کر لے۔ میں خواجہ احمد عباس یا کرشن چندر کی طرح کوئی باقاعدہ پیغام نہیں دیتا۔ بس مجھے جو کہنا ہوتا ہے وہ میں کسی موقع سے بڑی خوبی سے اپنی بات کہہ دیتا ہوں۔ مثال کے طور پر مجھے کہنا ہے کہ اس وقت انگلستان میں نسلی امتیاز بڑھتا جا رہا ہے اور ایشیائیوں اور خاص کر مسلمانوں کے لئے۔ تو میں اپنی کہانی میں اُسے اس خوبی سے لکھ دوں گا کہ میرے قاری کو اگر کہانی کا ادراک ہے تو وہ وہاں تک پہنچ جائے گا۔ باقی لوگوں کا بس داستان سننے کی حد تک شوق پورا ہوگا۔

س۔م: کیا آپ اس کا اہتمام نہیں کرتے کہ آپ کی کہانی عام قاری کے پلّے بھی پڑے۔ یا آپ صرف خواص کے لئے لکھتے ہیں؟

ق۔ت: ہر کہانی میں' میں نے کوئی ایک بات کہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ جن لوگوں تک میری بات پہنچی ہے وہ میری کہانی کی سپرٹ اور جذبے تک پہنچ جاتے ہیں۔ مثلاً ہندو مسلم اتحاد کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ہم گفتگو میں تو کہہ دیتے ہیں اور مضامین میں بھی لکھ دیتے ہیں کہ یہ جو میرا دوست ہندو ہے وہ اپنی رسوئی میں مجھے آنے نہیں دے گا۔ لیکن اگر مجھے لکھنا ہوا تو میں اس طرح نہیں کہوں گا کہ آپ مجھ پر اعتراض کریں۔ لیکن یہی بات میں کہانی میں کہنا چاہوں گا تو کہوں گا۔

''وہ چائے والا آیا۔ ہم نے چائے پی اور اٹھنّی دی۔ اس نے اٹھنّی کو دھودھا کر اپنے گلے میں ڈال لی۔''

اب اس بات کو کہانی پڑھنے والا سمجھ جائے گا کہ میں نے یا کہانی نویس نے کیا کہا ہے۔ یہی ایک کہانی کی خوبی کہلاتی ہے۔ اب اگر کسی کو اعتراض ہے کہ کہانی میں کہی گئی بات اسکی سمجھ میں نہیں آتی تو اُسے یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ کہانی کوئی مضمون' تقریر یا خطاب نہیں۔ یہ اپنے اپنے شعور کی بات ہے۔ اب ''شہر آشوب'' کو لے لیں۔ بہت سے لوگوں نے پڑھا ہے اور اپنے اپنے شعور کے حساب سے اُسے سمجھا ہے۔ دوسری اہم بات میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ادبی اور صحافتی اظہار میں واضح فرق ہے۔ کہانی رپورتنگ نہیں ہے کلیم عاجز کا یہ شعر ملاحظہ ہو جو انھوں نے اندرا گاندھی کے سامنے انھیں مخاطب کر کے پڑھا تھا۔ جب اندرا گاندھی نے ایمرجنسی لگائی تھی۔

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

سمجھنے والے سمجھ گئے کہ کلیم عاجز نے ان دو مصرعوں میں کتنا کچھ کہہ دیا۔ اخبارات کی خبر تو پرانی ہو جاتی ہے مگر شعر اور کہانی برسوں بعد بھی اپنے عہد کی ترجمان ہوتی ہے اور زندہ رہتی ہے۔

س۔م: پاکستان اور ہندوستان میں جو ادب لکھا جا رہا ہے اس حوالے سے اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان میں لکھنے پر پابندی ہے اتنی آزادی نہیں جتنی ہندوستان میں ہے اسکے باوجود پاکستان میں لوگ لکھ رہے ہیں۔ کیا مقابلتاً ہندوستان میں قابلِ مطالعہ ادب تخلیق ہو رہا ہے؟

ق۔ت: دیکھئے ناسازگار حالات میں پاکستان میں بھی لوگوں نے حق بات لکھی ہے پھر بھی میں کہوں گا کہ جو تجربہ جمہوریت کا ہندوستان میں ہے وہ کبھی یورپ میں بھی نہیں رہا۔ وہاں مسلمان اس خوف میں ہیں کہ کہیں انھیں پاکستان کا ایجنٹ نہ سمجھ لیا جائے۔ میری ایک کہانی ہے گنگا جمنی۔ اس میں روتی دھوتی صورتِ حال کا ذکر نہیں بس ایک عام حادثے کا ذکر ہے کہ ایک بندر کو ایک صاحب نے مار ڈالا۔ شہر میں فساد ہو گیا۔ پروفیسر قمر رئیس ڈر گئے کہ ایسی کہانی وہ اپنے جریدے میں کیسے چھاپیں۔ مگر وہی کہانی ہندی زبان کے ہر پرچے میں شائع ہو گئی۔ نیز پاکستان میں صورتِ حال مختلف ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ پڑھے لکھے طبقے پر دو اثرات ہیں۔ ایک تو مغرب سے انگریزی ادب کے اثر نے ان کے سوچنے کا انداز مختلف کر دیا۔ دوسرے کوئی لکھنا چاہے بھی تو مذہب کا بھوت آڑے آ جاتا ہے کہ فلاں بات تو مذہب سے مطابقت نہیں رکھتی۔ ہم شادیوں میں کئی فضول رسمیں لے آتے ہیں۔ مہندی کی رسمیں ہوں گی، وڈیو بنے گا۔ مگر لکھنے کے معاملے میں ہم اب بھی اسی قدامت پرستی کے زمانے میں ہیں اور اسکی وجہ تعلیم کی کمی ہے۔ اور یہ جو ابھی آپ نے پوچھا کہ مسلمانوں کی تعلیمی حالت پست کیوں ہے اسکی وجہ ہماری کوتاہ نظری ہے۔ ہم پاکستان میں تعلیم کا معیار بلند کرنے کے سلسلے میں سست رفتار ہیں۔ ہندوستان میں صورتِ حال مختلف ہے۔

س۔م: ہندوستان میں بڑے شہروں میں ریاستی اکیڈمیاں ہیں جو ادیبوں کی حوصلہ افزائی میں ہمیشہ پیش پیش رہتی ہیں جبکہ پاکستان میں ایسی کوئی اکیڈمی نہیں۔ انکا ڈنکا کی بات جانے دیں۔ یہ ادبی بددیانتی ہے کہ بغیر سفارش آپ کی ادب میں شناخت بھی نہیں؟

ق۔ت: دیکھئے لکھنے والے کا مقصد بس لکھنا ہے ایک ادیب اسلئے نہیں لکھتا کہ وہ جائزے یا امتحان میں ڈالا جائے گا یا توپ پر چڑھا دیا جائے گا۔ پھول کا کام کھلنا ہے چاند کا چمکنا ہے چاہے اسکی روشنی کا عکس کسی تالاب میں پڑے یا اسکی کرنیں کسی کٹیا کو روشن کریں۔ یہ کام چاند کا نہیں کہ اسکی روشنی کہاں جائے۔ یہ کام تو ان منصب داروں کا ہے جو بڑی بڑی تنخواہیں لیتے ہیں۔ مجھے تو اس سے بھی کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے کہ میری کہانی کہیں چھپے گی بھی یا نہیں۔ ایک ادیب جس کا نام سموئل پپس Sawamul Pyps تھا۔ وہ اپنی ڈائری لکھ رہا تھا۔ سولھویں صدی میں کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بیسویں صدی میں کوئی اس ڈائری کو پڑھے گا بھی۔ اس نے اپنی کتابیں لائبریری میں دے دیں تو اس ذخیرے میں یہ ڈائری بھی تھی جس میں اس زمانے کے حالات لکھے تھے جو بعد میں لوگوں کو معلوم ہوئے۔ چنانچہ آج جب ڈائری نویسوں کا نام آتا ہے تو اس کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔

اسی طرح ہمارے ملک میں بھی بہت سے ایسے ادیب ہیں جیسے احمد ندیم قاسمی اور فیض احمد فیض یہ دونوں صحافی بھی ہیں اور انہوں نے ناسازگار حالات میں بھی بہت کچھ لکھا۔ اگر آپ کے اندر کوئی چشمہ ابل رہا ہے تو آپ لکھیں گے ہی مگر پروپیگنڈہ مشینری کچھ اور ہی خدمت انجام دیتی ہے۔ میں نے دیکھا پاکستان سے شائع ہونے والے شاعری کے ایک انتخاب میں جگر کی ایک ہی غزل ہے جبکہ افتخار عارف کی سات غزلیں موجود ہیں۔ چنانچہ مجھے یہ کہتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے کہ کسی کا کوئی وژن ہی نہیں ہے۔ اگر یہ بات ان سے کہی جائے تو وہ خفا ہو جائیں گے۔ اب رہی اکیڈمیوں کی حوصلہ افزائی کی بات۔ تو سبھی جانتے ہیں کہ یہ سب باتیں ''من تراحاجی بگویم تو مراحاجی بگو'' والے قصے ہیں۔ میں آپ کو ایک ذاتی واقعہ بتاؤں۔ امریکہ کے شہر لاس اینجلس (LA) سے میرے پاس کچھ کتابیں آئیں۔ ان میں سے ایک صاحب کا مجموعہ نہایت واہیات تھا۔ اس میں انھوں نے کچھ ہندی کی فضا باندھی تھی کچھ انگریزی کی ترکیبیں استعمال کی تھیں۔ ان کو انعام دے دیا گیا حالانکہ میں نے بحیثیت جج ان خاتون کی کہانیاں منتخب کی تھیں جو اچھی تھیں مگر معلوم ہوا کہ وہاں پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہے۔ مجھے تو خبر ہی نہ دی کہ انھوں نے کس کو انعام دیا۔ ان خاتون کو یہ کہہ کر بہلا دیا گیا کہ تم تو ہماری دوست ہو۔ اس بار یہ انعام ''فلاں'' کو دینے کی مجبوری تھی۔ دیکھئے کہ جن کہانیوں کو اتنا بڑا انعام دیا گیا وہ کہانیوں کی صف میں ہی نہیں آتی تھیں۔ تو اب کس کا اعتبار کیا جائے؟ لیکن اچھے لکھنے والے ایوارڈ کے منتظر نہیں رہتے۔ جیسے پٹنہ ہندوستان میں شموئل احمد ہیں۔ عبدالصمد ہیں اور بھی بہت سے اچھے ہیں جن کے نام اسوقت یاد نہیں۔

س۔م: آپ کی رائے میں کچھ جرائد ایسے ہیں کہ جو اچھی کہانیاں شائع کر کے اردو فکشن کے خزانے کو محفوظ کر رہے ہیں؟

ق۔ت: اچھے پرچوں میں کراچی سے روشنائی۔ مکالمہ' آئندہ۔ لاہور سے فنون' لاہور سے' چہارسو' راولپنڈی سے تخلیق۔ ہندوستان سے شاعر اور شب خون۔ مگر شب خون اچھا اور معیاری پرچہ ہونے کے باوجود اس میں کبھی کبھار ہی کوئی اچھی کہانی پڑھنے کو ملی ہے۔ ممبئی سے ساجد رشید کا ''نیا ورق'' ہے۔ کراچی سے حسن عابد ''ارتقا'' شائع کرتے ہیں مگر اسمیں انگریزی کے تراجم ہوتے ہیں۔ یہاں انگلینڈ میں ایک صاحب ہیں انھوں نے نیویارک کے ایک پرچے سے مضمون اٹھا کر اپنے نام سے شائع کرا دیا۔ جب میں نے ان کی چوری پکڑ لی اور انھیں معلوم ہوا کہ نیویارک سے پرچے میرے پاس آتے ہیں تو انھوں نے لکھنا چھوڑ دیا۔

س۔م: خواتین میں افسانہ نگاروں کے نام لیں۔ ان کے نام جنکی کہانیاں آپ نے پڑھی ہیں۔

ق۔ت: شکیلہ رفیق۔ خالدہ حسین۔ عذرا اصغر۔ صفیہ صدیقی دیگر نام دیا نہیں

آ رہے۔ایک نام آپ کا بھی ہے۔مرد حضرات میں نعیم آ روی نے ترقی پسندی کی کہانی جو لکھی تھی وہ بڑی دلچسپ تھی۔لیکن جن لوگوں کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا وہ اِدھر اُدھر کی لکھ دیتے ہیں۔جیسے انتظار حسین کی کہانیاں جنھیں کہانیاں کہنا ہی مشکل ہے۔اگر آپ سچ کہنے کی اجازت دیں تو انتظار حسین کی کہانیاں ادب کے زمرے میں نہیں آتیں۔وہ پیدائشی عزادار ہیں۔وہ ناسٹلجیا کا شکار بھی نہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے بلکہ ان میں ایک بیمار سی ماضی پرستی پائی جاتی ہے۔اور سب سے زیادہ جو میرے لئے باعث انقباض ہے وہ ہندی الفاظ کا استعمال ہے۔پاکستان میں زیادہ تر لوگوں کو ہندی آتی نہیں وہ ان کے رعب میں آجاتے ہیں۔ہاں انتظار حسین نے جو مضامین لکھے ہیں وہ سمجھداری کا ثبوت ہے۔ابھی حال ہی میں ان کی ایک کتاب ''علامتوں کا زوال'' آئی ہے۔اچھے مضامین ہیں مگر کہانی کے معاملے میں انتظار حسین اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔

س۔م: برطانیہ اور امریکہ میں لکھنے والی افسانہ نگاروں کے بارے میں کیا کہیں گے؟

ق۔ت: بہت اچھ کہانیاں لکھنے والی ہیں۔ان میں شعور ہے وہ اپنی تمام تر گھریلو ذمہ داریوں کے باوجود لکھ رہی ہیں۔اخبارات میں بھی لکھتی ہیں۔عصمت چغتائی اگر لکھتی تو وہ گھر کے کام نہیں کرتی ہیں۔ورنہ عورت ہونے کے ناطے برطانیہ میں تو گھر اور بچوں کے ساتھ ملازمت کی ذمہ داریاں بھی نبھانا پڑتی ہیں۔یہ بہت سنجیدہ کام ہے۔یہ نہیں کہ اٹھتے بیٹھتے چیک پر غزل لکھدی۔

س۔م: آپ نے تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔کسی ایک مضمون کے حوالے سے بتایئے کہ کیا لکھا ہے؟

ق۔ت: میری کتاب ''تنقید کی موت'' میں جوش پر ایک مضمون ہے۔ایک طرح سے جوش اور اقبال کا موازنہ ہے۔میری رائے میں اقبال بہت منضبط ہیں جبکہ جوش لکھتے چلے جاتے ہیں۔انھیں یہ نہیں معلوم کہ کہاں رکنا ہے۔جب سانس پھول جاتی ہے تو تھک کر گر جاتے ہیں اور وہیں رکتے ہیں۔پچھلی صدی کے سب سے بڑے شاعر اقبال تھے۔ان کے بعد جوش ہیں۔اقبال کی بدقسمتی یہ رہی کہ وہ ''اردو'' کے شاعر تھے اور دوسری بدقسمتی یہ کہ وہ ایک غلام ملک کے شاعر تھے۔جوش نے تو پھر بھی آزادی دیکھی۔مگر اقبال کے زمانے میں کچھ کہنا اتنا آسان نہ تھا۔اسی حوالے سے میں نے وہ مضمون لکھا ہے اور آزادانہ اپنی رائے دی ہے۔

س۔م: آپ بھی اردو کے افسانہ نگار ہیں۔اور فی زمانہ اردو اسی نسل تک دلچسپی سے پڑھی جاتی رہے گی۔آپ کی خواہش نہیں کہ آپ کے افسانے انگریزی میں ترجمہ کئے جائیں اور آپ چونکہ انگریزی کے صحافی بھی رہے ہیں تو انگریزی میں خود ان کہانیوں کا ترجمہ کریں تو بہتر حق ادا ہوگا یا نہیں؟

ق۔ت: میری سوچ کا انداز مختلف ہے۔میں فرانسیسی جانتا ہوں اور فرانسیسی لکھنے والوں تک میری رسائی ہے۔ہندوستان میں پنجابی میں اچھی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔میں انھیں پڑھ نہیں سکتا لیکن معانی دریافت کر لیتا ہوں۔اور سراہتا بھی ہوں کیونکہ بہرحال اپنی زبان میں پڑھنا اچھا لگتا ہے مگر میں انگریزی میں لکھوں گا تو کون سے سرخاب کے پر لگ جائیں گے؟ ادیب کو خود ترجمہ نہیں کرنا چاہیے۔یہ کام دوسروں کا ہے۔ایک بار دلّی میں دوروسی ادیبوں سے ملنا ہوا جن سے میرے دوست حبیب الرحمٰن نے متعارف کرایا تھا ابھی بات ہو رہی تھی کہ میں اردو میں کہانیاں لکھتا ہوں کہ اتنے میں غلام ربانی تاباں آ گئے۔وہ بڑے ڈیل ڈول کے آدمی تھے۔پیسہ بھی ان کے پاس خوب تھا۔انھوں نے روسی مہمانوں کو متوجہ کر لیا۔مجھے بہتر لگا کہ میں پیچھے ہٹ جاؤں۔کیونکہ مجھے لوگوں کو پیچھے دھکیل کر خود آگے بڑھنے کا ''ہنر'' کبھی نہیں آیا۔دیکھئے ٹیگور کو نوبل پرائز ملا۔حالانکہ آر۔کے نارائن کم درجے کے کہانی کار نہیں تھے۔پھر تھوڑا اور آگے بڑھنے کے لئے خواہ مخواہ کی ترقی پسندی میں ''اسلام دشمنی'' بھی تھوڑی سی دکھانا پڑتی ہے۔ٹیگور کی فنکاری سے انکار نہیں بنگال کا بڑا شاعر اور کہانی نویس تھا۔لیکن نوبل پرائز کے لیے کچھ اور شرائط بھی تھیں۔بات ہو رہی تھی انگریزی میں لکھنے کی میری رائے میں اردو کے ایک ادیب کو اس مقام پر پہنچنا چاہیے کہ وہ اپنی زبان میں لکھی گئی تحریر کو اتنا پُر اثر بنانے کی منزل پہلے سر کرے اور بعد میں دوسری زبانوں تک پہنچے۔محض انگریزی میں ترجمہ کرنے سے تو کام نہیں چل جائے گا۔لوگوں نے مجھے ایسی محفلوں میں بلایا۔میں نے کہا میں انگریزی میں نہیں بولوں گا۔میں اردو کا ادیب ہوں میں انگریزی میں کیوں بولوں مجھے انگریزی نہیں آتی۔تو جناب یہ کہنا کہ ''مجھے انگریزی نہیں آتی''۔یہ بڑے دل گردے کی بات ہے۔کسی کی بھی یہ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی۔لوگ سمجھتے ہیں انگریزی میں بات کریں گے تو بائبل یا حضرت عیسیٰ کے نام تک تو ان کا نام آ ہی جائے گا۔

میں اردو میں سوچتا ہوں اور اردو میں ہی خواب دیکھتا ہوں۔لیکن ہمارے اردو کے مداحین جو زبانی جمع خرچ کے قائل ہیں وہ اس انداز میں نہیں سوچتے۔یہ ہماری ذہنی غلامی ہے جس کا مظاہرہ ہمارے ملک پاکستان میں ہو رہا ہے۔اردو کو تو ہم خود آہستہ آہستہ زیر دے کر مار رہے ہیں۔یاد رکھیئے کہ ایک پودا اپنی زمین میں تو معمولی کھاد پا کر بھی بارآور ہوتا ہے مگر غیر زمین میں نہیں۔ترکی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ان سے اچھے تو عراقی اور شامی ہیں جو اپنی زبان میں لکھ رہے ہیں۔لیکن ہم اردو داں۔۔۔ہم آج وہ کام کر رہے ہیں جس کا تہیہ ڈاکٹر پردیال نے کیا تھا اور کہا تھا۔

''اردو کو وہاں دفن کرو کہ ہزار سال بعد بھی اس کا نشان نہ ملے۔''

قیصر تمکین صاحب سے گفتگو آخری مراحل میں تھی مگر ابھی بات مکمل نہیں ہوئی تھی۔میں جاننا چاہتی تھی کہ ان کے دادا محترم نے بھی کچھ کتابیں لکھی تھیں۔میں نے اسی حوالے سے پوچھا۔

س۔م: آپ اپنے دادا محترم امیر احمد علوی کے بارے میں کچھ بتایئے۔انھوں نے بھی کچھ کتابیں لکھی تھیں۔کیا اب وہ کتابیں دستیاب ہیں؟

ق۔ت: میرے دادا صاحب امیر احمد علوی نے ۱۹۰۵ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی

سے بی۔اے کیا تھا۔ وہ کانپور میں درجہ اول کے مجسٹریٹ تھے اور بحیثیت ڈپٹی کلکٹر مختلف علاقوں میں تعینات ہوئے۔ ۲۱-۱۹۲۲ء میں انھوں نے اپنے ذرائع سے حسرت موہانی کی کچھ بیش قیمت مطبوعات خریدوالیں لیکن کسی نے انگریزوں سے مخبری کردی۔ ان کی ترقی رک گئی اس لئے وہ قبل از وقت ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔

میرے والد صاحب نے بھی ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ سے بی۔اے کیا تھا۔ بی سی ایس کا امتحان بھی دیا مگر آنکھوں کی تکلیف کی وجہ سے کامیاب امیدواروں کی فہرست سے ان کا نام نکال دیا گیا۔

دادا کی کتابوں میں ''یادگارِ انیس''، ''بہادر شاہ ظفر''، ''گوتم بدھ''، ''شایان مالوہ مثنویات''، ''تذکرہ رند دور''، ''داستان زوال'' مرتب کی تھی۔ داستان زوال انھوں نے The myth and hegeneds of Aneient Israeel جو ۲۲۔۲۳ (بائیس۔تیئیس) جلدوں میں ہے اسکے مطالعے کے بعد مرتب کی تھی۔ میرے والد صاحب مشیر احمد علوی نے ''سنہرا حلقہ''، ''مطالعہ حالی'' اور اردو کے ہندو ادیب پر کام کیا تھا۔ بڑے بھائی شبیر احمد علوی کا تحقیقی مقالہ جناب جعفر علی حسرت پر تھا۔ منجھلے بھائی حسین مشیر علوی مرحوم (حال ہی میں ان کا انتقال ہوا ہے) کا مجموعہ کلام ''کوہِ ندا'' تھا۔

نانا مرحوم نورالحسن نیئر دادا کے سگے ماموں تھے۔ انھوں نے ہی دادا کی پرورش کی تھی۔ انھیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اردو کی پہلی لغات ''نور اللغات'' کے نام سے انھوں نے مرتب کی۔ نورالحسن نیئر نانا کے والد جناب محسن کاکوروی کا نام نعت گوئی میں ہندو پاک میں اول نمبر پر آتا ہے۔ ان کے لئے مشہور ہے کہ انھوں نے نعتیہ قصیدہ لکھا جو لامیہ تھا یعنی ''ل'' پر ہر شعر ختم ہو۔ اور رائیہ جو ''ر'' پر ختم ہو۔ سرکارِ دوعالم ﷺ کسی کے خواب میں آئے انھوں نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا تو کاکوروی مرحوم نے بات کرنا چھوڑ دی۔ صرف درود پڑھتے رہتے تھے۔ نیئر صاحب کو علم ہوا تو (وہ ۱۸۴۸ء میں بی اے ایل ایل بی کی تعلیم کلکتہ یونیورسٹی سے حاصل کر چکے تھے) انھوں نے وکالت کا پیشہ چھوڑ دیا کہ وکالت کی آمدنی بہت احتیاط کے باوجود ناجائز کمائی کے زمرے میں آجاتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے سارے دیگر کام چھوڑ کر نعت مرتب کرنا شروع کردی۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے کہ جنھوں نے قدم قدم پر علم کے چراغ روشن کئے۔

قیصر تمکین صاحب نے بتایا کہ دادا اور نانا کی کتب کا ایک ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور اور خدا بخش لائبریری پٹنہ میں شاید موجود ہو۔ گفتگو ختم ہو چکی تھی مگر اس لمحے سے میرے دل میں یہ خواہش شدت اختیار کئے ہوئے ہے کہ کاش یہ کتابیں اور اسی قبیل کی دیگر کتابیں سی ڈی پر محفوظ کرلی جائیں تاکہ ہمارے ادب کا یہ خزانہ ضائع نہ ہوجائے۔ میرا یہ شعر اب میرے لبوں پر ہے۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
کہ جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

مدینے میں جو گزرے تھے وہ لمحے یاد آتے ہیں
مری تنہائی میں اکثر وہی محفل سجاتے ہیں

وُہ جن کے روز و شب گزریں دُرودِ پاک پڑھنے میں
سنا ہے آپؐ ان کو اپنے روضے پر بلاتے ہیں!

نبیؐ کے نام کی مشعل تو منزل پر ہے پہنچاتی
ستارے، چاند اور سورج فقط رستہ بتاتے ہیں

جو اُنؐ کے نام کا وِرد و وظیفہ لب پہ رکھتے ہیں
شبِ تیرہ میں بن کر روشنی وہ جگمگاتے ہیں

سنبھل کر پاؤں رکھنا، تم حرم میں با ادب رہنا
ملائک آسمانوں سے یہاں آتے ہیں، جاتے ہیں!

مجھے توصیفِ پیغمبرؐ کی دی توفیق اللہ نے
مری قسمت پہ لگتا ہے ملائک مسکراتے ہیں

سرِ محشر شفیع المذنبیںؐ تشریف لاتے ہیں
چلو سجاد مرزا ہم بھی قسمت آزماتے ہیں

سجاد مرزا
(گوجرانوالہ)

دشتِ ہجر میں آنے والا

مراق مرزا (ممبئی، بھارت)

دعا سے ہماری زمین کا رشتہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ اس کرۂ ارض پر وارد ہونے والے اوّلین انسان کا۔ ایک معمولی سے جرم کی پاداش پر جنت سے بے دخل کر کے زمیں پر پھینک دیئے گئے آدم نے اپنے گناہ کی معافی کے لئے اس ارضِ حیات پر پہلی بار بارگاہِ معبود میں دعا کے لئے ہاتھ بلند کئے تھے۔ یعنی اس صفحۂ ہستی پر انسانی زندگی کے ساتھ ہی دعا بھی وجود میں آ گئی تھی۔ دراصل اس عالم اسباب میں انسان سے دعا کی وابستگی کے پیچھے ایک گہرا فلسفہ چھپا ہے۔ جیسا کہ رب العالمین نے اپنی آخری مقدس کتاب میں خود ارشاد فرمایا ہے کہ یہ دنیا بنی آدم کے لئے جائے امتحان ہے۔ یعنی انسان بادشاہ ہو یا فقیر اس کے لئے یہ ارضِ فانی آزمائشوں کا مقام ہے اور دعا دنیا کے تمام مذاہب کے مطابق آزمائشوں کے لمحات میں قابل اعتبار سہارا سمجھی جاتی ہے۔ زندگی کے راستے میں انسان نہ جانے کتنی مشکلیں اور مرحلے سے گزرتا ہے اور اسے جب اپنی تکالیف اور مسائل کا حل زمین پر کہیں نظر نہیں آتا تب وہ مجبور ہو کر آسمان کی طرف رخ کرتا ہے۔ یعنی جب زمین کے تمام راستے مسدود نظر آتے ہیں تو انسان دعاؤں کے سہارے اک اندیکھی طاقت پر ہی انحصار کرتا ہے۔

تاریخیں بتاتی ہیں کہ اس زمین پر اوتاروں اور پیغمبروں کو بھی سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہے۔ بھگوان رام کا بن باس، مہابھارت کی لڑائی نیز کرشن اور کنس کی کہانی اسی امتحان کا حصہ ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کا دریائے نیل سے گزرنا، حضرت عیسیٰ کا صلیب پر چڑھنا، حضرت ابراہیم کا راہ خدا میں اپنے بیٹے اسماعیل کو قربان کرنے کا قصد کرنا اور واقعۂ کربلا میں حضرت امام حسین کا اپنے ہمراہ اپنی آل اولاد نیز دوست واحباب کی حق کے راستے میں قربانی پیش کرنا حیات انسانی سے وابستہ آزمائشوں کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ حقیقی معنوں میں زندگی تپتے صحرا کے سفر کی مانند ہے اور دعا اس سفر میں آنے والے ہر نازک موڑ پر انسان کے لیے سائبان کا کام کرتی ہے۔ مذکورہ حوالوں سے یہ بات آئینے کی طرح صاف ہو جاتی ہے کہ دعا، زمین اور انسان، سلسلۂ حیات میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

موضوع گفتگو شعری مجموعہ ''دعا زمین'' ہندوستان کے مشہور و معروف شاعر پروین کمار اشک کا دوسرا قلمی کارنامہ ہے جو زیور طباعت سے آراستہ ہو کر میں منظر عام پر آیا ہے۔ اشک کی پہلی شعری اڑان ''چاندنی کے خطوط'' کی شکل میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب بھی انکی دلکش غزلوں کا مجموعہ ہے جس کی گونج پوری اردو دنیا میں اب بھی سنائی دیتی ہے۔ ''چاندنی کے خطوط'' سے پروین کمار اشک کو آسمان ادب پر ایک مضبوط و مستحکم شناخت پہلے ہی مل چکی ہے۔ ''دعا زمین'' سے انکی شہرت اور سربلندی میں قابل غور اور قابل رشک اضافہ اس لئے ہوتا نظر آتا ہے کہ اس مجموعۂ غزل کی شاعری کے ذریعے پروین کمار شعری افق پر ایک بالکل نئے ''اوتار'' میں ابھر کر ہمارے سامنے آئے ہیں۔ جس طرح مولانا روم، رحیم اور کبیر کا شعری آسمان اوروں سے بالکل مختلف ہے اُسی طرح ''دعا زمین'' کے صفحات پر پروین کمار اشک نے جو شعری کہکشاں آباد کی ہے، وہ انکا اپنا تخلیقی کمال ہے۔ ان کی شعری کاوشوں پر کسی اور کا اثر ذرا بھی نظر نہیں آتا۔ وہ ایک قلندر کی نگاہ سے اپنے گرد و پیش کے سیاسی و سماجی حالات کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دشت ہجر میں آنے والا کوئی نہیں
ہم کو گھر لے جانے والا کوئی نہیں

پھول کو لانے والا باغ میں سَو موسم
پھول میں خوشبو لانے والا کوئی نہیں

آنسو، بادل، دریا، سبھی سیاسی ہیں
جلتا شہر بچانے والا کوئی نہیں

مسجدِ دل میں تنہا بیٹھے روتے ہیں
ہمیں نماز پڑھانے والا کوئی نہیں

چوتھا شعر اگرچہ ڈاکٹر اقبال کے ایک مشہور زمانہ شعر:

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

کی یاد دلاتا ہے تاہم اقبال اور اشک کے شعر کا مرکزی خیال اور پس منظر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ غزل کے ہر شعر میں ایک کہانی پوشیدہ ہوتی ہے اور کہانی میں کردار بھی ہوتے ہیں اور واقعات بھی۔ شعر کا پہلا کردار ایک مفکر ہے جس نے ایک ہی رات مسجد تعمیر کر لینے والے نام نہاد مومنین کو گہرے طنز کا نشانہ بنایا ہے اور یہ کردار خود اقبال ہے۔ شعر کے دوسرے کردار وہ مومنین ہیں جن کا دل ایمان کی روشنی سے خالی ہے لہٰذا وہ مسجد کی تعمیر کے برسوں بعد تک نمازی نہ بن سکے۔ اور مسجد کا تعمیر ہونا ایک واقعہ ہے۔ جبکہ اشک کے شعر کا کردار ایک سچا مومن ہے جو دل کی مسجد میں قید ہے۔ وہ نماز پڑھنا چاہتا ہے مگر اس کے آس پاس کوئی ایسا باایمان شخص موجود نہیں ہے جس کی امامت میں وہ نماز ادا کر سکے۔ یہ تو شعر کا ایک پہلو ہے۔ اس کی اور بھی جہتیں ہیں۔ دراصل یہ Multi-dimensional شعر ہے۔ آج کے سیاسی اور سماجی رہنماؤں پر بھی یہ شعر صادق آتا ہے۔ اس شعر کا پہلا کردار آج کا عام انسان بھی ہو سکتا ہے جو بے بس ہے، مجبور ہے۔ اسے صحیح راستہ دکھانے والا کوئی نہیں۔ اور شاید شعر کا یہی

پہلو پروین کمار اشک کے دل کی بات بھی ہے کہ وہ عوام کے دکھ درد کو اپنی ذات سے وابستہ کر کے دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔

بس ایک زخم ہے جس کا چراغ جلتا ہے
ہمارے شہر میں سورج کہاں نکلتا ہے

یہ کس نے قتل کیا شہر خوش کلام مرا
میں جس سے بات کروں بے زباں نکلتا ہے

خوشی کی شاخ پہ آری چلے تو مت رونا
یہ پیڑ جتنا کٹے اشک اتنا پھلتا ہے

مذکورہ بالا دوسرے نمبر کے شعر میں ''شہر خوش کلام'' ماضی کے خوشگوار حالات کا خوبصورت استعارہ ہے۔ آج وہ حالات نہیں رہے لہٰذا شاعر کو اپنے گردونواح کی دنیا بے زبان سی لگتی ہے۔ بالکل نئے استعارے کی مدد سے پروین کمار اشک نے ایک مخصوص عہد کے قتل ہونے یا کئے جانے کی بات کہی ہے۔ یہاں بھی انکا غم ذاتی نہیں معلوم ہوتا بلکہ یہ غم بھی غمِ دنیا ہی ہے۔ اشک کی شعری پرواز کے کچھ اور رنگ ملاحظہ فرمائیں۔

تو نے میری گاگر ریت سے بھر دی میرا دوش تھا کیا
میں تو پانی میں اُترا تھا دریا تیرے کہنے پر

کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس روئے زمین پر زندگی گزارنے کے لیے قدم قدم پر انسان کو ایک دوسرے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ باہمی تعاون اور اعتبار کے بغیر زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھانا تقریباً ناممکن ہے۔ اگر ہم غور کریں تو شادی سے جڑے دیگر تمام رسوم سے الگ، مرد اور عورت کے درمیان شوہر اور بیوی کا رشتہ Mutual Co-operation اور Mutual-Trust کی بنیاد پر ہی مضبوط و مستحکم بنتا ہے۔ باہمی تعاون اور اعتبار کے ختم ہوتے ہی یہ رشتہ طلاق میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ غرض یہ کہ راہ حیات میں ایک دوسرے پر اعتبار کر کے ہی ہم سفر حیات کو آگے بڑھا سکتے ہیں مگر ہمارے سامنے ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ آج کے دور میں ہم کس پر اعتبار کریں۔ ہر طرف بے اعتباری کا ماحول ہے۔ قدم قدم پر دھوکا۔۔۔ فریب کا سامنا ہے۔ اعتبار کی عمارت منہدم ہو چکی ہے لہٰذا خالی گاگر لئے ہم جس دریا میں اترتے ہیں وہاں سے پانی کے بجائے ریت ہی ملتی ہے۔

یاد ہے؟ ایک کبوتر تیری چھت پر آیا کرتا تھا
کچھ دن پہلے کسی نے گولی مار دی اس کے سینے پر

یہاں مٹتے ہوئے امن واماں کے ماحول پر شاعر نوحہ کناں ہے کہ وہ خود ایک امن پسند انسان ہے اور آج کے پرتشدد حالات میں اسے ہر کبوتر شاید امن کا مسیحا نظر آتا ہے لہٰذا گولی جب کسی کبوتر کے سینے پر لگتی ہے تو وہ اندر سے تڑپ اٹھتا ہے۔ دراصل اس کی نظر میں قتل کبوتر کا نہیں ہوتا بلکہ ہر کبوتر کی موت کے ساتھ ایک گاندھی کی موت ہوتی، امن کے پیغامبر کی موت ہوتی ہے۔

خبر کہاں تھی مری روح ایک مسجد ہے
شبِ وجود میں ماہِ اذان بھی ہوگا

وہ غم کھا کر بھی کیوں روتا نہیں ہے
کسی نے آج تک سوچا نہیں ہے

خدا کے بندو! آؤ مل کے سوچیں
خدا بندوں کو کیوں ملتا نہیں ہے

جس شخص کی روح مسجد یا مندر کے سمان ہو جاتی ہے اس کے اندر اذان یا آرتی کی صدا ہمہ وقت گونجتی رہتی ہے۔ وہ جسمانی طور پر دنیا میں ضرور رہتا ہے مگر روحانی طور پر دنیا سے بہت دور ہو جاتا ہے۔ اشک کے فکر کی اس کیفیت سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ وہ کسی ایسی راہ گزر پر چل پڑے ہیں جو کسی روشنی کی دنیا کی طرف جاتا ہے۔ مذکورہ دوسرے اور تیسرے نمبر کے اشعار پر کچھ روشنی ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ ان اشعار میں پیش کئے گئے خیالات بالکل واضح ہیں۔ ویسے بھی اشک کی شاعری ابہام سے مبرّا ہے۔ انکے کسی بھی شعر کو پڑھ کر اسے سمجھنے کے لیے قاری کو ذہنی ورزش کی ضرورت نہیں پڑتی۔ سلیس الفاظ میں نہایت پر معنی اور فکر انگیز باتیں کہہ دینا انکا خاصا ہے۔

وطن سے دُور اڑتا جا رہا ہے
کوئی روکو پرندہ جا رہا ہے

بھیڑ کو چیرنا ہی پڑتا ہے
بھیڑ میں راستہ نہیں ہوتا

تری بندوق کیا مارے گی مجھ کو
کہیں سے تیغ لا کردار والی

وہ نوجوان پیڑھی میں ترک وطن کے تیزی سے بڑھتے ہوئے رجحان سے مایوس نظر آتے ہیں اور ایک سچے وطن پرست ہونے کی حیثیت سے انکی مایوسی جائز بھی ہے کہ نوجوان طبقہ کسی بھی ملک یا قوم کا مستقبل ہوتا ہے۔ اگر نئی نسل کے سارے باصلاحیت نوجوان دیارِ غیر میں جا کر آباد ہو جائیں گے تو اپنے ملک کی فلاح و بہبود میں کون ہاتھ بٹائے گا۔ بھیڑ کو چیر کر راستہ بنانے کا انکا مشورہ بھی نوجوان پیڑھی کے لئے ہی ہے۔ انسان کی زندگی میں کردار کی اہمیت پر بھی وہ نہایت فلسفیانہ انداز میں روشنی ڈالتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کردار کی تلوار بندوق سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ اشک کے شعری گلستان کے

چندمزید پھول دیکھیں۔

دل کو پھول بنایا کر
پھر درگاہ میں جا یا کر

کھلونے دیکھتا ہے، چیختا ہے
وہ بچپن ہی میں بوڑھا ہو گیا ہے

میں کیسے اشک پھولوں کو مسل دوں
مری نظروں میں ہر خوشبو خدا ہے

دل کو پھول بنانے کی صلاح اس لئے دی گئی ہے کہ عقیدت کا تعلق خلوص نیت سے ہوتا ہے' درگاہ پر چڑھائے جانے والے پھولوں سے نہیں۔ لہٰذا کسی بزرگ کے دربار میں جانے کے لئے پھول سے زیادہ نیت کی پاکیزگی ضروری ہے۔ دوسرے شعر کو ہم سین گپتا کمیٹی کی رپورٹ کی روشنی میں بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ سین گپتا کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان کے 80 کروڑ لوگ صرف بیس روپئے روز پر گزر بسر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے ملک کی آبادکا ایک بڑا حصہ ''Below Poverty Line'' یعنی غریبی کی لکیر سے نیچے کی زندگی گزارتا ہے لہٰذا ایسے طبقے کا بچپن کھلونے کے لئے محض چیخ سکتا ہے' کھلونے حاصل نہیں کرسکتا۔ متذکرہ آخری شعر میں اشک کی Religious Identity سامنے آتی ہے۔ انکی مذہبی شناخت یہ ہے وہ ''سب کا مالک ایک ہے'' کے فلسفے پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ کسی بھی پھول کو مسلنے کے قائل نہیں ہیں کہ انھیں ہر خوشبو میں خدا نظر آتا ہے۔ درحقیقت یہ بہت بڑا شعر ہے جو ان کی Libral as well as secular thinking کو واضح کرتا ہے۔ ایک سچا فنکار مذہب کی فصیلوں میں قید ہو کر کبھی نہیں رہ سکتا۔ شاعر یا ادیب جب مذہب کی دیواروں سے بلند ہو کر حیات اور مقصد حیات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تب ہی وہ بڑا قلمکار بنتا ہے اور عالمگیر مقبولیت حاصل کرتا ہے۔ اشک نے اس شعر میں اپنی بات بالکل واضح انداز میں کہہ دی ہے کہ انکے دل میں دنیا کے تمام مذاہب کے لئے عزت و احترام ہے۔ انھیں گرودواروں کے ارداس، گرجا گھروں کے ماس، مندروں کے گھنٹوں اور مسجدوں کی اذانوں میں ایک ہی روشنی کی آواز سنائی دیتی ہے۔

وہ پیش رو ہے مگر راستہ نہیں دیتا
بزرگ ہو کے بھی دیکھو دعا نہیں دیتا

جو سراپا دعا نہیں ہوتا
ہاں وہ بوڑھا بڑا نہیں ہوتا

کچھ دعا کا خیال رکھا کرو
دل کی مسجد اجال رکھا کرو

تم نے کیوں بارود بچھا دی دھرتی پر
میں تو دعا کا شہر بسانے والا تھا

تمام دھرتی پہ بارود بچھ چکی ہے خدا
''دعا زمیں'' کہیں دے تو گھر بناؤں میں

سمندر کو دکھا کہ آگ اب کیوں
دعا کی بارشوں کو رو رہے ہو

پروین کمار اشک نے لفظ ''دعا'' کو بطور استعارہ بہت سے اشعار میں استعمال کیا ہے اور بے حد خوش اسلوبی سے استعمال کیا ہے۔ اردو ادب کے پیش رووں میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ نئی نسل کو دعائیں دینے اور راستہ دکھانے میں اکثر تنگ دلی سے کام لیتے ہیں۔ پھر بزرگوں پر اشک کا یہ Comment بھی جائز ہے کہ جن بزرگوں کا دل بچوں کو دعا دینے کے قابل نہیں ہے وہ بزرگ بڑے کہلانے کے حقدار نہیں ہیں۔ دل کی مسجد اجالنے کی نصیحت بھی تنگ دل بزرگوں کے لئے ہی ایک آئینہ ہے۔ متذکرہ چوتھے، پانچویں اور چھٹے نمبر کے اشعار مختلف وقتوں میں مختلف تجربات و کیفیات کے زیر اثر کہے گئے ہیں۔ کہیں وہ سمندر کو آگ دکھانے والی اور دھرتی پر بارود بچھانے والی طاقتوں سے سوال کرتے نظر آتے ہیں تو کہیں پوری دھرتی پر پھیلی افراتفری اور دہشت گردانہ ماحول سے دل برداشتہ ہو کر ڈائریکٹ خدا کی طرح رجوع کرتے ہیں اور رب کائنات سے ''دعا زمین'' کی خواہش کرتے ہیں۔

''دعا زمین'' سے اشک کی مراد کوئی ''Utopian World'' نہیں ہے بلکہ انکی آرزو ایک ایسی پُر امن دنیا کی ہے جہاں لوگ محبت اور آپسی بھائی چارگی کے ساتھ چین و سکون سے جی سکیں۔ جہاں نفرت اور عداوت نام کی کوئی چیز نہ ہو۔ میری نگاہ میں اشک کی یہ خواہش یا آرزو قابل احترام ہے کہ ایک شاعر' ادیب یا مفکر اپنے قلم کے ذریعے ہی اپنے اطراف کے ماحول کو بدلنے یا اُس میں کچھ سدھار لانے کی سعی کرتا ہے۔ ''دعا زمین'' کے مطالعے سے جو ایک اہم بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ پروین کمار اشک ایک پوری طرح سچے شاعر ہیں اور انکے اس شعری مجموعے کا تقریباً ہر شعر انکے جذبات و احساسات کی سچائی کا غماز ہے۔ اس شعری مجموعہ کی ہر غزل خود پر گفتگو کروانے کی قوت رکھتی ہے مگر ایک مختصر سے مضمون میں پوری کتاب کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعری کے حوالے سے پروین کمار اشک کی اپنی ایک منفرد آواز ہے جو انہیں ایک الگ شناخت ایک الگ Identity عطا کرتی ہے۔

صفاومروہ کی جستجو

صفوت علی صفوت (منرو۔کنے ٹی کٹ،امریکہ)

ہم اُترنے کو ہیں ارضِ مریخ پر اور اُس پر بسانے کو گھر بار ہیں
پھر خلافت کو صحرا میں پھیلے ہوئے پھر سجودِ ملائک پُر اسرار ہیں

کچھ مجدّد خلاباز ہیں ساتھ میں غیر ذی زرع وادی ہے قدموں تلے
پھر صفا اور مروہ کی ہے جستجو اک نئے ہم پہ کعبے کے آثار ہیں

حاصلِ ثقل اور اُس کے اعشار بھی، ماپتے ہیں کواکب کے اقطار ہم
اور کیا جانے مصحف کے اوراق پر متن کے تجزیے کتنے درکار ہیں

دشتِ کاہل پہ ہیں آج جلوہ نشیں، خلدِ آدم پہ ہم کو پہنچنا ہے کل
اس ولایت کے دیوانِ بہرام پر پیرِ کامل سجانے کو دربار ہیں

چاند ہیں اس کے دو آسماں پر سجے، ایک اُنمیں نکلتا ہے دو بار شب
اک نئے حسن سے یہ چمکدار ہیں اک نئے عشق میں یہ گرفتار ہیں

یوم چوبیس گھنٹوں سے ہے کچھ بڑا، سال اس کا قریباً ہے دو سال کے
خلد لگتا ہے جیسے قریب آ گئی نوجوانی کے پھر یوم و ادوار ہیں

ہم جہاں بھی رہیں، ہے یہ وقتِ دروں، خلد ہو یا کہ مریخ کا دشت ہو
سب ستاروں کی گردش مرے گرد ہے میرے لمحے کے سودے میں قنطار ہیں

سطحِ مریخ پر ہیں کریڑ بہت کیا مناظر شہابانِ ثاقب کے ہیں
یہ نوازش فضا کی لطافت سے ہے ایک سے ایک بڑھ کر یہ دیدار ہیں

فرش کا رنگ لگتا ہے عنّابوی، فرش ہے اپنی دانش میں زبجانوی
وردوریحاں اگرچہ نہیں ہیں یہاں اُن کے رنگوں کے ہر سُو ہی انوار ہیں

یہ غزل میری صفوتؔ نہ سمجھیں گے پر اُن سے کہو کہ مریخ ہے دو قدم
بال و پر میرے جبرئیلؑ کے ہو چلے اور آگے یہاں سے بھی سنسار ہیں

طواف کرتے ستاروں کے درمیاں دیکھوں
عجیب شوقِ زیارت کہ لامکاں دیکھوں

۔ق۔

مجھے پتا کہ شہِ رگ سے بھی قریب ہے تو
نہ جانے وقتِ دعا کیوں میں آسماں دیکھوں

سجا رہا ہے ترنم سے کوئی عرش کو روز
اسی لئے تو مگن رقصِ کارواں دیکھوں

سو لکھ سکا ہوں نہ لکھ پاؤں گا تیری تعریف
نہ جانے کیوں یہ قلم پھر بھی میں رواں دیکھوں

مزار ہے کوئی ٹوٹے ہوئے ستاروں کا
کہ اک سیارہ بھنور وسطِ کہکشاں دیکھوں

ہمارے گرد ہی بارانِ روشنی تو نہیں
اسی میں سِدرۃِ جبرائیل گلستاں دیکھوں

کبھی بھی چین سے بیٹھی نہیں تری مخلوق
نظر سکونِ اقامت میں بھی عیاں دیکھوں

یہ سوچتا ہوں کہ ناقص رہا عبادت میں
نہ سابقون میں ہی خود کو مہرباں دیکھوں

نزولِ خواب تھا صفوتؔ یہ عشقِ وحدت میں
یہ چشم تر ہے جو واپس بدن میں جاں دیکھوں

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

فاری شا (راولپنڈی)

جناب گلزار جاوید، تسلیمات

میں جذبات سے مغلوب ہوں۔ ''چہارسو'' نے مجھے اردو دنیا میں ''چہارسو'' بکھیر دیا ہے ہر طرف میرا چرچا ہے، ضمیر جعفری مرحوم یاد آرہے ہیں۔ ان کی شفقتیں، عنایتیں، میں تو آپ کی محنت اور تحقیق کا اسی دوران معترف ہو رہا تھا۔ جب آپ سوالات بھیج رہے تھے۔ مختلف معلومات کیلئے فون، ای میل کر رہے تھے، آپ اس قرطاس اعزاز کو ہر انداز سے مکمل کرنا چاہتے تھے۔ میں نے تو شعر و نثر میں جو کچھ کیا وہ تو میرے قارئین ہی تجزیہ کر سکتے ہیں کہ کچھ باقی رہنے والا ہے یا نہیں۔ لیکن آپ نے میرے 70 سال کے بکھرے ہوئے ملبے پر ''چہارسو'' کے قرطاس اعزاز کی جو عمارت بلند کی ہے وہ میرے لئے ایسا آئینہ بن گئی ہے کہ میں بار بار اپنا ہی جلوہ دیکھ رہا ہوں گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر محمد علی صدیقی جیسے بلند پایہ نقادوں کی تحریریں یقیناً میرے لئے ایک سرمایہ ہیں۔ دیگر احباب نے بھی میرے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا اس سے مجھے تقویت بھی ملی۔ ندامت بھی ہوئی اور تعجب بھی کہ کیا یہ میرے بارے میں ہی ہے۔ غزلوں کا انتخاب، مختلف کتابوں سے اقتباسات، یہ سب آپ کی محبت اور محنت ہے ورنہ میں کہاں اور یہ مقام کہاں۔ آپ کے سوالات کی تعریف زیادہ سنی ہے، اپنے جوابات کی کم، ٹیلیفون، امریکہ، کینیڈا، دبئی اور بھارت سے بھی آئے یہاں ایک تقریب میں بہت ہی محترم شاعرہ زہرہ نگاہ نے ''چہارسو'' کا حوالہ دیا۔ دلی میں ندا فاضلی سے ملاقات ہوئی۔ پھر انہوں نے ممبئی سے فون کر کے اس اشاعت خاص کو بہت سراہا۔ شہریار صاحب بھی دلی میں ملے۔ وہ ''چہارسو'' پڑھ چکے تھے۔ آپ نے ادب کی نئی پرانی سب نسلوں میں مجھے متعارف کروا دیا ہے میں ممنون ہوں، شکر گزار ہوں، احسان مند ہوں، پھر آپ کی ادب سے یہ لگن کہ پرچے کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ دنیا بھر میں ڈاک کے انتہائی قیمتی ٹکٹ لگا کر ارسال کرتے ہیں۔ کوئی اشتہار نہ سالانہ چندہ، یہ آپ کی ہمت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا کرم۔

محمود شام (کراچی)

حسنِ چہارسو گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چہارسو کی تازگی سے عالمِ گرویدگی میں ہوں۔ ضمن و مضمون کی نیرنگیاں دیکھتا ہوں اور دیکھتا ہی رہ جاتا ہوں۔ آپ نے محمود شام کو بقدرِ ذوق و شوق قرطاسِ اعزاز کیا ہے۔ میں ان سے کبھی ملا نہیں مگر ان کی محبتوں سے خوب واقف ہوں۔ میں گورنمنٹ ڈگری کالج (اب پوسٹ گریجویٹ) ایبٹ آباد میں بائنی پریکٹیکل کا استاد رہا ہوں۔ پرانی بات ہے کہ وہاں ہر سال انعامی مقابلے کے طرحی اور موضوعی مشاعرے ہوتے تھے۔ ایک مشاعرے میں محمود شام بھی آئے تھے اور انہیں انعام بھی ملا تھا۔ ان دنوں مشاعروں میں ایسے شاعر بھی آتے تھے جو اب مشاہیر میں اسم رکھتے ہیں۔ ان سب کا کلام ایبٹ آباد کالج کے ریکارڈ میں موجود ہے۔ محمود شام نے ایک بار میری غزل ٹائٹل کے اندر والے صفحے میں شائع کی تھی اور تصویری خاکہ بھی لگایا تھا۔ اخبار جنگ سے میرا پرانا تعلق ہے۔ شوکت تھانوی کی ادارت کے زمانے میں جنگ کے لیے میں نے مضامین لکھے تھے۔ مظہر الاسلام (انچارج ادبی صفحہ) میرا کلام ادبی صفحے میں چھاپتے رہے ہیں۔ چہارسو کے اس شمارے میں محمود شام کی جس قدر خوبیاں اجاگر ہوئیں ہیں اُس سے اُن کی شعری اور نثری استعداد کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ جمنا داس اختر سے متعلق مضمون خاصا پُر اثر ہے۔ میں جمنا داس اختر کا پرانا قاری ہوں۔ ان کا شمار مشاہیرِ ادب میں ہوتا ہے۔ ان کے خصوص میں مضمون کے اندر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سراسر محبت اور ایک بڑے اہلِ قلم کے مرتبے کے عین مطابق ہے۔ چہارسو میں چھپنے والے ہندو اہلِ قلم پاکستان سے دلی نسبت رکھتے ہیں۔ یہ ہمارے اور اپنے کلچر سے بخوبی آگاہ ہیں۔ برصغیر کے اکثر ٹی وی چینلز جب ان کلچرز کا حلیہ بگاڑتے ہیں تو بہت افسوس ہوتا ہے۔ میری پوتی خدیجہ ایک دن حسرت سے پوچھنے لگی کیا ہندو عورتیں ایسی بے باک ہوتی ہیں جیسی ڈراموں میں نظر آتی ہیں۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ ہندو عورتیں شرم و حیا والی ہیں۔ وہ تو رام چندر جی کی داسیاں اور کشن کنہیا کی گوپیاں ہیں۔ مسلمان عورتوں کی طرح جسم اور چہرہ چھپا کر رکھنے والی۔ بھارت کے شاعر اور ادیب نہ ہم سے منہ موڑتے ہیں نہ ہم اُن سے۔ کشمیر کا مسئلہ درمیان میں دیوار بن کر کھڑا ہے اگر دونوں طرف کی قیادت اس سلسلے میں دلچسپی لیں تو کچھ بات بنے۔ مذہبی تفریق، تفاوت ایک حقیقت ہے۔ یہی حقیقت برصغیر کی تقسیم کا باعث بنی۔ میرے خیال میں ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے۔

آصف ثاقب (ایبٹ آباد)

محترم گلزار جاوید صاحب، آداب

محمود شام صاحب کا گوشہ دلچسپ ہے۔ پہلی جیل یاترا والا واقعہ انھوں نے بڑے مزیدار انداز میں بیان کیا ہے۔ انگریزی میں کہا جاتا ہے ''آج کا سانحہ کل کا مذاق ہو جاتا ہے'' جبھی اتنے سنجیدہ واقعے کے کئی پہلوؤں کو شام صاحب اتنے ہلکے پھلکے انداز میں بیان کر گئے۔ ان کی لفظیات کے بارے میں نارنگ صاحب نے خوب لکھا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ''غریب الفاظ'' یا ''غیر شاعرانہ'' سمجھے جانے والے الفاظ کا استعمال شجرِ ممنوعہ نہیں ہونا چاہئے۔ یہ دریا بہتا رہنا چاہئے اور کسی بھی لفظ کا مناسب استعمال اس کے قبول و رد کی کسوٹی ہونی چاہئے کیونکہ روایتی لفظیات کا نامناسب استعمال بھی خاصی معمول کی بات ہے۔ جھنگ سے شام صاحب کی محبت دراصل ان کی حبّ الوطنی کی گہرائی کا پتہ دیتی ہے مگر اس میں بیچارے راجپورہ کا کیا قصور، یہ

توجہ طلب ہے۔انسان کسی بھی زمین کو کبھی جنت تو کبھی دوزخ بنانے کا پورا اہل ہے۔ پاکستان کے ساتھ ہم نے کیا نہیں کیا اور پاکستان میں بہتوں کے ساتھ کیا نہیں ہوا مگر پاکستان پھر بھی ہمارے دل میں بستا ہے کہ اس بیچارے کا کیا قصور۔ یہاں تاریخ کے کسی سانحے کی وجہ سے کوئی اس سے اپنا رشتہ کیوں توڑے۔

فیصل عظیم (کینیڈا)

برادرِ عزیز گلزار جاوید صاحب' السلام علیکم۔

''چہارسو' جنوری فروری ۲۰۱۰ء کے ساتھ چند روز بہت خوب گزرے ہیں۔محمود شام جب جھنگ گورنمنٹ کالج میں پڑھتے تھے میں بھی سال ڈیڑھ سال کے لئے بطور لائبریرین وہاں پر رہا تھا۔ ان کے بڑے بھائی خالد مسعود تو اکثر میرے پاس بیٹھے رہتے تھے۔ادب سے انہیں بھی شام جی کی طرح بڑا لگاؤ تھا۔ مرحوم غلام الثقلین نقوی کے افسانے خالد صاحب کو بہت پسند تھے۔ان کا ایک غیر مطبوعہ ناول ''بکھری راہیں'' بھی خالد صاحب نے پڑھ کر رائے دی کہ ناول کا ہر باب بذاتِ خود ایک مختصر افسانہ ہے۔میں نے خالد مسعود اور محمود شام دونوں بھائیوں کا اپنی آپ بیتی میں بڑی محبت سے ذکر کیا ہے۔ چہارسو کے صفحات میں آپ نے محمود شام سے میری بھرپور تجدیدِ ملاقات کی صورت پیدا کر دی ہے۔ براہِ راست میں آپ کے بے تکلف سوالات سے محمود شام کی شخصی' صحافتی اور ادبی زندگی کا کوئی پہلو بھی آپ نے تشنہ نہیں رہنے دیا۔مضامین کے بیچ ہوئے صفحات میں آپ نے شام کی تصانیف کے اقتباس درج کر کے قاری کو اُن کی ہمہ جہت ادبی شخصیت سے بھرپور تعارف کا موقع بھی عطا کیا ہے۔قرطاسِ اعزاز کے سب مضامین بڑی محبت سے لکھے گئے ہیں اور دلچسپ بات یہ کہ اِن میں ''شب سیاہ گزار دے'' کے سوا محمود شام کی شاعری ہی کے بارے میں تحریر کیے گئے ہیں۔ یہ مضمون ڈاکٹر انور سدید نے محمود شام کی کتاب ''شب بخیر'' کے بارے میں لکھا ہے۔اس مضمون کے دو جملوں میں بہت کچھ موجود ہے۔اس کتاب کا نام ''شب بخیر'' ہے۔قرۃ العین حیدر کے ناول ''آخرِ شب کے مسافر'' میں ایک بہت بڑا المیہ ابھارا گیا ہے جو پاکستان کی تقسیم اور بنگلہ دیش کی تخلیق پر منتج ہوا تھا۔وہی المیہ اس کتاب میں پھر عمل پذیر نظر آتا ہے۔ اس اشاعت کے پانچ افسانوں میں چار تو دساور کے اور ایک اپنی دھرتی کا ہے۔ گلزار جاوید نے ''His Master's Voice'' کے عنوان سے ایک ماڈرن گھر کی کہانی چار خطوط کی مدد سے تخلیق کی ہے جو ایک بیٹا' ماں باپ اور بہن کو مخاطب کیا گیا ہے۔گلزار جاوید نے ان چاروں کردار کا خطوط کے ذریعے طنز ملیح سے نہایت فنکارانہ تجربہ پیش کیا ہے۔افسانے کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔نظم و نثر بھی خوب ہیں اور خطوط بھی دلچسپ ہیں۔'' کچھ دیر نیند سے پہلے'' کی بابت محترمہ شکیلہ رفیق کو یونہی شبہ ہوا ہے۔ میں نے ان کے افسانوں کی کتاب '' کچھ دیر نیند سے پہلے'' دیکھی تک نہیں۔ میں نے تو مرحوم نادر کاکوری کی نظم کے پہلے مصرعے سے کتاب کا عنوان لیا ہے ''اکثر شبِ تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے'' امید ہے اس مختصر وضاحت سے محترمہ شکیلہ رفیق کی غلط فہمی دور ہو جائے گی۔

سجاد نقوی (لاہور)

بھائی گلزار جاوید' السلام علیکم۔

چند روز قبل ''چہارسو'' کا تازہ شمارا موصول ہوا تھا جس کے مطالعے کا تاثر اب تک ذہن میں لئے آپ سے مخاطب ہوں۔آپ کی فطرت میں سمایا ہوا۔ ''نرم دم گفتگو گرم دم جستجو'' اس مرتبہ محمود شام جیسے نابغہ روزگار کو ''چہارسو'' کا قرطاسِ اعزاز عطا کیا گیا یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔مبارک ہو۔ادب کی نامی گرامی ہستیوں نے اُن کو جن کلمات اعزاز سے نوازا اور جس خوبی سے نوازا یقیناً شام جی بجا طور پر اُس کے مستحق ہیں۔اُن کی پہلی صاحبزادی کی شادی میں انہوں نے مجھ فقیر کو بھی دعوت دینے کا کرم کیا تھا جس میں شرکت میرے لیے ایک اعزاز سے کم نہ تھا۔ اُس معطّر' متوّر اور تاریخی محفل میں شہر کے ہر طبقۂ فکر کی نمائندگی نے مجھے جو حیرت اور مسرت کا لطف عطا کیا تھا آج بھی اس کا تاثر شعور میں موجود ہے۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انہیں اُنکی اولاد کی سچی خوشیوں کے ساتھ ساتھ ایک صحت مند طویل زندگی عطا کرے، آمین! اُن کی شخصیت کی ہر جہت کو وا کرتے ہوئے یوں تو ایک سے ایک مضامین اس شمارے میں موجود ہیں مگر مجھے شمشاد احمد کی تحریر ''بند گنبد میں آزادیٔ افعال'' پڑھ کر ایک نئے ذائقے کا احساس ہوا پھر خود اُنکی اپنی تحریر ''پہلی جیل یاترا'' صرف ڈھائی صفحات میں انکے اسلوب نے جو مزہ دیا اُس نے مطالعے کی تشنگی اور بھڑکا دی۔کیا انہوں نے اپنی جیل یاترا پر کوئی کتاب بھی لکھی ہے؟ اگر ایسا ہے تو براہِ کرم اُس کا کچھ اتا پتا بتایئے گا۔گلزار جاوید کا افسانہ '' His Master's Voice'' یقیناً اس شمارے کا بہترین افسانہ ٹھہرتا ہے۔ یہ صرف چار خطوط پر مشتمل مختصر افسانہ ہی نہیں تھا بلکہ اپنے اندر مغربی معاشرے کی ایسی تصویر اجاگر کر رہا تھا جس کا انجام صدیوں قبل لوطؑ کی قوم سے کچھ مختلف نہ ہوگا۔خطوں پر مشتمل اس افسانے کو پڑھنے کے بعد مجھے مرحوم ذکی انور بہت یاد آئے جنہوں نے گذشتہ صدی کی چھٹی دہائی میں اس ہیئت کے کئی یادگار افسانے لکھے تھے۔اس بار افسانوں کی دوسری خوبی یہ بھی تھی کہ آپ نے چار مختلف خواتین افسانہ نگاروں کو چار مختلف ملکوں کی نمائندگی کا اعزاز بھی دیا اس طرح کینیڈا' برطانیہ' امریکہ اور بھارت کے پس منظر میں وہاں کے معاشرے کی عکاس کہانیاں بھی چہار سو کے خوش نصیب قاری کے حصے میں آئیں۔ظاہر ہے ان کہانیوں کی ترتیب جو یقیناً آپ نے ہی دی ہوں گی' بھی اُن کے معیار کے مطابق رہیں۔''عقبی آئینہ'' میں شہناز خانم عابدی نے نہ صرف تسلسل اور روانی کا حسن قائم رکھا ہے بلکہ افسانہ اپنی معنوی تفہیم میں بھی اسم با مسمیٰ لگا۔

خط ختم کرنے سے پہلے ایک الم انگیز خبر بھی آپ کو سناتا چلوں کہ گذشتہ ۲۱ جنوری ۲۰۱۰ء کے صبح ساڑھے نو بجے ہمارے دوست حصیر نوری دماغ کی

رگ پھٹ جانے سبب اللہ کو پیارے ہوگئے۔ تازہ شمارے میں صفحہ ۹۱ پر چھپی دوسری غزل میں مطلع سے مقطع تک موت کے سائے لہرا رہے ہیں۔ کیا واقعی اُن کو معلوم ہوگیا تھا کہ اُن کی زندگی کی شام آ چلی ہے۔ انّا للہ وانا الیہ راجعون.

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

غالب عرفان (کراچی)

مکرمی گلزار جاوید صاحب۔

تسلیم و آداب۔ ماہنامہ چہارسو ملا اور محمود شام کے بارے میں بہت سی تفصیلات سامنے آ گئیں۔ خصوصاً براہ راست میں اُٹھائے ہوئے سوالات اور ان کے جوابات دلچسپی سے خالی نہیں' محمود شام کی زندگی کے لیل و نہار مسلسل محنت سے نکھرتے چلے گئے اور وہ اپنی ذہانت اور قلمی دیانت کی بدولت شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگے۔ محمود شام جن دنوں گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے میں ایم اے کے سال اول میں تھے میں ان دنوں گورنمنٹ کالج جہلم میں شعبہ اُردو کا صدر اور مجلس اردو کا نگران اعلیٰ تھا۔ 1962ء میں ہفتۂ تقریبات کا اہتمام تھا، بین الکلیاتی مشاعرے میں ناصر کاظمی کا طرح مصرعہ اور ان کی صدارت میں یہ مشاعرہ منعقد ہوا، محمود شام لاہور سے فیصل آباد سے ریاض مجید نے بحیثیت طالب علم شرکت کی۔ ناصر کاظمی کی غزل کا شعر بہت پیارا تھا، میں نے وہ شعر پڑھا کہ

بپاسِ صحبت دیرینہ کوئی بات تو کر
نظر ملا تو سہی میں تجھے دعا دوں گا

بہت سے طلباء نے گرہیں لگائیں۔ محمود شام نے مطلع پڑھا اور اس کے بعد گرہ لگائی جو اس طرح تھی کہ

بڑا اثر ہے دعاؤں میں ہم فقیروں کی
نظر ملا تو سہی میں تجھے دعا دوں گا

ناصر کاظمی کرسیٔ صدارت سے اُٹھے، محمود شام کو گلے لگایا اور شاباش دی۔ کہنے لگے برخوردار جیتے رہو تمہارا مستقبل روشن ہے، ایک سید زادے کی دعا قبول ہوئی اور آج محمود شام اس مقام پر ہیں کہ ان کے بقول

آنکھ رکھتا تھا کھلی اور طبیعت موزوں
تجربے دوسرے کرتے تھے سنورتا میں تھا

حسن عسکری کاظمی (لاہور)

محترم گلزار جاوید صاحب' آداب وتسلیمات۔

''چہارسو'' دیکھ کر جی خوش ہوا۔ پرچہ سو فی صد قابلِ مطالعہ ہے۔ ایک معیاری ادبی پرچے کی طرح۔

افسانۂ حیات کا عنواں ''چہارسو''
دیوی ہے شاعری کی غزل خواں ''چہارسو''
نکہت جمالِ یار کی رقصاں ''چہارسو''
شعر وادب کا لطفِ فراواں ''چہارسو''

آدھے سے زائد صفحات شام جی کے لئے وقف ہیں۔ شام صاحب ایک قابلِ قدر شخصیت ہیں اور قابلِ تعریف بھی۔ جو شخص پچیس سال میر خلیل الرحمٰن کے ساتھ گذارے اور آگے ہی بڑھتا جائے وہ یقیناً قابلِ تعریف ہے۔ صرف ایک بار ایسا ہوا تھا کہ میر صاحب (جو اپنے ماتحتوں پر گالیوں کے ساتھ برستے تھے) شام جی کے پیچھے پڑ گئے۔ مگر اس امتحان میں وہ فرید احمد مرحوم کے تعاون سے کامیاب رہے۔ بیچارہ فرید میر صاحب کے عتاب کا شکار ہوا۔ میں خود بھی ادارۂ ''جنگ'' کراچی (اور نوائے وقت ''لاہور و ڈان'' کراچی سے بھی) وابستہ رہ چکا ہوں مگر بہت پہلے۔ شام جی کی نذر:

مدیرانہ دھج سے وہ ہیں تیغ برہم — لرزتے ہیں ان سے سیاست کے رُستم
جناب اور مہربان دونوں ہی نازاں — کہ ہیں وہ ادب اور صحافت کا سنگم
فنا عشق میں شام جی مثلِ گردھر — تغزل میں بھی وہ کسی سے نہیں کم

(شام و گردھر: کرشن مہاراج)

تشنہ بریلوی (کراچی)

مدیر محترم' سلام ورحمت۔

اس مرتبہ سجنے والی ''بزم شام'' نے چہارسو کچھ ایسی جگمگ کی کہ لگتا ہے جیسے ''ستاروں نے دیکھی ہیں جھک جھک کے راہیں۔۔۔۔'' موجودہ قرطاسِ اعزاز خوبصورت تحریروں کا ایسا آئینہ خانہ ہے کہ جس طرف آنکھ اٹھائیں پذیرائی کی تصویریں سجی ہیں اور ہر ہر مصور تحریر اپنی جانب ملتفت کرتی محسوس ہوتی اور سمجھنے میں معاونت کرتی ہے۔ جملہ معزز مضامین نگاروں نے جس جس پیرائے میں محبتوں وعقیدتوں کا اظہار اور اُن کی متنوع جہات کی کامیابی کا اعتراف کیا ہے محترم شام صاحب اُس کا بے حد استحقاق و اعزاز رکھتے ہیں۔۔۔۔! گذشتہ سال وصی شاہ کے پروگرام ''رات گئے'' میں محمود شام صاحب کی گفتگو وکلام سے مستفید ہونے کا موقعہ ملا تھا نیز انہوں نے سیاسی تناظر میں ''پاکستان پر قربان'' کا تذکرہ بھی کیا تھا۔ لوگوں کے یہاں جو اوصاف الگ الگ پائے جاتے ہیں ''براہِ راست'' میں وہ سب بعنوان۔ تخلیق وتحقیق۔ تنقید وتنقیص۔ تجسس وتدوین۔ تحسین وتحریم۔ مجتمع ہوکے۔ آل اِن ون بن جاتے ہیں۔۔۔۔ ''ہز ماسٹرز وائس'' میں پرینٹس چلڈرن ریلیشن شپ کا اختصار کے ساتھ احاطہ کیا گیا ہے۔ بیرون ملک سیٹل ہونے والی یوتھ سرعت سے بدیسی تہذیب ومعاشرے کے منفی نقوش کی اسیر ومغلوب ہوکر رہ جاتی ہے۔ یوں اس کہانی کی ہر میل گلوبل معاشروں کی توڑ پھوڑ کے تخریبی رجحانات وبدلتے تیوروں کی کامیاب نقاب کشائی ہے۔

شگفتہ نازلی (لاہور)